ہر گھر کی زینت

ماہنامہ کراچی

دوشیزہ

November

2014

ناولٹ نمبر

باتیں ملاقاتیں

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ)......720 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

دوشیزہ میگزین

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی 7-OB تالپور روڈ۔ کراچی
Phone : 021-34939823-34930470
Email : pearlpublications@hotmail.com

لاج...

ہمارا، تمہارا خدا بادشاہ!

ساتھیو! کیا یہ سچ ہے کہ بادشاہ ایک ہے؟
مگر کہنے، سننے سے نا ہم سچے، پکے مسلمان، نہ انسان۔
آج اِس دھرتی پہ، ہماری پاک دھرتی پہ، ہر طرف اقتدار کی کشمکش اور فتح کی جنگ میں ہر ''بڑا'' سب جائز ہے کا نعرہ بلند کر کے 'سب لُوٹ لو' پر عمل پیرا ہے۔
کب تک اور کتنا لوٹا جا سکتا ہے۔
بھرے بھرے خزانے بھی ایک دن خالی ہو جاتے ہیں اور ہمارے ہاں تو خزانہ بھی ہمارا اور آپ ہی کا قطرہ قطرہ چُوس چُوس کر جمع کیا گیا، خون پسینہ ہے.....اور خزانے کا دان دیتی گروی رکھی نسلیں! خدا سے صرف اِک یہی دعا ہے کہ مالک لاج رکھنا! کہ تُو ہی ہے جو لاج رکھتا ہے۔ اُن سب بادشاہوں کی! جو خود کو تجھ سے بھی بڑے بادشاہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ بھول کر کہ اختیار صرف 'اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ غور کیجیے گا کیونکہ یہ صفت صرف 'انسانوں' کو عطا کی گئی ہے۔

کاشی چوہان

زادِ راہ

آج ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں، وہاں ہر قسم کی آزادی خود مختاری اور تعیشات کے تمام سامان موجود و میسر ہیں۔ اس کے باوجود ایک مسلسل محرومی اور ناکامی کا احساس انسان کو مضطرب رکھے ہوئے ہے۔ آزادی میسر ہے، لیکن آزادی سے سانس لینے کے باوجود......

زندگی کو آسان، باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

ایک تصوراتی زندگی اور انسان کی فطری طلب اور ازلی خواہش کیا ہے؟ غور کیا جائے تو آزادی اور خود مختاری، نعمت اور تعیشات، بے فکری اور سکون کا ماحول جس میں کسی غم اور دشمنی کا کھٹکا نہ ہو۔ یہی ایک تصوراتی زندگی ہوتی ہے جس کے لیے انسان شعور آنے سے لے کر موت تک تگ و دو کرتا ہے اور حسرتیں دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور گلہ کرتا ہے کہ اسے یہ سب کچھ نصیب نہیں ہوا۔ پتا نہیں، ہماری ناکامیوں میں زمانے کی خطا ہے یا ہمارا اپنا قصور؟ ہم یہ بھی نہیں جان پاتے کہ ہماری طلب خواہشات غلط ہیں یا انہیں حاصل کرنے کے ذرائع غلط ہیں؟ اشرف المخلوقات ہونے اور افضل ترین مخلوق ہونے کی صورت میں تو ایسی زندگی کی آرزو کرنا غلط نہیں ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تمام نعمتیں انسان کے لیے ہی تخلیق فرمائی ہیں تو ان پر تعیشات پر انسان کا حق بنتا ہے۔ وہ انہیں حاصل کرنے کی خواہش بھی کر سکتا ہے اور حاصل بھی کر سکتا ہے۔ لیکن بات صرف انفرادی اور اجتماعی سوچ کے فرق یا کاوشوں کے غلط انداز کی ہے ہم خواہشات کرتے ہوئے صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں جب کہ ایک ہستی پر ایمان لانے، اس کی تخلیق کا ایک اور حصہ ہونے کی صورت میں ان تمام تعیشات اور خوشیوں پر ہمارا حق ہے اور دوسروں کا بھی۔ اس کائنات میں بھی جس قدر بھی نعمتیں ہیں، ان پر اس کی تمام مخلوقات کا حق ہے لیکن ہم ان پر خود قبضہ کر لینا چاہتے ہیں اور اپنی ذات کے سوا کسی کا حق تسلیم نہیں کرتے۔ فرمان الٰہی ہے کہ اس کائنات کی ہر شئے پر کسب حلال اور محنت کے ذریعے انسان کا حق ہے، لیکن دوسروں کو محروم کر کے نہیں، کسی کا حق پامال کر کے نہیں۔ یہ ازل سے ابد تک ایک ایسا قانون ہے جسے توڑنے کے بعد ہم نہ صرف دوسرے کو محروم کرتے ہیں بلکہ خود بھی محروم رہ جاتے ہیں بلکہ باری تعالیٰ کے حضور حاضری کے دن اسی قانون کی خلاف ورزی حساب کتاب میں سختی کا باعث بن جائے گی۔ اس سے اندازہ کر لینا چاہیے کہ سب خواہشات غلط نہیں ہیں بلکہ ان کے حاصل کرنے کا طریقہ غلط ہے۔ دوسروں کے حقوق اور خواہشات کو پامال کر کے اپنی آرزوئیں پوری کر لینا سب سے بڑا گناہ ہے۔ بالفاظ دیگر یہ حقوق العباد کی پامالی کہی جاتی ہیں۔ آج ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں، وہاں ہر قسم کی آزادی خود مختاری اور تعیشات کے تمام سامان موجود و میسر ہیں۔ اس کے باوجود ایک مسلسل محرومی اور ناکامی کا احساس انسان کو مضطرب رکھے ہوئے ہے۔ آزادی میسر ہے، لیکن آزادی سے سانس لینے کے باوجود دم گھٹتا ہے ایسا کیوں ہے؟ انسان

اسے محسوس نہیں کرسکتا تو اپنی ناکامی کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتا ہے، الزام دیتا ہے، مرد زمانے کو الزام دیتا ہے اور عورت، مرد کو الزام دیتی ہے کہ اس کی صلاحیتوں کو دباتا ہے، اس کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ خیر، یہ ایک بہت طویل بحث ہے، یہاں بات صرف انسان کی ہے۔ انسان جو سب کچھ پاکر بھی خود کو تہی داماں اور مضطرب سمجھتا ہے اور یہ جاننے کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ان تمام خواہشات کی تکمیل کی ضمانت حقوق کی ادائیگی میں دی ہے۔ اپنی عزت و آبرو کے ساتھ دوسروں کی عزت اور آبرو کا خیال رکھنا، اپنی خواہشات کا احترام کرنا اور اپنے مفاد کے ساتھ دوسروں کے مفاد کو بھی محفوظ رکھنا۔ حدیث ہے۔ ''جو اپنے لیے پسند کرو، وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرو،

(صحیح بخاری و مسلم)

لیکن اس تعلیم سے ہٹ کر ہم کچھ بھی حاصل کر لیں، ہم بے سکونی اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں پاسکیں گے جس کا نتیجہ ایک مسلسل ناکامی اور بے قراری ہے۔ کبھی کسی شے کے حصول کی تگ و دو اور کبھی اس شے کے عدم حصول کا غم۔ نہ خوشی میں اعتدال ناکامی میں برداشت اور تحمل۔ ارشاد ربانی ہے۔

''اس شے کے لیے غم نہ کرو جو تم سے جاتی رہے، نہ اس شے پر فخر کرو جو تمہیں عطا کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

(سورت الحدید۔ آیت ۲۳)

یہ حکم خوشی اور غمی کے وقت انسان کے برتاؤ و اعمال میں اعتدال قائم رکھنے کے لیے دیا گیا ہے تاکہ عطیہ اور عدم عطیہ دونوں صورتوں میں مطمئن رہ سکے اور یہی اطمنان مومن کی شان قرار دی گئی ہے جس کے ذریعے ہر حال میں انسان کو قلب مطمئنہ حاصل ہوتا ہے جب کہ ان دنوں یہ قلب مطمئنہ مفقود ہو چکا ہے۔ جدھر دیکھو، بے اطمنانی کی کیفیت طاری ہے جبکہ بظاہر محرومی کا کوئی سبب نہیں بلکہ عجیب بات ہے کہ جتنی سہولتیں بڑھتی جاتی ہیں زندگی اتنی ہی دشوار بن رہی ہے۔ ایک گھر میں دو میاں بیوی سے لے کر دو قوموں تک مسلسل ایک مقابلے کی کیفیت جاری ہے۔ دولت کی ریل پیل، نام و نمود شان و شوکت ہر شے نصیب ہے لیکن ان نعمتوں کے باوجود مسلسل ایک اضطراب و نا معلوم سی بے چینی مسلط ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جس میں مریض سود و زیاں کے حساب میں کبھی خود پر رحم کھاتا ہے کبھی زمانے کا گلہ کرتا ہے اور ان کا شکار ان دنوں ہر انسان نظر آتا ہے اور جب ڈاکٹر حضرات کسی مرض کو پہچان نہیں پاتے تو اسے الرجی یا ڈپریشن کا نام دے دیتے ہیں اس طرح خود رحمی اعصابی تناؤ بے چینی اور اضطراب کی یہ کیفیت ڈپریشن کہلائی اور یہ مرض ڈپریشن دنیا بھر کا مسئلہ بن گیا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انسان جوں جوں ترقی کرتا جا رہا ہے، یہ مسئلہ سنگین سے سنگین تر ہوتا جا رہا ہے نفسیات کو مدنظر رکھا جائے اس کے لاتعداد اسباب ہیں کہیں کاروبار میں ناکامی نقصان، کہیں ناچاقی و انفاقی، محبت میں ناکامی، بے روزگاری، مفلسی، کہیں مال کا حصول، کہیں مال کی حفاظت اور کہیں موروثی امراض یا جسمانی عوارض۔ وجوہات بھی مختلف۔ عورت، مرد کی ڈپریشن کے اسباب بھی جدا جدا مگر ان کے حالات میں قصور کسی ایک آدمی کا نہیں بلکہ اس کی منفی سوچ کا ہے جسے وہ خود سمجھ نہیں پاتا تو مرض قرار دے دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مرض کا سبب صرف دنیا کے لیے دنیا کمانا ہے اب غور طلب بات ہے کہ یہ انسان اشرف المخلوقات، خلیفۃ اللہ جس کے لیے دنیا بنائی گئی، اگر دنیا ہی کو مقصد حیات بنالے، ٹارگٹ بھی دنیا، کوشش بھی دنیا اور نتیجہ بھی دنیا، تو انجام لازمی صفر ہوگا جس کے بعد بھوک پیاس اور نیند اڑ گئی زندگی سے ہر امنگ مٹ گئی احساس محرومی نے غلبہ پایا اور یہ وجہ کائنات انسان، بے عمل اور ناکام سی چیز بن کر رہ گیا بس یہی ڈپریشن کی کیفیت ہے جس سے بھی نہ بھی ہر انسان گزرتا ہے، خاص طور پر وہ لوگ جو سہولیت اور آسانیوں میں زندگی کا سکون اور آسائش و نمائش میں عزت و ناموری محسوس کرتے ہیں اور مزید سے مزید کے حصول کے لیے ہی ہر کوشش کرتے ہیں یہ غلط انداز فکر کی بات ہے یا پھر اس کا سبب لاعلمی ہے اس دور میں

انسان نے اقتدار کرمنا ہی آدم کے امامان کو فراموش کر کے فانی چیزوں میں تکریم ڈھونڈ لی ہے۔ دولت، منصب اور شہرت مقصد حیات بن کر رہ گئے ہیں مگر وہ غور نہیں کرتا کہ جنہیں یہ سب حاصل تھا، کیا انہوں نے مطمئن زندگیاں گزاریں؟

درحقیقت مضطرب و بے چین انسان تھے چنگیز خان، ہلاکو خان، ہٹلر، مسولینی، نپولین، سرونسٹن چرچل، ابراہام لنکن یا شب و روز محفلیں سجانے والے اور لاتعداد حکمران، یہ سب اضطراب کا شکار تھے اور آج بھی موجودہ دور میں متعدد صاحب اقتدار لوگ اسی مرض کا شکار ہیں۔ (لیکن برخلاف ان کے اگر بامقصد زندگی گزارنے والے فرماں بردار انسانوں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو بڑا نمایاں فرق نظر آتا ہے ان میں خاص و عام سب ہی لوگ نظر آتے ہیں حضرت نوح علیہ السلام کشتی بنا کر اپنے علاقے والوں کو طوفان سے بچا کر لیے جا رہے ہیں اور ان کا اپنا بیٹا اسی طوفان کی نذر ہو جاتا ہے کیا یہ مایوسی کا مقام نہیں تھا؟ مدتوں دعاؤں سے مانگے ہوئے کمسن بچے اور بیوی کو ویرانے میں چھوڑ کر نامعلوم وقت کے لیے رخصت ہو جانا کیا کم حوصلہ پامال کرنے والے حالات تھے؟

اب اگر یہ کہا جائے کہ اللہ کے خاص بندے تھے جن پر وحی نازل ہوتی تھی، انہیں، ہر لمحہ اللہ کی مدد کا یقین تھا تو غیر نبی ہستیوں کی مثالوں سے بھی تاریخ بھری پڑی ہے حضرت علی کا زمانہ ہے۔ دشمن اور دوست کی پہچان مٹ گئی ہے ہر طرف خانہ جنگی کا عالم ہے ایسے میں کوئی اپنی بے چینی و مایوسی کا ذکر کرتا ہے تو آپ نصیحت کرتے ہیں کہ ”غم کا علاج غم خواری میں تلاش کرو۔“ یا کسی شخص نے حالات کا گلہ کرتے ہوئے کہا کہ یا امیر! زمانہ بہت خراب ہے اس وقت آپ نے جواب دیا۔ ”زمانے کا گلہ مت کرو، زمانہ تو تم خود ہو۔“ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ جواب کس یقین اور کیسے ایمان کی علامت ہیں؟ کیا ایسے یقین کی موجودگی میں اضطراب یا مایوسی کا گزر ہو سکتا ہے؟ کبھی بھی نہیں، اور کیا اس یقین کے بغیر آج کا انسان اپنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا علاج کر سکتا ہے؟

☆☆......☆☆
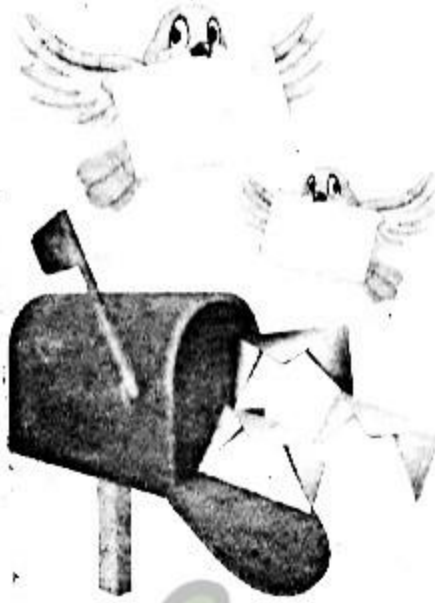
دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ، خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

خط بھجوانے کے لیے پتا: ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ۔ 110' آدم آرکیڈ شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی
E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بہت پیارے ساتھیو!

آپ سب کی محبت میرا مان ہے۔ یہ صرف لفظ نہیں میرے دل کے چاروں خانوں میں دوڑتا لہو بھی یہی پکارتا ہے اور اب تو ایسا لگتا ہے کہ اس دل میں ایک پانچواں خانہ بھی اپنی جگہ بنا چکا ہے، جس میں میرے 'قلم پیارے' رہتے ہیں۔ یہ میرے 'قلم پیارے' میرے دل کی دھڑکنوں کو ہمہ وقت کچھ بہتر سے بہتر کرنے پر اُکساتے ہیں۔ ہر ماہ پرچہ دینے کے بعد میں خود کو کسی کٹہرے میں کھڑا محسوس کرتا ہوں، اور آپ کے خطوط مجھے بتاتے ہیں کہ میں اس ماہ کتنا آپ کی اُمیدوں پر پورا اتر سکا۔ خدا میرے قاری اور لکھاری دوستوں کو سلامت رکھے (آمین)۔

''ابھی یہ دعا مانگے دیر نہ ہوئی تھی کہ اچانک سے ایک Call آئی۔ 28 اکتوبر شب 10 بجے کہ تم ابھی تک یہیں ہو (آفس میں) ریحانہ خالہ کا انتقال ہوگیا ہے۔'' خبر ایسی تھی کہ دل رونے لگا مگر میں پرچہ جڑوا رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں میں اپنی چھوٹی خالہ کی مسکراتی صورت سموئی اور دعائے مغفرت کی دعا کی اور محبت پر فرض کو فوقیت دی اور کام میں جُت گیا۔ یہ اور بات تھی کہ آنکھوں کے سمندر میں اُن کی آوازیں اور دلآویز شخصیت ڈوبتی ابھرتی رہی۔ اور پھر جب میں نے ذرا غور کیا تو یاد آیا کہ خالہ کے ساتھ ہمارا جتنا بھی ساتھ رہا انہوں نے آج تک بھی کسی کی غیبت یا برائی نہیں کی تھی حالانکہ وہ بلا کی حاضر جواب اور نظر بین تھیں اور یوں بالکل اچانک، عین جوانی میں اتنی دور چلی گئیں۔ جہاں سے کوئی واپس نہیں آسکتا۔ میری خالہ ریحانہ وسیم کے لیے مغفرت کی دعا ضرور کیجیے گا۔

دیکھتے ہیں اس ماہ ہمارے لکھاری قبیلے سے کیا خبریں ہیں۔

☆ ہماری ہر دل عزیز لکھاری رضیہ مہدی کے چھوٹے بھائی حبیب سید اس ماہ قضائے الٰہی سے وفات پاگئے۔ دکھ کی اس گھڑی میں ہم رضیہ جی کے ساتھ ہیں اور خدا سے صبر کے لیے دعا گو ہیں۔

☆ بہن اُم مریم کے ماموں بھی پچھلے ماہ وفات پاگئے تھے۔ ہم اُن کی مغفرت کے لیے بھی دعا گو ہیں۔

☆ ہماری سدا بہار لکھاری ساتھی دلشاد نسیم کو 11 نومبر اور 23 نومبر کو مونی سی بہن زمر نعیم کو 'جنم دن' کی مبارکباد قبول ہو۔ خدا کرے عمر دراز اور زیادہ (آمین)

☆ہماری باکمال نگہت اعظمی صاحبہ کو افسانوں کی نئی کتاب 'صندل کا درخت' کی اشاعت پر مبارکباد۔ اس کتاب کے اکثر افسانے دوشیزہ میں شائع شدہ ہیں۔ کتاب کا ٹائٹل شاندار ہے۔

✉ :مظفر گڑھ سے ہر دلعزیز دردانہ نوشین خان کی محفل میں آمد ہے رقم طراز ہیں، ڈیئر کاشی چوہان السلام وعلیکم! جب ایوارڈ تقریب سے ہو کر آتے ہیں تو کچھ عرصہ تک دوشیزیا چڑھا رہتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ افاقہ ہو جاتا ہے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ افاقہ بہتر ہے یا عارضہ...... سب سے پہلے رخسانہ سہام مرزا کے لیے دل کی گہرائی سے کامل صحت یابی کی دعا ہے۔ میں اپنے گزشتہ ماہ کے خط میں مذکورہ قلمکاروں کے ناموں کے حوالے سے وضاحت کردوں کہ یہ صف بندی عمروں کے لحاظ سے نہیں تھی (کہ خواتین عمر کے بارے میں حساس ہوتی ہیں) پچاس برس کی عمر میں پہلی تحریر لکھنے والا رائٹر بیس سالہ تجربہ رکھنے والے چالیس سالہ رائٹر سے جونیئر ہوتا ہے۔ سمیع اللہ خان (ہاکی فیم) کا انٹرویو میں نے دلچسپی سے پڑھا، خوب ہے۔ وہ رنگ محفل، کا عنوان گزشتہ تقاریب کی یادوں کا در کھول دیتا ہے۔ فرزانہ بلاشبہ میکہ عورت کی روٹس ہیں۔ یہ مضبوط ترین خانگی اور خون کے رشتے کا تعلق ہے۔ مگر یہ ایک محدود سطح ہے۔ مہتاب اکبر راشدی کے بقول عورت کو انسان (بلاتفریق جنین) لیا جائے تو بقول علامہ اقبال

عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام

عشق کی تو ع ش ق الگ الگ کر کے پلندوں کے پلندے لکھ دیے گئے۔ عشق بی بی آسیہ نے پتھر کی گرم چکی تلے کیا تھا۔ عشق یعقوب علیہ السلام نے فرزند سے کیا تھا۔ عشق قرن کے ایک مردِ خدا نے کیا تھا۔ عشق حسن جوانی بینائی قربان کردینے والی زلیخا نے کیا تھا۔ عشق کی نچلی ترین منازل بھی دنیا کی ارفع ترین منازل ہیں۔ حصول پاکستان بھی عشق جنوں خیز تھا اور فرزانہ کا فرزند فراز کے لیے ناممکن کی رکاوٹ توڑتا، آہنی عزم جگاتا عشق ہی تھا۔ کیا میں نے غلط کہا؟ فرحت صدیقی نے لکھا ہے کہ کون ہے جو پہلے افسانے پر ایوارڈ لیتا ہے۔ جی میں نے اوائل عمری میں پہلے افسانے 'جیون کھیل' پر ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ رضیہ مہدی کو میں چپ چپ لگی۔ رضیہ آپ کو اللہ صحت کاملہ عطا کرے۔ سنبل کو میں خاموش لگی۔ شاید جیسے میرا کچھ چہروں سے تعارف نہیں ہوتا، تحریروں سے تو ہوتا ہے۔ رضیہ مہدی سے فون پر بھی غالباً رابطہ ہوا تھا۔ اسی طرح کچھ لوگ مجھ سے مانوس نہیں ہوتے۔ لیکن میں یہ واضح کردینا چاہتی ہوں کہ اتنی دور سے، اتنے تردد سے پہنچ کر میرا مقصد الگ تھلگ بیٹھنا نہیں تھا۔ مجھے نیئر شفقت، فرحت، عقیلہ حق، مسز نگہت غفار اور اُن تمام لوگوں سے جن سے بات نہ کرسکی، بات نہ کرنے کا ملال ہے کیونکہ اب یہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ نسیم نیازی میرے ساتھ ساتھ رہیں۔ مگر انہوں نے میرا ذکر یونہی سا کیا۔ سباس گل نے 'کڑوی روٹی' نئے موضوع پر لکھا۔ کچھ افسانے ابھی پڑھے نہیں اس وقت مظفر گڑھ سیلابی ریلے کے پڑوس میں ہے۔ ذہن میں افراتفری بھی ہے اور صبر بھی...... 2010 میں سندھ کی زد میں آنے والا کوٹ ادو (میرا سسرال) اب محفوظ ہے۔ ہم نے سیلاب کی بھی باریاں لگالی ہیں۔ میرا حال پوچھنے والوں میں قریبی احباب کے علاوہ کمیاب فون کرنے والوں میں بشریٰ رحمٰن، محترم ابدال بیلا، محمد فہیم (سچی کہانیاں فیم) فرزانہ آغا، صفیہ سلطانہ سب کا بہت شکریہ۔

ش: بہت عزیز! ہمارا مان ہماری دردانہ نوشین خان صاحبہ! سب سے پہلے تو آپ سے معذرت کہ آپ کا اتنی

محبت سے بھیجا تبصرہ پچھلے ماہ شائع ہونے سے رہ گیا۔ آپ نے کیوں کہا کہ اب نہیں آنا۔ قسمت کے لکھے کو انسان تو نہیں مٹا سکتا آپ نے آنا ہے اور اب پورے ہان کے ساتھ آنا ہے۔ انشاء اللہ۔

✉: لاہور سے رضوانہ کوثر کی محبتوں بھری آمد ہے لکھتی ہیں بے حد عزیز کاشی، خدا آپ کو اور ادارے سے منسلک ہر فرد کو اپنی امان میں خوش و خرم اور سلامت رکھے۔ آمین۔ موہنی سی صورت والی دوشیزہ سرورق سجائے، بالوں میں انگلیاں پھنسائے نہ جانے اُس سمت کسے ڈھونڈ رہی تھی۔ خوبصورت دوشیزہ سے اس دفعہ 6 تاریخ کو ہی ملاقات ہوگئی۔ اشتہارات سے تو اب کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ شور زیادہ عمل ندارد سو پھلانگو نہیں، فہرست پڑھو اور خوبصورت دلنشین ساتھیوں کے نام پڑھ کر اداریے پر پہنچو۔ کاشی آپ کے اداریے بہت لاجواب اور ہم سب کے دل کی آواز ہیں مگر تبدیلی اسی صورت ہے جب مسلمان ایمان کے دائرے میں رہ کر باعمل ہوں گے۔ اللہ کے احکام اور سنت رسول کی پیروی میں، رب العزت ہم سب کو توفیق دے۔ آمین، منورہ نوری نے جو دیے روشن کیے ہیں ان کی روشنی سدا رہنے والی ہے۔ کاشی محفل کے آغاز میں آپ کے الفاظ باکمال ہیں۔ سعادت نسرین، غزالہ جلیل اللہ آپ کو مکمل صحت سے نوازے۔ دردانہ نوشین کو ایوارڈ (پھولوں کی رفو گری پر) پیاری عقیلہ حق کو Lion کلب کی صدر اور فرحت جمال کو اسی کلب کی ممبر چننے پر میری دلی محبت بھری مبارکباد، بینا عالیہ، رضیہ مہدی، افسر سلطانہ، شگفتہ شفیق، گل آپا، صفیہ سلطانہ آپ سب کی محبتوں کا شکریہ، ثناء ناز، مومنہ بتول، صالحہ صدیقی، یاسمین اقبال اور حنا رضوان خوش آمدید۔ حنا آپ کی خالہ ہمیں پیاری ہیں تو آپ بھی پیاری ہو ہمیں۔ اور دوشیزہ سے وابستہ ہر فرد مجھے تو بہت عزیز ہے۔ عرصے بعد عمران مظہر کو محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ گویا کہ محفل تبصروں سمیت عروج پر ہے۔ رخسانہ سہام کے لیے بہت دعائیں۔ حفصہ خان سے ملاقات اچھی رہی۔ سمیع اللہ سے تفصیلی ملاقات بہت ہی اچھی رہی۔ قومی ہیرو کے ساتھ منزہ، کاشی اور شگفتہ سب بہار کے جھونکے لگے۔ آگے تمام معتبر لکھاریوں کے آنکھوں دیکھے احوال کی کہکشاں سجی تھی۔ فرزانہ آغا، دردانہ نوشین، رفعت سراج، شائستہ عزیز (تصویر کیوں نہیں بھجی) دلشاد نسیم، فرحت صدیقی، ناہید فاطمہ، سنبل، عقیلہ حق اور نسیم نیازی دھنک رنگ الفاظ لیے موجود اور ان کے درمیان ایوارڈ یافتہ تصاویر، ویل ڈن کہ ایوارڈ نمبر 2 بھی اول نمبر ہی رہا۔ اب آتی ہے باری ناولز اور ناولٹ کی بیناجی، بہت خوب آپ کا ناول واقعی ہر کردار فٹ اور اپنے عشق کے دائرے میں رقصاں ہے۔ آئینہ، عکس اور سمندر عقیلہ حق کی تحریر اس دفعہ کافی جاندار رہی اور دل کی دھڑکنوں کو اعتدال پر لاتے ہوئے قسط کا اختتام ہوا کہ شاید فراز کو زرقون پر رحم آجائے۔ اب باری ہے نسیم نیازی کے ناولٹ 'محبت شام بخیر' کی۔ جس کا آغاز منفرد عنوان اور خوبصورت شعر سے ہوا۔ خوبصورت جذبوں کی مالک ماہا اور شیث (اس کا مطلب بھی نسیم سے پوچھنا پڑے گا) اور مردوں کی اکثریت کی طرح اپنی انا کا جھنڈا اونچا رکھنے والا جن کی محبت کو رائٹر نے پُر معنی الفاظ جملوں اور جذبوں سے مزین کیا۔ پوری کہانی پر گرفت مضبوط رہی۔ اور آخر میں ماہا کے وہ الفاظ بہت جاندار رہے جنہوں نے شیث کو آئینہ دکھا کر انگوٹھی واپس کر کے رشتہ توڑا کیونکہ ساری زندگی ایسے مرد کے ہاتھوں عزت نفس مجروح کرنے سے بہتر ہے کہ جدائی کا دکھ اٹھا لیا جائے۔ انجام بہت بہترین لگا۔ ویل ڈن نسیم نیازی قابلِ احترام رفعت سراج کی اہم موضوع پر لکھی عمدہ تحریر تجسیم سے تقسیم تک بے حد پسند آئی۔ وڈیرہ سسٹم کی لن ترانیوں کا انجام کافی اچھا اور حقیقت پر مبنی رہا کہ ایک مستند نام (رفعت سراج) کی تحریر پر کچھ کہنا تو
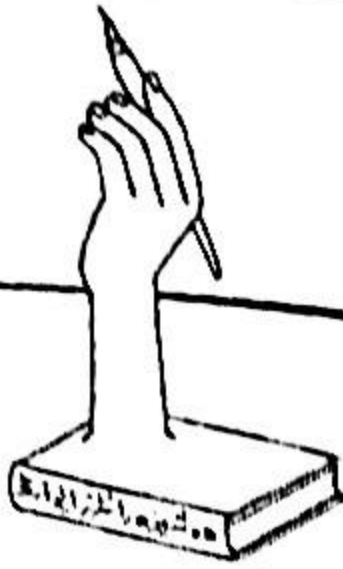
دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

اکتوبر 2014 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

''کہانی تم بھی ہو'' فرزانہ آغا

آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ نومبر 2014

عنوان: ____________________

قلم کار: ____________________

نام: ____________________

پتا: ____________________

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ حمیرا خان کی ہلکی پھلکی محبت کے موضوع پر لکھی 'عید فسانہ' بھی خوب رہی۔ تمثیلہ زاہد نے بھی اچھا لکھا۔ روشانے عبدالقیوم کا 'سفید کرتا' اور سپاس گل کی 'کڑوی روٹی' غربت کے مارے معاشرے کی سچائیاں تھیں مگر سپاس گل نے بذبانِ مسلمان اس زندگی اور احساسات کا بالکل صحیح نقشہ کھینچا جس نے عام موضوع کو خاص تحریر بنا دیا۔ عظمیٰ شکور کا افسانہ 'میرے نام کا چاند' بس سو سو رہا۔ خاص متاثر نہ کر سکا۔ صاعقہ رفاقت کی 'تو پاس ہے پھر بھی' محبتوں کی آزمائش سے گزرتی ٹھیک لگی۔ عادل حسین کی 'ایک اور پتھر' لکھاری نے مختصر الفاظ میں جامع حقیقت واضح کر دی۔ انتخابِ خاص میں رام لعل کا رشتہ ممتا کی ڈور سے بندھا مضبوط ترین اور خاص الخاص رہا۔ جاوید اصغر کے شیخ جی بھی خوب رہے۔ تو یہ تھا مکمل تبصرہ، باقی سلسلے بھی مفید ہیں۔ اشعار کے بغیر رنگ پھیکا لگتا ہے۔ کچھ سوچو سب اس بارے میں بھی اس سے پہلے کہ خط ختم کروں۔ عقیلہ حق آپ کی بہت شکر گزار ہوں کیوں؟ خود ہی بوجھ لیں اور شائستہ عزیز آپ کی پُر اثر تحریر میں یاری کے بعد آپ کی اگلی تحریروں کے منتظر ہیں۔ شمسہ فیصل آپ کو بیٹے کی آمد بہت مبارک ہو۔ اب اجازت دانیال شمسی، عبدالرحمٰن چوہان کو سالگرہ مبارک اکتوبر میں (16 اکتوبر اور 8 اکتوبر) بہت سی دعائیں اور میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ اللہ حافظ۔

ﮪ: رضوانہ جی! آپ کا تبصرہ ہمیں مہمیز کرنے کا باعث بنتا ہے۔ خدا آپ کو صحت دے (آمین)۔

✉: کراچی سے ایک طویل عرصے بعد ہماری لکھاری ساتھی نگہت اعظمیٰ کی محفل میں آمد ہے، لکھتی ہیں۔ دوشیزہ میں سب کو عید مبارک، رخسانہ باجی کی علالت کی خبر پڑھی، بہت فکر ہوئی خدا انہیں جلد از جلد صحت کاملہ عطا فرمائے اور تمہارے سروں پر اُن کا سایہ قائم رکھے۔ ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کے لیے کپڑے تک پریس کر لیے تھے لیکن عین وقت پر ناسازیٔ طبع کی وجہ سے شریک نہ ہو سکی۔ جس کا بہت افسوس ہے اور یہ افسوس آئندہ تقریب تک رہے گا۔ لیکن تقریب کی روداد پڑھ کر ساری تقریب آنکھوں میں پھر گئی اور سب سے آدھی سے زیادہ ملاقات ہو گئی پوری تقریب کا ایک ایک لفظ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پڑھا کہ شاید کہیں اس ذرہ بے نشاں کا بھی کوئی ذکرِ خیر نظر آ جائے۔ لیکن توبہ کیجیے کہ ذکر تو ذکر کسی نے نام لینا بھی گوارا نہ کیا۔ نئی تو پھر نئی ہیں لیکن جو پرانی ساتھی ہیں، جن کے ساتھ محبت اور قلم کا رشتہ ہے انہوں نے بھی نام لینا وقار کے منافی سمجھ لیا۔ یہ تو حقیقت ہے کہ میری ذات ذرہ بے نشان ٹھہری لیکن اِس دل کا کیا کریں جو چاہتا ہے کہ لوگ ہمیں ملک عدم کا رہائشی نہ سمجھیں اور کبھی کبھار یاد کر لیا کریں۔ گلہ تو نہیں لیکن دل کو ملال ضرور ہے۔ اُن رائٹرز سے جن سے ہم نے کبھی اُدھار نہیں لیا اور نہ ہی انہوں نے ہم سے کوئی اُدھار لیا۔ پھر بھی انہوں نے ہمارا نام تک نہیں لیا انہیں شاید یہ خوف ہو کہ اگر نام لے لیا تو کہیں یہ جنات کی طرح حاضر نہ ہو جائیں۔ ویسے میں جنات کے قبیلے سے تو نہیں لگتی۔ ہو سکتا ہے اب لگنے لگی ہوں۔ تھوڑا سا گلہ ہے رضیہ مہدی، شائستہ عزیز، صبیحہ شاہ، سیما رضا ردا (آخر الذکر دونوں نے چپکے چپکے دعوت بھی کر لی اور ہمیں کانوں کان خبر نہ ہونے دی کہ کہیں ہم محبت کے مارے پہنچ ہی نہ جائیں) فرزانہ آغا، نسیم نیازی، نسیم آمنہ، سنبل، عقیلہ حق (ہم آج تک شرمندہ ہیں عقیلہ حق سے کہ ہم نے تمہیں بیٹے کی شادی پر نہیں بلایا تھا۔ لیکن نہ بلانے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہمارے پاس نہ تمہارا فون نمبر تھا اور نہ ایڈریس اور نہ اب ہے کیونکہ جو نمبر تمہارے نام سے **Save** ہے اُس پر وہی آواز آتی ہے کہ جس کو سُن کر دل جل جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ لیکن اِس کا یہ بدلہ تو نہیں کہ تم اپنی ڈکشنری سے ہمارا نام ہی خارج کر دو)۔ مہتاب راشدی سے کوئی گلہ نہیں

کہ اُن سے صرف اسٹیج پر سلام دعا ہوئی تھی اور ہم ایسے خوش فہم کہ اِس سلام ودعا پر آس لگائے بیٹھے تھے کہ وہ اپنی تقریر میں ہمارا ضرور ذکر کریں گی۔ گلہ تو ہمیں محمود شام صاحب سے بھی نہیں جو ہماری کتاب کی تقریب رونمائی میں غالباً مہمان خصوصی تھے انہوں نے بھی ذکر نہیں کیا کہ ''آبگینے'' کی مصنفہ نظر نہیں آرہی اور رہیں تم تو تم سے بھی شکایت ہے کہ تم سب کو ایوارڈ دیتی ہو۔ کہیں سے کوئی پرانا ٹوٹا پھوٹا ایوارڈ ہی نکال کر ہمارے ناول کو بخش دیتیں، اُس کے اشک بھی ستارہ بن جاتے۔ ویسے تم سے گلہ ناجائز ہے کہ تمہارے کاندھوں پر بڑی بھاری ذمہ داریاں ہیں۔ کاشی چوہان کا کیا ذکر کریں کہ اُس نے ہمیں آپی کہہ دیا ہے لہٰذا اب میرا اُس کا ڈانٹ ڈپٹ کا رشتہ ہے اُس سے گلہ نہیں کروں گی، اُس کے کان کھینچوں گی۔ دوشیزہ کی تحریریں بہت بہتر ہوتی جارہی ہیں۔ اِس دفعہ کی ساری تحریریں بہت اچھی تھیں۔ میں نے اِس دفعہ تسلی سے پورا رسالہ پڑھا اور دل لگا کر پڑھا۔ کتاب بھجوا رہی ہوں۔ اگر کبھی میری یاد آئے تو ورق گردانی کر لینا۔ عقیلہ حق کے ناول کی قسط بہت عرصے بعد پڑھی اور واقعی اچھی لگی اس لیے پوری پڑھی اور اگلی کا انتظار ہی کر رہی ہوں۔ سب کو ادارے میں بہت بہت سلام اور دعائیں۔

✍: نگہت آپی! لیجیے کان کھینچیں، آپ کی آمد اور افسانے نے میرے بھی سارے گلے دھو دیے ہیں۔

✉: کراچی سے محفل میں یہ اولین آمد ہے سعدیہ عابد کی، لکھتی ہیں۔ دوشیزہ کے نمبر پر پہلی دفعہ کال کی اور اُمید افزا جواب ملا تو پہلی دفعہ دوشیزہ کے کچھ لکھنے اور ارسال کرنے کی ہمت کر رہی ہوں۔ مجھے نہیں پتا کہ میری تحریر دوشیزہ کے معیار پر کھری اُترے گی بھی یا نہیں؟ مگر کسی اُمید کے تحت اپنی ایک کاوش 'میری ریاضت، میری چاہت' کے عنوان سے ارسال کر رہی ہوں۔ منزہ آپی! اگر میری تحریر دوشیزہ کے معیار پر اترے تو پلیز ضرور اُسے دوشیزہ کے اوراق کی زینت بنائیں اور معیار پر نہ اُترے تو حوصلہ افزائی ضرور کریں تاکہ آئندہ ایسی کوشش کرنے میں پھر سے کامیاب ہو جاؤں کہ میں کوئی لکھاری نہیں ہوں، میں تو محض لکھنے کی ادنیٰ سی کوشش کر لیتی ہوں۔ یہ میری خوش نصیبی ہی ہے کہ مجھے ردا اور حنا میں لکھنے کا موقع دیا گیا، ایک موقع آپ سے طلب کر رہی ہوں۔ اُمید ہے حوصلہ افزائی کی جائے گی اور میری تحریر اور شاعری کو دوشیزہ کی زینت بنا دیا جائے گا اور غیر معیاری ہونے کی صورت میں بھی حوصلہ افزائی کی جائے گی تاکہ میں آئندہ بھی اپنی تحریریں دوشیزہ میں ارسال کرتی رہوں، شکریہ۔

✍: اچھی سعدیہ! حوصلہ افزائی اور حوصلہ شکنی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ہم 42 برس سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ یاد رکھیے مختصر تحریر کا نمبر جلدی آجاتا ہے۔ اب بتائیں میں آپ کے 300 صفحات کی تحریر کس طرح اور کہاں جلد Adjust کروں؟ محنت کیجیے تحریر میں مزید پختگی لائیں اور فی الحال انتظار......

✉: لاہور سے فریدہ جاوید فری مختصر سے تبصرے کے ساتھ شاملِ محفل ہیں لکھتی ہیں ہماری فیورٹ اور ہر دل عزیز رخسانہ سہام جی کی بیماری کا سن کر دل بے حد دکھی ہوا اللہ تعالیٰ ان کو صحت کاملہ عطا کرے آمین۔ میرا پہلا مجموعہ کلام پانچواں موسم تھا جسے بے حد پذیرائی ملی۔ محترم بھائی میں نے پہلے مجموعہ کے لیے بھی درخواست کی تھی کہ میرا ایڈ دو دوشیزہ میں یا سچی کہانیاں میں دیں۔ پلیز اب محبت یاد رکھو گی کا تو شائع کر دیں شکریہ میں اگلے ماہ انتظار کروں گی۔

✍: اچھی فریدہ جی! تبصرہ اتنا مختصر کیوں؟ آپ کو اپنی کامیابیاں بہت بہت مبارک ہوں۔ خدا آپ کو نظرِ بد سے بچائے (آمین)۔

✉: ہمارے ریگولر لکھاری اور شاعر ساتھی عادل حسین کراچی سے رقم طراز ہیں، اکتوبر کا دوشیزہ اپنی روایتی

آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ کاشی بھائی آپ ٹائٹل روایت سے ہٹ کر پیش کر رہے ہیں اور یقین جانیے کہ بہت خوبصورت اس بار کا ٹائٹل بھی بہت خوب تھا۔ کاشی بھائی آپ کا اداریہ ہر بار کی طرح خوبصورت، کاش کے ہم صرف غور ہی نہ کریں بلکہ جاگ بھی جائیں۔ زادِ راہ واقعی بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اللہ ہمیں عمل کرنے کی توفیق دے۔ محفل میں داخل ہوئے تو ہر بار کی طرح دل سے واہ نکل گئی۔ شمسہ فیصل جی کو بیٹے کی بہت بہت مبارکباد، عقیلہ حق صاحبہ کے بھانجے کو اللہ پاک صحت یاب کرے۔ غزالہ جلیل راؤ کو نئے ناول، سنبل جی کی خالہ کو حج، رضوانہ کوثر کو بیٹے کی سالگرہ اور فصیحہ آصف خان کو ایوارڈ کی بہت بہت مبارکباد، خطوط سب کے شاندار تھے۔ احمد سجاد بابر صاحب، روبینہ شاہین، حمیرا خان، فصیحہ آصف خان، رانا زاہد حسین صاحب اور فرح عالم صاحبہ میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے افسانے پر کچھ کہا۔ سجاد بابر آپ کی محبت پر دل سے دعائیں۔ دلشاد نسیم کی دل کی باتیں بھی زبردست تھیں۔ سوچنے پر مجبور کرنے والی، منی اسکرین کے تبصرے معلومات میں اضافہ کر گئے۔ فہیم برنی سے ملاقات بھی مزیدار تھی۔ قسط وار ناول تینوں ہی بہت زبردست چل رہے ہیں۔ تینوں خواتین کو ڈھیروں مبارکبادیں، اس بار مکمل ناول فرزانہ آغا صاحبہ کا تھا۔ ایک بہترین موضوع پر لکھا گیا شاندار ناول، جس میں وطن سے محبت، مدرسوں کا کردار، دہشت گردی اور اُس کے اسباب کچھ مخصوص ایریاز کی مفلسی، روایات، محبت، رشتے، منظر کشی اور خوبصورت اختتام میرا قلم فرزانہ جی کی تعریف کے قابل نہیں ہے بس ایک لفظ میں زبردست۔ میرے پرندہ دل پر تبصرہ پورا پڑھنے کے بعد...... سب سے پہلا افسانہ دردانہ نوشین خان کا میٹرو بس تھا۔ کیا خوبصورت طمانچہ تھا اور کیا خوبصورت کردار تخلیق کیا تھا زینت کا۔ زندگی بے شک بہت بدل گئی ہے مگر غریب کے خواب، مجبوریاں اور بے بسی آج بھی ویسی ہی ہے جیسی روزِ اول تھی۔ بہت مبارک دردانہ جی۔ نسیم سحر جی کا اماں کا بکرا بھی اچھا تھا۔ ایک مشرقی بہو کی خوبصورت منظر کشی، مینا تاج کا کمہار بھی بہت خوبصورت۔ ایک ایسی لڑکی کی کہانی جو رشتوں کو نبھاتے نبھاتے اپنا آپ بھول جاتی ہے۔ طبقات کی چکی میں پس کر جس کی اپنی شخصیت پس جاتی ہے۔ اچھی تحریر تھی۔ فصیحہ آصف خان جی کا کالا جوتا بھی بہت خوب تھا۔ کچھ لوگ خواہشات پوری کرنے کے لیے ضمیر کا سودا نہیں کرتے۔ جب کہ جب کوئی چھوٹی سی خواہش بھی اُن کے لیے زندگی کا مسئلہ بن جاتی ہے۔ خوبصورت فصیحہ جی، نوشین اقبال نوشی کا تم میرے ہو ایک محبت سے پُر تحریر، بے شک محبت انسان کو بدل دیتی ہے۔ اگر اس محبت نے رابیل کو بدل دیا تو یہ لازم تھا اچھا طرزِ تحریر تھا۔ مزا آیا۔ نصرت سرفراز کا ایک ترے جانے کے بعد ایک ہلکے پھلکے انداز میں لکھی گئی تحریر۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے۔ منیبہ چوہدری صاحبہ کا ٹیڑھی تحریر بھی محبت بھری تحریر، اچھا لگا۔ مومنہ بتول کا آگہی کا پل بھی اچھا افسانہ تھا۔ رشتوں کی توڑ پھوڑ تو اب ہر گھر کا مسئلہ بن گیا ہے۔ یہی سب کچھ اس تحریر میں بھی تھا۔ اچھا لکھا ہے مومنہ جی نے، انتخاب خاص واقعی خاص تھا۔ واجدہ تبسم صاحبہ کا ایک خوبصورت افسانہ، بے شک اس گہنے سے زیادہ قیمتی گہنا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ پڑھ کر بہت مزا آیا۔ دوشیزہ گلستاں بہت خوب ترتیب دیا ہے اسماء اعوان نے، میری غزل کی اشاعت پر شکریہ، سب کا کلام خوبصورت تھا۔ اور زین کے جوابات تو ہوتے ہی زبردست ہیں۔ ویلڈن زین جی، لولی ووڈ بولی ووڈ بھی معلومات میں اضافے کا سبب، رنگِ کائنات میں اس بار بقر عید کے حوالے سے ایک خوبصورت تحریر پیش کی گئی۔ مزا آ گیا۔ مختار بانو طاہرہ جی کو دعائیں، حکیم جی کے نسخے بھی کام کے ہیں اور نادیہ طارق

جی کے کچن کارنر کی تو بات ہی کیا۔ زبردست، ڈاکٹر خرم مشیر کا ہر مشورہ مفید ہوتا ہے۔ تو اس سلسلے کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کاشی بھائی اول سے آخر تک پرچہ غلطیوں سے بالکل پاک تھا اور بھرتی کی کوئی چیز نظر نہ آسکی۔ اللہ آپ کو اسی طرح کامیاب کرے۔ آخر میں اِس بات کے ساتھ اجازت کہ کسی کا دل دُکھا ہو یا میری کوئی بات بری لگی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو، اللہ حافظ۔

✍: عادل! تبصرہ شاندار ہے۔ اگلے تبصرے کا انتظار ہے۔ خوش رہو اور خوشخبری کب دے رہے ہیں۔

✉: کراچی سے مومنہ بتول عرض کرتی ہیں عید قرباں مبارک اس شمارے میں آپ کا اداریہ بعنوان 'الٹراوائلٹ شعاعیں' پڑھا۔ حقیقت سے قریب تر لگا سچ ہے کہ اب ہم انسانوں میں 'علم، محبت، دوستی، ایمانداری جیسی اعلیٰ صفات کو یہ الٹراوائلٹ شعاعیں بے ضرر طریقے سے پھاڑ چکی ہیں۔ ہم اقدار سے ہٹ گئے ہیں۔ اپنی میراث کھونے والے ہیں۔ اپنے افکار کو بھول بیٹھے ہیں۔ سچ پوچھیے اپنے آپ سے، اپنے دل سے جس میں آپ تمام قوم مسلمان شامل ہیں۔ کیا ہم اپنے شعوری محور سے ہٹ نہیں گئے۔ قدرت کے عطا کردہ شرف اشرف المخلوقات کے معنی تک بھلا بیٹھے ہیں...... آخر کوئی اک وجہ تو رہی ہوگی جو قادرِ مطلق نے ہمیں لفظ مومن اور مومنہ کہہ کر پکارا اور ہم اپنے خالق کو ہی بھول گئے۔ محور سے ہٹ گئے، کیا اب بھی، ہمیں بطور سزا کوئی الٹراوائلٹ شعاعیں بھسم نہیں کریں گی۔ ہمیں نہیں پھاڑ کھائیں گی۔ رحم...... رحم اے قادر مطلق، ہم تو دعا کے قابل بھی نہیں رہ گئے۔ استغفراللہ ہمیں راہ مستقیم عطا فرمائے۔ آمین احوال میں ہمیشہ کی طرح دلچسپی قائم رہی۔ تمام اہل سخن بھائی بہنوں کو پڑھا بہت اچھا لگا۔ آپ کی حوصلہ افزائی کا بھی بے حد شکریہ کہ آپ نے مجھ ناچیز کو بھی شرف قبولیت بخشا۔ انشاء اللہ آگے بھی آپ کے معیار پر اترنے کی کوشش رہے گی۔ فرزانہ آغا کا مکمل ناول سرفہرست رہا۔ باقی مختصر کہانیاں بھی اچھی لگیں۔ چند اک باقی رہ گئیں ہیں۔ تبصرہ اور خط بھی بہت لیٹ ہوگیا ہے وجہ...... عید قرباں اور اُس کے لوازمات ٹھہرے۔ بڑی مشکل سے وقت نکال کر کاغذ قلم سنبھالا ہے۔ لیٹ ہونے پر معافی کی طلب گار۔

✍: مومنہ جی! تبصرہ...... اُمید ہے اگلے ماہ ہمیں آپ کا بھرپور تبصرہ پڑھنے کو ملے گا۔ افسانہ بھی جلد شائع ہوگا۔

✉: احمد سجاد بابر کا برقی نامہ لودھراں سے موصول ہوا، عرض کرتے ہیں کہ اکتوبر کا شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے کیونکہ لودھراں کی تہذیب و ثقافت پر ایک پراجیکٹ کے سلسلے میں واقعی سر کھجانے کی فرصت نہیں، پراجیکٹ اس وجہ سے بھی لے لیا کہ شوق کے علاوہ اپنی جنم بھومی کی ایک ایک اینٹ کو چھونا، اس کی خاک تلے جھانکنا میرا خواب رہا ہے، اس مرتبہ پرچے کے مواد کا انتخاب آپ کے حسنِ انتخاب کا ثبوت ہے، فرزانہ آغا مکمل ناول ''کہانی تم بھی ہو'' کے ساتھ موجود تھیں، کوئی شک نہیں کہ یہ وہ تحریر تھی جو اداس کر جاتی ہے، یہ وہ شاہکار پینٹنگ تھی کہ جس کے رنگ دیکھے نہیں جاتے۔ یہ ایسا سچ تھی جس کی تاب نہیں لائی جاتی۔ معاشرے کا کھوکھلا پن، دوہرے معیار، دولت کی ریل پیل کے پہلو میں بھوک سے مرجھائے چہرے، پروٹوکول کی ہوس، فیشن کے نام پر دولت کی نمائش، عالمی طاقتوں کا مکروہ کھیل، حکمرانوں کی غفلتیں، مدرسوں کو آزاد چھوڑ دینا، غربت کے ثمرات میں دہشت گردی کا عفریت پلنا...... غرضیکہ کیا کچھ نہیں تھا اس تحریر میں۔ فرزانہ جی کا مخصوص اسلوب، بے باکانہ نشتر چبھوتی تحریر، جرات مندانہ کاوش کہی جاسکتی ہے۔ اسے کہتے ہیں ہٹ کر سوچنا اور ہٹ کر لکھنا۔ معاشرہ کس ڈگر پر جا رہا ہے، یہ اسکیچ کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ ہنڈیا، ڈوئی، گھریلو سازشوں، ساس نند بہو کے جھگڑوں پر بھی لکھیں مگر ان پر تو

بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے، کچھ نیا ضروری ہے۔ بہت خوب فرزانہ جی، بس ایک بات یہ کہ اس میں صبا کے کردار کو ذرا سا اور پاورفل اور بامقصد کر دیا جاتا تو یہ کردار خود کو جسٹی فائی کر جاتا۔ دردانہ نوشین خان کی ''میٹرو بس'' دیب کے درد کو کینوس پر بکھیرتی تصویر ثابت ہوئی۔ کہیں سب کچھ ہے اور کہیں سانس لینے کو مٹھی بھر ہوا اور بینائی کے لیے چٹکی بھر روشنی تک نہیں۔ زینت استعارہ ہے حقوق کی غیر منصفانہ تقسیم کا، استحصال کا اور خوابوں کی تدفین کا۔ یہ تدفین جانے کب سے جاری ہے اور خوابوں کے اس قتل کا کوئی انت بھی نہیں۔ منیبہ چوہدری نے ''ٹیڑھی تحریر'' میں فقط چار صفحات میں ایک طویل موضوع سمیٹ دیا جس میں سب کچھ تھا، ایک اچھی کہانی کا کلائمکس بھی تھا اور چونکا دینے والا اختتام بھی۔ سب سے زیادہ مایوس نوشین اقبال نوشی کی تحریر 'تم میرے ہو' نے کیا جس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ فصیحہ آصف کا ''کالا جوتا'' منفرد تھیم لیے، ہلکا پھلکا مگر گہرائی کا حامل افسانہ ثابت ہوا، ایک جداگانہ سی تحریر رہی یہ۔ نعمان الحق کا ''میرے پرندۂ دل'' مناسب لگا، غیر معمولی نہیں۔

سعد: پیارے احمد! تمہارا تبصرہ، تمہاری محبت کا ثبوت ہے۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔ تم ہمارا تابناک مستقبل ہو۔

✉: ہماری موہنی سی بہن سنبل کراچی سے رقم طراز ہیں۔ سب سے پہلے سب کو عید قربان کی بہت بہت مبارکباد۔ تمہارے اداریے کمال کے ہوتے ہیں خصوصاً ستمبر کے اداریے میں تم نے درست کہا تھا کہ ہم یہودیوں کو کیوں روتے ہیں ہم کسی سے کم ہیں کیا! اور اکتوبر کا الٹراوائلٹ شعاعیں کمال ہے۔ ہم سب کو اس پر سوچنا چاہیے۔ اب محفل کی خوشیاں اور غم بھی شیئر کر لیتے ہیں۔ سعادت نسرین، عصمت آپا کے نوید غزالہ جلیل اور عقیلہ کے بھانجے ارسلان کو اللہ صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین) عصمت آپا کی والدہ کے لیے خصوصی دعائیں۔ شمسہ فیصل کو بیٹا مبارک۔ اللہ اسے لمبی زندگی اور صحت عطا فرمائے (آمین) دردانہ جی کو ایوارڈ مبارک، فصیحہ آصف کو ایوارڈ مبارک، عقیلہ کو لائن براڈ کاسٹر کلب کا صدر بننے کی مبارکباد، غزالہ جلیل کو ناول اور فصیحہ آصف کو دو عدد ناولٹ کے مجموعے شائع ہونے کی بہت بہت مبارکباد، پیاری رضوانہ جی کو بیٹے کی سالگرہ مبارک۔ آپ ایسی ہزاروں سالگرہ منائیں بیٹے کی، خالہ آپ کو بھی اتنی بڑی سعادت کی بہت بہت مبارکباد، زم زم اور کھجوریں یاد سے بھجوا دیجیے گا۔ رضوانہ جی ویلڈن بہت مبارک ہو۔ تمام صاحب کتاب رائٹرز سے گزارش ہے وہ رضا کارانہ طور پر مجھے کتابیں بھجوا دیں آخر آپ کی پیاری سی رائٹر کا اتنا تو حق ہے ناں! آپ پر اور کاشی تم ان میں سر فہرست ہو۔ رائٹرز کے تاثرات بہت اچھے رہے جن رائٹرز نے مجھے پیار سے یاد کیا ان کے لیے جزاک اللہ۔ ہم کچھ نہیں ہوتے جب تک ہمارے پیارے ہمیں محسوس نہ کریں۔ خصوصاً فرزانہ آغا، دردانہ جی، دلشاد نسیم، فرحت صدیقی، رضیہ جی، مسز نگہت غفار، ناہید فاطمہ، عقیلہ حق، نیر شفقت، نسیم، جزاک اللہ۔ کاشی رفعت سراج تمہاری استاد ہیں تم نے کبھی بتایا نہیں حالانکہ تم اپنی ان استاد کا ذکر محبت سے کرتے ہو۔ اور عقیلہ آپ کو لگا کہ جیکٹ والا آپ کے ساتھ آئے گا اور مجھے لگا میں خود جیکٹ پہن کر آنے والی ہوں۔ آپ اکیلی آئیں گی، نہیں نہیں میرے میاں ہوں گے ساتھ۔ اچھا ان کا نام لکھوائیں۔ اور مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے۔ اس لیے دردانہ جی آپ نے جو کیوٹ بچیاں دیکھی تھیں وہ قطعی میری نہیں تھیں۔ میرے کیوٹ بچے گھر پر ماما سے ناراض بیٹھے تھے۔ شمع جی آپ کے لڑکی کہنے سے زیادہ خوشی تو مجھے آپ کو محفل میں دیکھ کر ہوئی آپ مجھے ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ اب آتی رہیے گا احمد سجاد ایوارڈ کے تاثرات کی پسندیدگی کا شکریہ، تسنیم جی کوئی

سیکرٹ نہیں ہے بس میرے گھر کوئی میڈ نہیں ہے۔ ہر کام خود کرتی ہوں اور بکریوں کی طرح جگالی سے پرہیز کرتی ہوں۔ فرح عالم شکریہ۔ فرحت اور رفعت سراج کو ایوارڈز کی زبردست مبارکباد۔ تبصر میں ہمارے قومی ہیرو فلائنگ ہارس، ڈینجر مین سمیع اللہ کا انٹرویو خاصے کی چیز رہا۔ تجسیم سے تقسیم تک سُپر...... دیر سے لکھا رفعت جی مگر کمال لکھا۔ انسانی نفسیات پر کیا خوب لکھا ہے آپ نے۔ نیم ہر ایک کے ساتھ محبت بھرا برتاؤ کرنے والی نے محبت کو رعایت کیوں نہیں دی۔ ماہا کو شیث کو رعایت دینی چاہیے تھی جبکہ اکثر وہ خود بھی اس کے ساتھ زیادتی کی مرتکب ہوتی تھی حمیرا کا افسانہ روایتی عید افسانہ تھا۔ لاسٹ تسبیح اچھی قربانی دی بشریٰ نے مثبت سوچ گڈ، سفید کرتا موجودہ حالات کا نوحہ مہنگائی اور دہشت گردی کا شاخسانہ، کڑوی روٹی سباس گل کا خوبصورت افسانہ مہنگائی اور فاقہ کشی نے ہمارے لوگوں کو کن حالوں پر پہنچا دیا ہے کہ ان کے لیے موت دائمی جدائی جیسا دکھ ہلکا کردیا ہے۔ صرف دو وقت کی روٹی اور پیسہ ہر دکھ کا مداوا، عظمیٰ شکور کا افسانہ ایسا ہی تھا جیسا کہ پہلا افسانہ ہوسکتا ہے۔ صاعقہ کا افسانہ بھی ٹھیک ہی تھا۔ عادل حسین کا افسانہ اچھا تھا ایک نئی سوچ دیتا۔ خوش امیدی کی جانب قدم اکتوبر میں میٹرو بس ایک اچھا افسانہ تھا واقعی ہم اپنی اچھی بھلی پڑھی لکھی بیٹیوں کو شادی کے نام پر کہیں بھی بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک دیتے ہیں۔ حد ہے جہالت کی۔ نیم کا افسانہ عید کے حوالے سے اچھا افسانہ تھا اگر جیون ساتھی آپ کو سمجھنے والا ہو تو عورت کی لائف بڑھ جاتی ہے۔ مینا تاج کا کمہار بہت پیارا افسانہ تھا۔ کالا جوتا ایک خوبصورت افسانہ تھا۔ خواہشات کی دلدل انسان کو ڈبوئے نہ بھی تو گرا ضرور دیتی ہے۔ نوشین کا افسانہ ٹھیک تھا مگر خاصا خشک موضوع اچھا اٹھایا ہے اور یقیناً تم اس سے انصاف بھی کرو گے۔ اک ترے جانے کے بعد خاصا مزاح کا رنگ لیے ہوئے تھا۔ ٹیڑھی تحریر خوبصورت افسانہ تھا اور لکھیں ہماری فرزانہ آغا اور کمال نہ ہو! ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے شمالی علاقوں کے حالات پر کیا خوب لکھا آپ نے فرزانہ! بہت خوب، مومنہ نے اچھا لکھا تینوں ناول خوب چل رہے ہیں۔ انتخاب خاص دونوں لاجواب تھے۔ رنگ کائنات اچھا ہونے لگا ہے ورنہ اب کچھ عرصے پہلے تک تو ہنسنے کے لیے غور کرنا پڑتا تھا کہ کس جملے پر ہنسیں۔ دوشیزہ گلستان، نفسیاتی اُلجھنیں، کچن کارنر سب اچھے ہیں۔ کچن کارنر میں بسکٹس اور کیک کی تراکیب دیں کہ زین اچھے جارہے ہو۔ نئے لہجے میں معصومہ منصور، عنبرین نعیم، خالد ہما، نیر رضاوی، دردانہ جی اور فرحت جی کی شاعری اچھی تھی۔ ریحان آفاق کی قافیہ پیمائی زبردست تھی۔ تم بہت آگے جاسکتے ہو۔ اکتوبر میں بشریٰ خالد، نیئر رضاوی، پرنس تابش، وقار خان، یاسمین اقبال، عادل حسین، نور العین عنبرین، فصیحہ آصف اور شہزاد کی شاعری اچھی تھی۔ رخسانہ آنٹی کی صحت کے لیے بہت سی دعائیں اللہ اُن کو صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین) اور کاشی میں تم سے ناراض ہوں کیا میں نے ناقابلِ اشاعت لکھنا شروع کردیا ہے، جو تم نے چھاپنا چھوڑ دیا ہے۔ اب اجازت دو۔ اپنا خیال رکھنا اور دعاؤں میں یاد رکھنا ہماری دعاؤں میں تم موجود ہو۔

ھ: سنبل جی! تبصرے میں آپ کی ایک ایک نقطے پر نظر، دوشیزہ سے آپ کی محبت کی گواہ ہے۔ ہماری خوش یقینی ہے کہ آپ ہماری ہیں۔ اس ماہ آپ کا افسانہ شاملِ اشاعت ہے۔

✉: شاہ کوٹ سے ہماری لکھاری دوست حمیرا خان کا برقی نامہ شاملِ محفل ہے، لکھتی ہیں، امید ہے آپ اور باقی سب ساتھی فٹ فاٹ خوش باش ہوں گے۔ اکتوبر کا مہینہ ایسے بھاگا جارہا ہے جیسے اس نے ہم سے قرض

خواتین کی محبوب قلم کار

کئی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ یافتہ **رفعت سراج**

رفعت سراج، جن کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

رفعت سراج، وہ قلم کار، جن کو قلم کی حرمت کا پاس، زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔

رفعت سراج، وہ قلم کار جنہیں اپنی تحریر سے دھڑکنیں بے ترتیب کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔

گلابی کاغذ اور زرد پھول کے بعد......

نئے شاہکار ناول کے ساتھ، آپ کے روبرو

بہت جلد ماہنامہ ''دوشیزہ'' ڈائجسٹ میں ملاحظہ کیجیے۔

بس تھوڑا سا انتظار اور......

لے رکھا ہو ''صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے'' والا حال ہے خیر جی ان بھاگتے دوڑتے دنوں سے کچھ لمحے چرا کر دوستوں کی محفل میں حاضر ہوں۔ سب سے پہلے تنقید اور تعریف سے قطع نظر ان سب ساتھیوں کا بہت بہت شکریہ جنہوں نے میری تحریر پر رائے دی، جنہیں پسند آئی ان کی حوصلہ افزائی کا شکریہ اور جنہیں کچھ کمی دکھی ان کے لیے انشاء اللہ آئندہ زیادہ بہتر کام کرنے کی کوشش ہوگی۔ کاشی چوہان نے ''الٹرا وائلٹ شعاعیں'' میں ملک کے موجودہ حالات کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ واقعی ضرورت بس سوچنے کی ہی تو ہے ورنہ سب کچھ صاف صاف ہمارے سامنے ہے۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی، دردانہ کی ''میٹرو بس'' اچھی لگی ہاں مگر دل کچھ اداس بھی ہو۔ لیکن کیا کیا جائے کہ سچ یہی ہے۔ مینا تاج کا ''کمہار'' پڑھ کر یہی کہہ سکتے ہیں کہ بہت خوب مینا تاج جی! بہت اچھا لکھا آپ نے۔ ''کالا جوتا'' مفلسی میں معصوم سی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے چور راستے تلاش کرنے کی داستان تھی بہت بڑی بات کو بہت سادہ انداز میں لکھا ہے آپ نے، ویری نائس جی۔ نوشین اقبال نوشی اور منیبہ چوہدری نے بھی اچھا لکھا۔ ایک نے محبت کو وصال سے ہمکنار کیا تو دوسرے نے ہجر کو ہمسفر دکھا کے دل میں عجیب کسک کا احساس جگا دیا۔ باقی پرچہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ خواہش اور کوشش تو یہی تھی کہ اس بار ذرا تفصیلی تبصرہ بھیجا جائے مگر...... انشاء اللہ اگلے ماہ سہی۔ آخر میں چھوٹا سا معصوم سا شکوہ کاشی آپ سے۔ آپ سمجھ تو گئے ہوں گے رائٹر کیا شکوہ کرسکتا ہے سوائے تحریر لیٹ ہونے کے، میں نے آپ کو اپنی پوئٹری بھیجی تھی لیکن ابھی تک اسے آپ کی نظر کرم نصیب نہیں ہوئی۔ اور کچھ کہانیاں بھی کئی ماہ پہلے کی بھیجی ہوئی ہیں ذرا توجہ دیجیے جناب۔ سب دوستوں کو بہت سارا سلام اور ڈھیر ساری دعائیں۔

✍: اچھی حمیرا جی! سلامت رہیے۔ سب سے پہلے تو تبصرے کی باقاعدگی پر مشکور ہوں۔ اس ماہ آپ کی شاعری بھی بصارتوں کا رزق ہوگی۔

✉: کراچی سے صائمہ حیدر کی طویل عرصے بعد آمد ہے، لکھتی ہیں بہت ہی قابل احترام منزہ اور کاشی صاحب السلام وعلیکم! اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ خدا کے فضل و کرم اور آپ سب کی دعاؤں سے میں بھی ٹھیک ہوں۔ دوشیزہ جس تیزی سے کامیابی کا منظر طے کر رہا ہے وہ دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ مصروفیت بہت زیادہ ہے اور پچھلے دنوں بہت زیادہ رہی اس لیے ایک طویل عرصے کے بعد حاضری دے رہی ہوں۔ میں اپنی تمام ساتھیوں کی دل سے مشکور ہوں جنہوں نے میرے افسانوں کو پسند کیا۔ سُباس گل جنہوں نے حُسن اتفاق کو بہت سراہا تھا، آپ کے لیے میرا ڈھیروں پیار، بہت پیاری رائٹر روبینہ شاہین آپ کا بھی اور دیگر تمام قارئین کا جنہوں نے ہر افسانے پر میری حوصلہ افزائی کی۔ کاشی بھائی آپ کی محنت نظر آرہی ہے دوشیزہ کا معیار اعلیٰ سے اعلیٰ ترین ہوتا جا رہا ہے۔ دوشیزہ کے رائٹر کو اہمیت اور نمائندگی ملتی جا رہی ہے۔ میں نے اپنا لکھنے کا سفر دوشیزہ ڈائجسٹ سے ہی شروع کیا تھا۔ اُس وقت یہاں غزالہ رشید ہوا کرتی تھیں انہوں نے مجھے پرکھا اور لکھنے کا حوصلہ دیا اور آج میں اس قابل بنی کہ ہم ستارے پر میرا سوپ ' کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں ' بہت مقبول ہو رہا ہے۔ کاشی بھائی آپ نے یہ تو لکھ دیا کہ میں کرائے کے مکان سے اپنے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوگئی ہوں مگر آپ کو میں یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ آپ کی بھی حوصلہ افزائی نہ ہوتی تو شاید میں اتنا آگے تک نہ آتی۔ میری تمام دوشیزہ رائٹرز اور قارئین سے گزارش ہے کہ میرا ڈرامہ ضرور دیکھیں جو کہ جمعرات اور ہفتہ تک ٹھیک سات بج کر

25 منٹ پر نشر ہوتا ہے۔ میں رسالے پر تبصرہ ضرور کرتی مگر ابھی بہت مصروف ہوں۔ اس اُمید کے ساتھ کہ اُس کو آپ جلد از جلد ضرور جگہ دیں گے۔ مجھے ایک شکایت بھی کرنی ہے دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ ہو گئے اور آپ نے ہمیں پوچھا بھی نہیں۔ ضروری تو نہیں کہ جو ایوارڈ جیتے وہی رائٹر ہو۔ کم از کم کراچی میں رہنے والوں کو ضرور بلانا چاہیے تھا۔ اس طرح مل بیٹھنے کا موقع مل جاتا۔ عقیلہ حق سے بھی ملنے کا اشتیاق ہے وہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ میں اپنی تمام ساتھی رائٹرز کو ایوارڈ ملنے پر دل سے مبارکباد دیتی ہوں۔ خدا آپ سب کو اور ترقی دے اور ہمیں دوشیزہ کا پلیٹ فارم ملا رہے۔ جس سے ہمارا نام پرنٹ میڈیا میں زندہ رہے منزہ، کاشی سب کو میرا سلام اور بہت سا پیار۔

ﷺ: اچھی صائمہ! آپ نے ترقی کی منازل طے کیں، دل ہمارا مسرور ہوا۔ قول اور فعل میں تضاد انسان کی ترقی کو ناکامی میں بدل دیتا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیے اور ہاں ایک اور بات...... دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا، اُمید ہے سمجھ گئی ہوں گی۔

✉: کراچی سے ہماری لاڈلی بہن عقیلہ حق کی محفل میں آمد ہے، لکھتی ہیں بہت اچھے بھائی کاشی چوہان خوش رہو، اُمید کرتی ہوں خیریت سے ہوگے۔ تم کو خیریت سے ہونا چاہیے کیونکہ تمہاری خیریت از حد ضروری ہے۔ اگر تم خیریت سے نہ ہوئے تو یا اللہ میری قسط کون پڑھے گا۔ کون وقت پر رسالہ نکالے گا...... کون؟...... کون؟ اُف خدا! تو میرے بھائی تم خیریت سے رہو۔ اس دفعہ رسالہ حسب روایت، حسب عادت، حسب منشا ساری دنیا میں تقسیم ہونے کے بعد مجھ کو ملا۔ جب ملا تو پڑھا اور پڑھا تو تبصرہ حاضر ہے، اداریہ زبردست تھا۔ زادِراہ ہمیشہ کی طرح زادِراہ ہی رہا۔ دوشیزہ کی محفل، مجھ دوشیزہ کو بہت ہی پسند ہے۔ میرا بھانجا بہت بیمار ہے۔ اُس کے لیے صحت کی دعا کی درخواست کرتی ہوں۔ شمع حفیظ صاحبہ خوش رہیے۔ آپ کی دی ہوئی گارنٹی نے مجھ ناتواں سی رائٹر کا حوصلہ بلند کیا۔ اللہ آپ کا اقبال حبیب بینک سے زیادہ بلند کرے۔ میں اُن تمام لوگوں کی شکرگزار ہوں جن کو میرا مکمل ناول 'محبت رائیگاں میری' پسند آیا اور جو اپنی قیمتی رائے سے 'آئینہ، عکس اور سمندر' کو تحریر کرنے میں میری مدد کررہے ہیں۔ سُنبل اور میرے دوسرے تمام دوست جنہوں نے ساحل صاحب کی بات پر میرا اخلاقی ساتھ دیا اُن کی شکرگزار ہوں اور میرے بہت اچھے سے بھائی ساحل صاحب میں آپ سے نہ ناراض ہوں اور نہ

بدگمان، لیکن یقین کریں میں نے واقعی مطالعہ بڑھا دیا ہے۔ سنبل آپ کی کتابیں ضرور آپ تک پہنچ جائیں گی۔ آپ کی محبتوں کی میں مقروض ہوں اور بھائی احمد سجاد بابر ایک بات کہوں۔ آپ کا تبصرہ میرے لیے باعثِ خوشی ہوتا ہے۔ آپ ایک بہت اچھے رائٹر اور انسان ہیں جب آپ میری کسی تحریر پر تبصرہ کرتے ہیں تو یقین کریں میرا ڈھیروں خون بڑھ جاتا ہے۔ آپ کی ہر تحریر بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ دوشیزہ میں چھپنے والی ہر تحریر ہی شاندار ہوتی ہے اور آپ کا کیا کہنا خوش رہیے۔ لائن براڈ کاسٹ کلب ایک انٹرنیشنل کلب ہے میں کراچی میں رہنے والے اپنے رائٹرز ساتھیوں کو کلب کی ممبر شپ کی آفر کرتی ہوں اس سلسلے میں اگر مجھ سے بات کرنا چاہیں تو پلیز مجھے ای میل کریں۔ aqeelahaqq@yahoo.com اب آتے ہیں رسالے کی طرف۔ رسالہ بہت زبردست جا رہا ہے۔ بالکل عمران خان کے دھرنے کی طرح، روز، روز نکھرتا جا رہا ہے بالکل میری اب کیا ہر بات لکھوں...... رفعت سراج صاحبہ کو ایوارڈ مبارک ہو۔ فہیم برنی کی باتیں اچھی لگیں۔ دردانہ نوشین تو غضب کا لکھتی ہیں۔ نسیم سحر کی تحریر ایک اچھی کوشش تھی۔ مینا تاج نے بہت درست لکھا۔ فصیحہ آپ ایک اچھی رائٹر ہیں اور یہ بات آپ کی تحریر زور زور سے کہہ رہی ہے۔ میں لکھنے کے لیے وقت کیسے نکالتی ہوں اگر سارے دن کی مصروفیات آپ کو بتاؤں تو آپ کے آنسو نکل آئیں گے اور اتنی پیاری فصیحہ کو روتا ہوا میں نہیں دیکھ سکتی۔ نعمان اسحٰق آپ کے ناولٹ کو پڑھا۔ بار بار پڑھا، لیکن باقی آئندہ نے دل توڑ دیا، خوبصورت تحریر رہی۔ اُمید ہے اگلے ماہ دوسرا حصہ اور شاندار ہوگا۔ نوشین نے بھی اچھا لکھا۔ غرض یہ کہ ہر تحریر جو میں نے ابھی تک پڑھی وہ زبردست رہی اور مجھے یقین ہے کہ باقی تحریریں بھی شاندار ہوں گی لیکن اگر میں ساری تحریریں پڑھ کر تبصرہ لکھتی تو Late ہو جاتی۔ دراصل آج کل بہت مصروفیات بھی چل رہی ہیں نا۔ لیکن...... ہاں لیکن...... میں یہ کہوں گی اور بار بار کہوں گی کہ رسالہ زبردست جا رہا ہے محترم ایڈیٹر کی محنت ہر سطر میں نظر آتی ہے۔ اللہ رسالے کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے۔ رخسانہ آنٹی کو محبت، سلام اور منزہ سے کہنا ہے۔

کبھی ہم بھی تم سے تھے آشنا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ھ: عقیلہ جی! آپ کے محنت نامے پر میں بھی سچ مچ مسرور ہوں۔ خوش رہیے۔ خدا کرے زورِ...... قلم اور زیادہ......

✉: کراچی سے ہماری بہت منفرد لکھاری ساتھی ناہید فاطمہ حسنین کی آمد ہے، لکھتی ہیں، چھوٹے بھائی کاشی سلامت رہو۔ اکتوبر کے شمارے میں سجی سُنیتا مارشل بہت فریش نظر آئی۔ 'الٹراوائلٹ شعاعیں' کے عنوان سے لکھا گیا اداریہ زبردست تھا۔ کہنے کو تو سب یہی بات کہہ رہے ہیں لیکن تم نے جداگانہ طور اختیار کیا۔ زبردست۔ محفل کی وساطت سے میں شمع حفیظ، سُنبل، فصیحہ آصف، فرح عالم اور اپنی دوسری بہنوں کی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے تبصرے کو پسند کیا۔ علی رضا عمرانی اور خرم مشیر کا صفحہ میں کبھی مس نہیں کرتی۔ علی رضا بہت بے باک اور دو ٹوک رائے دیتے ہیں جو بے حد پسند آتی ہے اور یہی بات اُس کے حوالے سے دوشیزہ کو منفرد بناتی ہے ورنہ جو میگزین اٹھالو سب اچھا کی گردان لگائے ہوئے ہیں۔ دلشاد کی دل کی باتیں بہت اچھا بہت زبردست سلسلہ، دلشاد کوئی کہانی بھی لکھو۔ فہیم برنی سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ فرزانہ کی کہانی تم بھی ہو زبردست رہی۔ رحمٰن رحیم سدا سائیں کو آج مکمل ابتداء سے پڑھا کہانی نے اتنا خاص متاثر نہ کیا ایک بالکل عجیب بات اسامہ نے

پراسرار کہانی نمبر 3

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 اور پراسرار نمبر 2 کے بعد پراسرار نمبر 3

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کر دیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرالیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ دسمبر کا شمارہ، پراسرار نمبر 3 ہوگا۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

جب اپنی ٹانگیں گنوائی تھیں تب ان کی کاملیت پسندی کہاں جاسوئی تھی؟ جو وہ اپنے بیٹے کے حوالے سے اتنی منفی سوچ رکھتے ہیں۔ پھر یہ بات بہت عجیب بھی لگ رہی ہے کہ کوئی باپ اولاد سے نفرت رکھ سکتا ہے۔ چلیں مان لیا لیکن آنے والے بچے کو ایسی خدشے کے پیش نظر ضائع کرنا، یہ چیزیں کہانی کو مضبوط نہیں بننے دے رہیں۔ میٹرو بس، وردانہ بہت ڈوب کر لکھتی ہیں کہانی کو اپنی پوری جزئیات کے ساتھ۔ **End** دکھی کر گیا۔ مگر یہ سب زندگی کے سلگتے حقائق ہیں مینا تاج کا افسانہ واہ...... وا...... مینا تاج لکھیں اور کم درجے کا ہو؟ ناممکن مینا اپنا ایک الگ انداز رکھتی ہیں۔ ٹیڑھی تحریر پسند آیا مگر کہانی میں ایسی کوئی نئی بات نہ تھی...... ہاں البتہ **End** نے اُس کے بھی دکھی کیا۔ کیا تھا ہم صاحب پہلے ہی شوگر چیک کر لیتے (ہاہاہا) آگہی کا پل گوارا کہانی تھی۔ اس بار عقیلہ سے معذرت میں قسط وار کہانیاں اکٹھی پڑھتی ہوں۔ انشاء اللہ اگلے ماہ...... زین العابدین کے جواب باقاعدہ ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ زین العابدین کے جوابات انگوٹھی میں نگینے کے مترادف ہوتے ہیں۔ ماشاء اللہ آخر وہ ہیں کس ماں کے بیٹے جو ہر میدان میں جھنڈے گاڑنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ منزہ جی مجھے آپ سے ایک شکایت ہے۔ آپ نے ڈائری لکھنا کیوں چھوڑ دی؟ اس کی وجہ سے کم از کم ہم آپ کو اپنے درمیان تو پاتے تھے۔ اب ہمیں آپ کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ آپ نے سارہ احمد کو بھی خدا جانے کہاں سلا دیا ہے۔ کالم لکھنے کا یہ مطلب کہاں سے آ گیا کہ سارہ کے ہاتھ سے قلم لے لیا جائے؟ اگر آپ میری آواز سن رہی ہیں تو جلدی سے واپس آ جائیں۔ کاشی تم نے دوشیزہ کے ساتھ ساتھ سچی کہانیاں کو بھی بہ طریق احسن سنبھالا اور سنوارا ہوا ہے۔ جس کے لیے تم واقعی داد و تحسین کے مستحق ہو۔ خدا تمہیں ہمت و سلامتی سے رکھے۔ میں اپنی ایک نظم بھیج رہی ہوں اُمید ہے پسند آئے گی۔ تمام لکھاری اور تبصرہ نگار بہنوں اور ساتھیوں کو سلام و سلامتی کی دعا کے ساتھ اجازت۔

ھ: پیاری ناہید جی! کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ تبصرہ پا کر بہت اچھا لگا۔ ارے ناہید جی آپ کو جب کال کی جاتی ہے تو آپ **PICK** کیوں نہیں کرتیں؟ یہ منزہ سہام صاحبہ کا گلہ ہے آپ سے۔

✉: کراچی سے ایک طویل عرصے بعد ہماری ریگولر قاری اور شاعرہ ثمینہ عرفان صاحبہ کی محفل میں آمد ہے۔ عرض کرتی ہیں، شاید نہیں یقیناً میری حیثیت آپ کی ڈائجسٹ میں 'آٹے میں نمک' کے برابر ہے۔ ہائی بلڈ پریشر کے مریضوں کو بہت زیادہ نمک کے استعمال کو منع کیا جاتا ہے۔ میرے لکھنے کا یہ مقصد نہیں کہ میری حیثیت آپ کے رسالے میں نمک کی طرح ہے جس کے بغیر ڈائجسٹ پھیکا ہے۔ بقول شاعر

محبتیں بھی تھیں، لیکن شکایتیں بھی بہت
سمجھتا کاش وہ ہم کو ملال اتنا تھا

مجھ سمیت بہت سے 'مستقل' لکھنے والے اگر کچھ عرصہ آپ کی محفل میں شریک نہ ہوں، تو بذریعہ دو عدد چھوٹی سی لائن اُن کا احوال پوچھ لیجیے۔ خیر جناب وہی معاملہ ہے 'آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل۔ میری طویل غیر حاضری کا مختصراً احوال یہ ہے 26 جون کو میرے شوہر خالد رشید صاحب کو برین اسٹروک ہوا، اللہ کا شکر ہے اب بہت بہتر ہیں۔ شوہر صاحب کی اچانک بیماری، پھر رمضان المبارک کی آمد، شادیوں کے جوڑوں کے آرڈر، بھانجے کی شادی اور پھر میری آنکھ کا آپریشن وغیرہ وغیرہ۔ دوشیزہ ڈائجسٹ کچھ مہینوں سے بہت دیر سے ملنے لگا ہے، ایک وجہ بروقت خط نہ لکھنے کی یہ بھی ہے۔ محترم کاشی چوہان صاحب یہ 'الٹرا وائلٹ شعاعیں' تعصب کی ہی

نہیں ہیں بلکہ یہ شعبہ میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو ملنے والی مادر پدر 'آزادی' کی بھی ہیں۔ جس کا دونوں شعبوں نے غلط استعمال کیا ہوا ہے چونکہ ہمارے ملک میں قانون کی بالادستی اور پاسداری نہیں ہے۔ اس لیے سب کچھ چل رہا ہے۔ دردانہ نوشین کا مسٹر ڈبس، مینا تاج کا افسانہ کمہار، منیبہ چوہدری کا ٹیڑھی تحریر بہت پسند آئے۔ واجدہ تبسم کی تحریر کی تو بات ہی الگ ہے۔ اِک تیرے جانے کے بعد اتنے افسانوی عنوان کے ساتھ سر سے گزر گیا۔ آنکھ ابھی مکمل طور پر صحیح نہیں ہے اس لیے ناولٹ ابھی نہیں پڑھے۔ البتہ ڈاکٹر خرم مشیر کا کالم بالوں کی تصاویر کی وجہ سے سمجھ میں آیا کہ کچھ بالوں کے موضوع پر ہے تو پڑھ لیا کیونکہ آج کل ہم بھی بالوں کے مسائل میں مبتلا ہیں۔ معذرت، معذرت کچن کارنر میں گوشت کے پیزا کی وضاحت کر دیجیے۔ پیزا کی روٹی یا ڈو تیار ہونے پر چکن 'بیف یا سبزیوں کی گارنیشنگ تو کی ہی جاتی ہے۔ ہم سمجھے تھے روٹی یا ڈو گوشت کی بنائی ہے اس لیے اس کا نام 'گوشت کا پیزا' رکھا ہے۔

✉ ثمینہ عرفان صاحبہ! ویلکم بیک، آپ کا تبصرہ مکمل طور پر ناراضگی سے بھرا لگتا ہے۔ ہماری وہ ثمینہ عرفان کہاں ہیں، جن کی محبت کی ہم مثالیں دیا کرتے تھے؟ اُمید ہے اگلے ماہ سے محفل میں آپ کی آمد باقاعدہ ہوگی۔

✉ سائرہ وقار کی کراچی سے اولین آمد ہے۔ لکھتی ہیں، میں پہلی بار آپ کی محفل میں مخاطب ہو رہی

ہوں۔ اُمید ہے کہ میرے خط کو شائع کیا جائے گا۔ دوشیزہ ڈائجسٹ زیرِ مطالعہ تو رہا۔ میری امی مطالعے کی شائق ہیں اور اُن کے ساتھ ساتھ یہ شوق مجھ تک بھی منتقل ہوا۔ منزہ آپی کی تحریر کا تو جواب ہی نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کے لکھنے کا انداز اور مطالعہ لاجواب ہے۔ شمارے میں منورہ نوری خلیق کی تحریر، انسانی زندگی کو آسان، باعمل اور ایمان افروز بنانے کی روشن مثال ہے۔ بہت خوبصورت لکھتی ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ، دلشاد نسیم کے دل کی باتیں دل کو چھو لینے والی تھیں۔ بینا عالیہ کے ناول کی قسط تیرے عشق نچایا زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتی ہوئی اچھی تحریر۔ دردانہ نوشین خان کی تحریر میٹرو بس، آج کے ترقی یافتہ معاشرے میں جہالت کی جھلک، نسیم سحر کی تحریر اماں کا بکرا، قربانی ایثار اور محبت کے جذبے سے پُرخوبصورت افسانہ، بینا تاج کا افسانہ کمہار ہمارے دیمک زدہ معاشرے کے دوغلے پن کا اور عورتوں کے حقوق کے نام پر عورت کا مذاق اڑانے والوں کو آئینہ دکھانے کی کوشش اچھی رہی۔ اُم مریم کے خوبصورت ناول کی قسط، مصنفہ کی مضبوط گرفت کی نشاندہی کرتی ہے۔ نعمان اسحٰق کی میرے پرندۂ دل واقعی زندگی کی اونچ نیچ کو عیاں کرتی ہوئی تحریر ہے۔ فرزانہ آغا کیا خوب لکھتی ہیں۔ ہر ہر جملہ دل کو چھو کر گزر گیا۔ واقعی پاکستان کا ہر معاملہ، پاکستانیوں کے نہیں اللہ کے سپرد کر دینا چاہیے۔ کہانی تم بھی ہو شاندار تحریر، صندوقچی واجدہ تبسم کی تحریر ایک خوبصورت انتخاب۔ تمام ہی لکھنے والے خوب لکھتے ہیں۔ ٹیڑھی تحریر، آگہی کا پل، تم میرے ہو، چاہت و پیار کے جذبوں کی بڑی مہارت سے عکاسی کی گئی۔ اس تمام کے ساتھ ساتھ کچن کارنر، بیوٹی گائیڈ، نفسیاتی اُلجھنیں، خالص دوشیزاؤں کے مطالعے کے صفحات ہیں اس خوبصورت پرچے پر آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ دعاؤں کے ساتھ۔

ھ: سب سے پہلے تو سائرہ! خوش آمدید، بھئی سچ میں امی کے مطالعے کا حق آپ نے خوب ادا کیا۔ خوش رہیں اور اب آپ بھی ہماری دوشیزہ فیملی کا حصہ بن گئی ہیں۔

✉: یاسمین اقبال سنگھ پورہ لاہور سے شاملِ محفل ہیں۔ لکھتی ہیں، میری ڈھیروں دعائیں آپ سب کے لیے، سب سے پہلے تو میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے حسبِ وعدہ اکتوبر کے شمارے میں میری نظم شائع کی۔ بہت خوشی ہوئی۔ ایسا لگا جیسے برسوں بعد کوئی اپنے گھر لوٹا ہو اور گھر والوں نے بھرپور طریقے سے خوش آمدید کہا ہو۔ اپنی مزید نظمیں ارسال کر رہی ہوں اُمید کرتی ہوں ضرور نظرِ کرم فرمائیں گے۔ اِس ماہ کا پرچہ بہت دیر سے موصول ہوا اور کچھ خرابیٔ طبیعت کے باعث ابھی پورا پڑھ نہ سکے اس لیے تبصرہ سے معذرت۔

ھ: یاسمین جی! محفل میں آمد کا مقصد صرف تبصرہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے پتا چلتا ہے کہ آپ ہمارے لیے ہماری دوشیزہ فیملی کا حصہ بھی ہیں۔

ایس ایم ایس کے ذریعے محفل کا حصہ بننے والے قارئین

جواد حسنین جتوئی، سانگھڑ۔ ثناء عروج، کوہاٹ۔ زیب ملک، گھوٹکی۔ فیصل ندیم بھٹی، فیصل آباد۔ مقصود بلوچ، حیدرآباد۔ شاہدہ سعید، گوجرانوالہ۔ یاسمین عمران، کوپرا، سیالکوٹ۔ رقیہ یوسف، ڈسکہ۔ فرح شاہ، لاہور۔ ثمینہ، دادو۔ عینی خان، ساکرو، سندھ۔ سلمان عمرانی، سجاول۔ احسان عمرانی، سجاول۔

ساتھیو! اس ماہ تک کی محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔ ماہِ نومبر کا پرچہ آپ کو کیسا لگا، اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر پھر ملاقات ہوگی۔ اگر خدا لایا۔

آپ کا ساتھی کاشی چوہان

دل کی باتیں

دلشاد نسیم

قانون

قارئین دوشیزہ کے لیے خوبصورت سوغات

پاکستان میں جنگل کا قانون ہے اور راج کرنے والوں کے منہ کو انسانی خون لگا ہوا ہے اور وہ چاہے انگوارہ پر بہتا ہوا یا اسلام آباد کی سڑکوں پر رُلتا ہو۔

پاکستان کے وزیر قانون نے ابھی ابھی ایک بیان جاری کیا ہے۔ معزول جج ایک ہفتے کے اندر حلف اٹھالیں، ورنہ ایک ہفتے کے بعد اُن سب کی کتاب بند کردی جائے، اور حلف نہ لینے والے ججوں کو ریٹائرڈ کردیا جائے گا۔ اب رہی بات چیف جسٹس افتخار علی چوہدری کی تو وہ ایک جج کی حیثیت سے حلف اٹھا سکتے ہیں اور اس بات کا فیصلہ کہ وہ جسٹس کے چیف ہیں کہ نہیں وہ بعد میں کیا جائے گا۔

سوچ میں ہوں کہ ابھی تک جو ججوں کو تنخواہیں دی جارہی ہیں، وہ کیا تھیں اور کن عہدوں کی دی جارہی تھیں۔ اور کل جو وکلاء پر جمہوری دور کی پہلی لاٹھی پڑی وہ کیا تھی اور بغیر کسی وجہ کے کیوں اٹھائی گئی تھی۔

آج کی اس خبر نے دل ہلا کر رکھ دیا ہے کہ وکلاء کی تحریک جو تین نومبر دو ہزار سات سے شروع ہوئی تھی اور اُسے اپنی طرف سے منطقی انجام دینے کے لیے قانون کے وزیر کو صرف ایک ہفتہ لگا یا شاید وزیر قانون کو اتنی سی بات کہنے میں چالیس ہفتے لگ گئے۔

بس جو بھی ہورہا ہے، دل کو صحیح نہیں لگ رہا۔ یقین نہیں ہوتا کہ قانون اپنے ہی آئین کی توہین کرسکتا ہے۔ قانون کے رکھوالے انصاف کے نام پر اپنے ہی لوگوں پر ڈنڈے برسا سکتے ہیں انہی پر قانون کی دفعہ لگا کر بچ کے جرم میں سزا کے طور پر ہمیشہ کے لیے انہیں معزول بھی کرسکتے ہیں۔ لیکن ایسا ہوا ہے۔ ابھی ابھی...... وطن پاکستان کے قانون نے ثابت کیا ہے کہ وہ اندھا بھی ہے اور بہرہ بھی ہے اور یہ بھی کہ پاکستان میں جنگل کا قانون ہے اور راج کرنے والوں کے منہ کو انسانی خون لگا ہوا ہے۔ وہ چاہے انگوارہ پر بیٹھا ہوا یا اسلام آباد کی سڑکوں گلیوں میں رُلتا ہو......

اس تاریک شب کا نوحہ اس سے زیادہ نہیں لکھ پاؤں گی۔ چلتے چلتے اپنے بابا (جناب صفدر ہمدانی) کی ایک غزل آپ سب کی نذر کرتی چلوں۔ جو مجھے اس وقت بہت یاد آرہی ہے جو انہوں نے اپنی کشفی انداز میں بہت پہلے لکھی تھی۔ پتا نہیں انہیں ان سب باتوں کا بہت پہلے سے کیسے پتا چل جاتا ہے......؟؟ مجھے یہ سب لکھتے ہوئے ان کی انتہائی سنجیدہ اور گہری آنکھیں بھی یاد آرہی ہیں جن میں وہی آزردگی رہتی ہے جو سولہ کروڑ پاکستانیوں کے دلوں میں بستی ہے۔ شاید سچائیوں کی یہی سزا مقرر ہوئی ہے۔

سنگ باری کا مزا آئے گا تب
اپنے ہی ہاتھوں میں پتھر ہوں گے جب
کون جانے گا کب یہ طوفان پھٹ پڑے
یہ فضا بوجھل نہیں ہے بے سبب
منتظر اب اپنے اپنے وقت کے
کیا خبر کس کا سفر لکھا ہے کب
خواہشیں اندھے جزیرے کی طرح

جس میں نہ دن ہے نہ کچھ امکانِ شب
تشنگی کا لطف ہم سے پوچھیے
ہم سمندر میں رہے ہیں تشنہ لب
جز ندامت کچھ خزانے میں نہیں
کیا کریں دربار شاہی سے طلب
حادثہ یہ بھی عجب صفدر ہوا
سچ پہ جاری ہوگئی حدِ ادب

☆☆......☆☆......☆☆

بات جب بابا کی ہورہی ہے تو مجھے اپنی ایک نظم 'میکے کی گھڑیاں' یاد آرہی ہے۔ آپ سب کی نذر ایک بار پھر یہ نظم پیش کررہی ہوں۔

میکے کی گھڑیاں

ذرا کچھ دیر تو......اور رُکو۔
ذرا ٹھہرو!
مجھے اپنی یادوں سے نبٹ لینے دو
کئی دنوں سے اُداس ساکت اور بہت رنجیدہ
دیوار و در سے لگے، سہمے لمحوں سے لپٹ لینے دو
ساعتیں یہاں بکھری ہیں پھول جیسی
ذرا ان کی خوشبو سمٹ لینے دو
مرا آنچل مجھ سے کہہ رہا ہے
ایک جگنو......اور جھپٹ لینے دو
اور یہ جو کھڑکی کھلی ہے آج دریچے کی
یہ جو چاندنی میں نہائے سبز پتوں کی جھرمٹوں میں
جھانکتا پھرتا ہے نٹ کھٹ سا چاند
بادل سے اِس کی آنکھ مچولی
مرے کتنے خواب چرائی تھی
کروٹ کروٹ رات گزرتی
نیند کہاں پھر آتی تھی
اس نٹ کھٹ سے آج مجھے لڑنا ہے......لڑ لینے دو
میری نظمیں، میری غزلیں اور مرے افسانے
کچھ ادھورے، کچھ مکمل......جھوٹے سچے تانے بانے
کچھ کانچ کی ٹوٹی چوڑیاں......بے فکرے اونچے قہقہے
بے ربط سی گفتگو......ڈائری میں لکھے احوال بھی
مرے بستر کے تکیے پر دھرے تھے کتنے خواب بھی
اک اک کر کے چنتا ہے......چُن لینے دو
پھر خالی گھر میں تو بین کی
یہ چوڑیاں......انہیں کھنک لینے دو
مرے سب رازوں سے واقف ہیں جو
ان سکھیوں سے مل کر مجھے رونا ہے......رو لینے دو
بس کچھ پل اور
ان دلدار لمحوں میں جی لینے دو

☆☆......☆☆

مِنی اسکرین

مِنی اسکرین پر پیش کیے جانے والے مقبولِ عام ڈراموں پر بے لاگ تبصرہ

علی رضا عمرانی

اِس وقت پاکستان میں تقریباً بیسیوں چینل عوام کی دسترس میں ہیں۔ اِس الیکٹرانک خوشحالی میں جہاں عوام کے پاس معیاری ڈرامادیکھنے کا کال نہیں، وہیں ڈراموں کی بہتات نے بہتر سے بہترین، معیاراورکوالٹی کے لیے چوائس آسان کردی ہے۔ مِنی اسکرین میں ہم مقبولِ عام ڈراموں پر بے لاگ تبصرہ شائع کریں گے۔

'اگر تم نہ ہوتے'

ہم ٹی وی کا ڈرامہ سیریل 'اگر تم نہ ہوتے' اِس وقت خواتین میں بہت مقبول ہے۔ خواتین کے چھوٹے بڑے گھریلو مسائل پر مبنی اس ڈرامہ سیریل کو تحریر کیا ہے غزالہ عزیز نے۔ اس کی ڈائریکشن معروف ڈائریکٹر قاضی لطیف نے دی ہے۔ پیش کش مومنہ دُرکی ہے۔ یہ ڈرامہ ہم ٹی وی پر پیر سے جمعرات شام سات بجے ٹیلی کاسٹ کیا جارہا ہے۔ ڈرامہ کی کاسٹ میں معروف آرٹسٹ حسن احمد، سنعیہ شمشاد، عروسہ قریشی، نعیمہ گرج اور دیگر آرٹسٹ شامل ہیں۔ یہ ڈرامہ تیزی سے مقبولیت حاصل کررہا ہے۔ ڈرامہ سیریل 'اگر تم نہ ہوتے' کی کہانی ایک غریب مگر سلجھی ہوئی لڑکی ثانیہ کی زندگی کے گرد گھوم رہی ہے۔ جو کالج لائف میں ساتھ پڑھنے والے لڑکے کو پسند کرتی تھی مگر اُس کے غریب والدین نے اپنی غربت اور بیماری کو دیکھتے ہوئے ثانیہ کا رشتہ ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں کردیا تاکہ اُن کی بیٹی ایک خوشحال اور آسودہ زندگی گزار سکے جبکہ ثانیہ کا شوہر اشعر حسین پہلے سے ایک بچے کا باپ بھی ہے۔ اُس کی بیوی کی ڈیتھ ہوچکی ہے۔ لیکن وہ ایک پڑھا لکھا سلجھا ہوا محبت کرنے والا انسان ہے۔ اس لیے ثانیہ ماں باپ کی عزت کی خاطر اُن کی خوشی کے لیے اُن کے طے کیے ہوئے رشتے پر حامی بھر کے شادی کرلیتی ہے۔ شادی کے بعد اُس لڑکے کو بھولنے کی پوری کوشش کرتی ہے تاکہ اشعر کے ساتھ ایک ایماندارانہ زندگی گزار سکے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوتی، اُس کے شوہر اشعر اور سسرال والوں کو پتا چل جاتا ہے کہ وہ شادی سے پہلے کسی لڑکے کو پسند کرتی تھی۔ اس کے بعد سسرال

میں ثانیہ کی آزمائش شروع ہوجاتی ہے۔ شوہر کے سامنے اعتبار کا بھرم ٹوٹتا ہے تو سسرال والوں کی ناپسندیدگی اور لعن طعن بھی شروع ہوجاتی ہے۔ اس سارے مسائل ومصائب سے ثانیہ کس طرح نبرد آزما ہوتی ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے ہم ٹی وی کا کامیاب ڈرامہ 'اگر تم نہ ہوتے' دیکھنا ہوگا۔

خدا نہ کرے

اس ڈرامے کا پلاٹ باپ اور بیٹی کے درمیاں ذہنی ناہمواری پر مبنی ہے۔ جس میں بیٹی زندگی کو اپنے طرز پر گزارنا چاہتی ہے اور باپ اس پر اپنی مرضی مسلط کرنے کا خواہشمند ہے۔ یہ وہ باپ ہوتا ہے جس نے اپنی بیوی کے مرنے کے بعد بیٹیوں کے لیے زندگی تج دی ہوتی ہے۔ بیٹی اپنی زندگی کے اہم فیصلے باپ کی مرضی کے برخلاف کرتی ہے، یہی بات آگے جاکر چپقلش کا باعث بن جاتی ہے۔ جس کو کیسے درست کیا گیا، اس کے لیے پورا ڈرامہ دیکھنا ضروری ہے۔ ڈرامے میں دو بہنوں کا کردار بہت اہم دکھایا گیا ہے۔ جو ماں کے مرنے کے بعد ایک دوسرے کے بہت نزدیک ہوجاتی ہیں، ان کی مثالی محبت کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈرامہ خدا نہ کرے، ثمینہ اعجاز نے تحریر کیا۔ جب کہ اس کے ہدایت کار بدر محمود ہیں۔ اس کی کاسٹ میں سونیا حسین، جنید خان۔ زرنش، سلمان شاہد اور صلاح الدین تنیو وغیرہ شامل ہے۔ اے آر وائی ڈیجیٹل کا یہ کامیاب ڈرامہ ہر پیر کی شب نشر کیا جاتا ہے۔

شناخت

یہ ڈرامہ ہم ٹی وی کا ہے جسے مومنہ درید نے پیش کیا ہے۔ اہم کرداروں میں مایا علی اور نور سب پر سبقت لے گئے ہیں۔ ڈرامے میں مرکزی کردار ایسی لڑکی کا دکھایا ہے جو اسلامی افکار اور شرعی پردے کی حامی ہے، جبکہ اس کا تعلق ایک متمول گھرانے سے ہے، جہاں رہنے والے دیگر افراد اپنی سوچ کو ترقی پسندانہ سمجھتے ہیں، خواتین فیشن اور جدت کی دلدادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکی کے بدلتے رجحان، خاندان کا کوئی فرد بھی قبول نہیں کرتا۔ سب سے بڑا مسئلہ اسے اپنی شادی شدہ زندگی میں توازن قائم کرنا ہوتا ہے۔ نظریاتی کشمکش، مردوں سے اندازِ گفتگو، شوہر کو پیدا ہونے والی شکایات کا ازالہ۔ اس کے لیے ایک ساتھ بہت سارے سوال کھڑے کردیتا ہے۔ کیا وہ اپنے تشخص اور دین داری کو قائم رکھتے ہوئے، ازدواجی زندگی کامیابی سے گزار سکے گی۔ نئے اسلوب نبھانے پر اسے سزا کا مستحق تو نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ ان سب باتوں کا جواب تلاش کرنے کے لیے شناخت ڈرامہ دیکھنا ضروری ہے۔ ہم ٹی وی کا یہ ڈرامہ اس وقت سپرہٹ جارہا ہے۔

☆☆......☆☆

ہر دل عزیز ماڈل، اینکر اور اداکارہ

صنم جنگ

ذیشان فراز

☆: وہ نام جو شناخت کا باعث ہے؟

♥: صنم جنگ۔

☆: گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟

♥: صنو اور ابو صنی کہتے ہیں۔

☆: وہ مقام جہاں سے آشنا ہو کر آنکھ کھولی؟

♥: کراچی۔

☆: زندگی کس برج (star) کے زیر اثر ہے؟

♥: Libra۔

☆: علم کی کتنی دولت کمائی؟

♥: ایم بی اے مارکیٹنگ۔

☆: کتنے بھائی بہن ہیں۔ آپ کا نمبر؟

♥: ہم صرف چار بہنیں ہیں۔ میرا پہلا نمبر ہے۔

☆: برسر روزگار ہو کر پریکٹیکل لائف میں داخل ہو گئیں؟

♥: جی! کہہ سکتے ہیں۔

☆: شوبز میں متعارف کرانے کا سہرا کس کے سر ہے؟

♥: میں نے اپنی ایک دوست کے ذریعے آڈیشن دیا اور کامیابی اپنے ٹیلنٹ پر حاصل کی۔

☆: شوبز کی پہلی کمائی کیا تھی اور اس کا کیا کیا تھا؟

♥: یہی کوئی پندرہ ہزار کے قریب اور مجھے شاپنگ کا بہت شوق تھا۔ اس لیے شاپنگ ہی کی ہو گی میں نے۔

☆: کون سا پروگرام وجہ شہرت بنا؟

♥: میوزک میں 'نیوز پلے' اور سیریل 'دل مضطر'

☆: شوبز میں آمد کیسے ہوئی؟

♥: یہی کوئی ساڑھے پانچ سال قبل، جب بی بی اے فرسٹ ایئر میں تھی تو اِس فیلڈ میں آ گئی تھی۔

☆: موجودہ کیریئر (مقام) سے مطمئن ہیں؟

♥: بالکل نہیں! ابھی کیا ہی کیا ہے؟

☆: پروگرام کے لیے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہوتا ہے؟

♥: سو فیصد۔

☆: اس زندگی میں کون سا کام سب سے مشکل ہے؟

♥: غصے پر کنٹرول کرنا۔

☆: کوئی ایسی خواہش جو اب تک پوری نہ

ہوئی ہو؟

♥: سب کچھ بغیر خواہش کے، وقت سے پہلے مل گیا۔

☆: کون سی چیز کی کمی آپ آج محسوس کرتے ہیں؟

♥: کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ اللہ کا شکر ہے۔

☆: اپنی کون سی عادت بہت پسند ہے؟

♥: میرا خیال ہے، میری سب عادتیں بہت اچھی ہیں۔

☆: اپنی کون سی عادت سخت ناپسند ہے؟

♥: غصہ بہت جلدی آجاتا ہے۔

☆: زندگی میں کون سے رشتوں نے دُکھ دیے؟

♥: اب تک تو اللہ کا شکر ہے۔

☆: لباس جگ بھاتا پہنتی ہیں یا من بھاتا؟

♥: دونوں۔

☆: اردو والے ''سفر'' کا ذریعہ کیا ہے؟

♥: اپنی گاڑی ہے۔

☆: صبح کا آغاز کس طرح کرتی ہیں؟

♥: منہ دھوکر۔

☆: دن کا کون سا پہر اچھا لگتا ہے؟

♥: صبح کا وقت۔

☆: حساس ہیں یا......؟

♥: بہت حساس ہوں۔

☆: کون سے ایسے معاشرتی رویے ہیں جو آپ کے لیے دکھ اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں؟

♥: جب آپ کسی کے ساتھ بہت اچھا کرو اور وہ کوئی رسپانس نہ دے۔

☆: دولت، عزت، شہرت، محبت اور صحت اپنی ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔

♥: عزت، صحت، محبت، شہرت، دولت۔

☆: سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

♥: سمندر مجھے بہت پسند ہے۔

☆: خودستائشی کی کس حد تک قائل ہیں؟

♥: ایک حد تک تو ہونا چاہیے۔

☆: غصّے میں کیا کیفیت ہوتی ہے، خاموشی یا چیخ و پکار؟

♥: پہلے نظر انداز کرتی ہوں جب بات نہیں بنتی تو سنا دیتی ہوں کھری کھری۔

☆: لوگوں کی نظر میں آپ کی شخصیت کیسی ہے، اعلیٰ، اچھی، بس ٹھیک؟

♥: بہت اچھی...... ہاہاہاہا۔

☆: موت خوف کا باعث ہے؟ اور اس کے علاوہ ڈرنے کی کوئی وجہ؟

♥: موت سے نہیں ڈرتی۔

☆: فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین رکھتی ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟
♥: فراز نے حقیقت بیان کی ہے۔
☆: کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا فاسٹ فوڈ؟
♥: امی کے ہاتھ کا کھانا پسند ہے بس۔
☆: زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کی قائل ہیں یا تدبیر کی؟
♥: دونوں کی۔
☆: کون سے الفاظ عام بات چیت میں زیادہ استعمال کرتی ہیں؟
♥: کبھی غور نہیں کیا۔
☆: زندگی کا وہ کون سا پل تھا جس نے یکدم زندگی ہی تبدیل کر دی؟
♥: ایسا اب تک تو نہیں ہوا شاید شادی کے بعد ہو جائے، ہاہاہاہا۔
☆: ویک اینڈ کیسے گزارتی ہیں؟
♥: اپنی فیملی کے ساتھ۔
☆: لوگ آپ کی کس چیز کی زیادہ تعریف کرتے ہیں؟
♥: معصومیت کی، اداکاری کی۔
☆: شہرت، رحمت ہے یا زحمت؟
♥: دونوں۔
☆: کیا آپ اچھی رازداں ہیں؟
♥: بالکل۔
☆: اگر آپ میڈیا پر نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟
♥: بینکر ہوتی۔
☆: آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
♥: اللہ نے بہت اچھا بنایا ہے۔
☆: ”یہ زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا“ کس حد تک عمل کرتی ہیں؟
♥: جتنا ہو سکے۔

☆: اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ موسیقی روح کی غذا ہے؟ اگر ہے تو کیسی موسیقی؟
♥: بالکل، یہ تو اب زندگی کا حصہ ہے، بھئی۔
☆: کس دن کا سب سے زیادہ انتظار رہتا ہے؟
♥: جس دن ”چیک“ ملنا ہو۔
☆: خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟
♥: گفٹ دے کر۔
☆: پسندیدہ شخصیت؟
♥: مجھے میرے ابو بہت پسند ہیں۔
☆: اپنے ملک کی کوئی اچھی بات؟
♥: ہمارا ملک بہت اچھا ہے۔ ہمارا میڈیا اسے برا بناتا ہے۔
☆: کیا ہم آزاد ہیں؟
♥: الحمد للہ اور ہمیں آزادی کی قدر کرنا چاہیے۔
☆: شوبز کی کوئی بڑی برائی؟
♥: ہم اپنا کام کرتے ہیں۔ برائیاں ڈھونڈنے تھوڑی جاتے ہیں۔ فی الحال تو مجھے اس فیلڈ میں سب اچھے ہی لوگ ملے ہیں۔
☆: خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟
♥: بزدل ہوتا ہے۔
☆: آپ پاکستان میں کس تبدیلی کی خواہاں ہیں؟
♥: میں روڈ پر بھیک مانگنے والے اور محنت کرنے والے بچوں کے لیے اسکول بناؤں گی۔
☆: مطالعہ عادت ہے یا وقت گزاری؟
♥: عادت ہی سمجھیں۔
☆: کن چیزوں کے بغیر سفر ممکن نہیں؟
♥: گاڑی کی چابی، پرس اور موبائل۔
☆: حرف آخر کیا چاہنا چاہیں گی؟
♥: محبت کریں۔ محبت نفرت کو کھا جاتی ہے۔

☆☆......☆☆

تیرے عشق نچایا

عشق کی راہداریوں، طبقۂ اشرافیہ اور اپنی مٹی سے جڑے لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے وار ناول کی تیرہویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملک قاسم علی جہان آباد کے مالک تھے۔ ان کا شمار ضلع خوشاب کے جانے مانے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ تھے۔ عمار علی ریاست کے امور میں دلچسپی لیتے تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی چھوٹی بہن امل کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہائش پذیر تھے، ملک عمار علی کی شادی ان کی کزن ماہین سے ہوئی تھی۔ وہ اٹھارہ سالہ لڑکی خود سے عمر میں کئی سال بڑے ملک عمار علی کو ذہنی طور پر قبول نہ کرسکی تھی۔ وہ کانوینٹ سے پڑھی ہوئی اور خاصے آزاد خیالات رکھتی تھی، جو لائف بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ ام فروا ام زارا اور اسماعیل بخش مولوی ابراہیم کی اولادیں ہیں۔ ام فروا کی شادی بلال حمید سے ہوئی ہے جو میڈم فیری کے لیے کام کررہا ہے۔ میڈم فیری کا تعلق اس جگہ سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ بلال حمید اُم فروا کو پہلی بار میکے لے کر آیا تھا کہ میڈم فیری کی کال آگئی......

میڈم فیری نے بلال عرف بالو کو باور کرایا کہ جلد اُم فروا کو ان کے حوالے کردے۔ بلال حمید کے لیے یہ ناممکن سا ہوگیا تھا کیونکہ وہ اُم فروا سے واقعی محبت کرنے لگا تھا۔ ماہین اپنے دیور مصطفیٰ علی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ امل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اُس کی شادی اُس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہونے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن امل کے خیالات کسی اور طرف بھٹکنے لگے تھے۔

ماہین اپنے بچپن کے دوست کاشان احمد سے ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کاشان بچپن ہی سے اُس میں دلچسپی لیتا تھا مگر کبھی محبت کا اظہار نہ کر پایا۔ ماہین اپنے آئیڈیل کے اس طرح بچھڑ جانے پر دکھی ہے۔ کاشان احمد ملک سے باہر جانے سے پہلے ماہین سے محبت کا اظہار کردیتا ہے۔ ماہین ملک عمار علی سے ویسے ہی ناخوش ہے اس پر کاشان احمد کا اظہار محبت اُس کی زندگی میں ہلچل مچادیتا ہے۔

ماہین کے دل میں کاشان احمد کی محبت بھی جڑ پکڑ رہی ہے اور اب وہ عمار علی کی شدتوں سے مزید خائف ہونے لگی ہے۔ امل کی شادی اس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ محمد علی اُسے محبتوں کی بارش میں نہلا دیتا ہے اور یوں فوجی افسر کی بیوی بن کر وہ اپنی پہلی محبت کی یادوں سے پیچھا چھڑا لیتی ہے۔ ماہین اور عمار علی کے بیچ میں تکرار ہونے لگی ہے۔ میڈم فیری بلال کو اُم فروا پر کڑی نظر رکھنے کا کہتی ہے۔ ایک دن اچانک بلال کی ملک مصطفیٰ علی سے ملاقات ہوجاتی ہے اور......

(اب آگے پڑھیے)

ماہی تم دل سے اپنے شوہر کو چاہ کر تو دیکھو۔ وہ تمہاری محبت کا انتساب اپنے نام کر کے کس قدر مسرور ہو جائے گا۔ اس کا تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے۔''

''شان محبت بکاؤ چیز نہیں ہے۔ دل کی دوکان میں زبردستی کے سودے نہیں بکتے۔ یہ الوہی جذبہ ہے۔ کسی کے کہہ دینے یا زبردستی احساس دلانے سے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو خود بخود چٹانوں کو چیر کر اُس کے اندر سے بھی راستہ بنا لیتا ہے۔ شان تم سے مجھے لحاتی محبت ہوئی۔ ہم پہلے بھی تو بچپن کے دوست تھے۔ تب مجھے تم سے محبت نہ ہوئی۔ اگر تم چاہتے بھی تو مجھے تم سے پیار نہ ہوتا۔ یہ تو بس اک لمحہ تھا جو پلک جھپکنے کی دیر میں آیا اور گزر گیا۔ ایک الوہی احساس جس نے مجھے آگاہی کا احساس ہی نہ ہونے دیا۔ اور میرا دل تمہارے سامنے سجدہ ریز ہو گیا، تب میرے اندر کی کائنات میں ایک پاک، اَن چھوا، کسک آمیز محبت کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ اور میں اپنی مانگ کے آخری بال تک اس میں بھگو بیٹھی۔ کاشان میں لاکھ کوشش کر لوں تب بھی ملک عمار علی سے مجھے محبت نہیں ہوگی۔''

''ماہی اب میں تم سے اجازت چاہوں گا۔ میری ہمت جواب دے رہی ہے۔ اپنا بہت خیال رکھنا اور خوش رہنا۔ یہی تو زندگی کا چارم ہے۔ کھٹا میٹھا، ہاں ماما بتا رہی تھیں۔ تم اُن سے ملنے گئی تھیں۔ کبھی کبھی اُن کے پاس چلی جایا کرو۔ وہ تم سے مل کر خوش ہو جاتے ہیں۔ تب ماما پاپا کئی دنوں تک تمہاری باتیں کرتے رہے تھے۔''

''شان تم بے فکر ہو جاؤ میں اُن سے ملنے جاتی رہوں گی۔ خدا حافظ۔'' اچانک کمپیوٹر اسکرین سے وہ غائب ہو چکا تھا۔ اس نے تھکی تھکی آنکھیں بند کر لیں اور صوفے کی پشت سے سر ٹیک دیا۔

''ماہی۔'' دری اس کے قریب آ گئی۔

''ہو گئی شان سے بات۔''

''ہاں۔'' اس نے پل بھر کے لیے آنکھیں وا کیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''ریان کے مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔ آ جاؤ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔ دیکھو تو تم نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے۔ آنٹی کے کمرے میں جا کر بال درست کر لو۔'' دری نے اُس کی متورم آنکھوں کی طرف اُداسی سے دیکھا۔

''آپ لوگ اِدھر ہو بیٹا ڈرائنگ روم میں آ جاؤ۔'' ریان کی ممی ان دونوں کے قریب آ گئیں۔

''جی آنٹی آ رہے ہیں۔'' ماہین اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔

''بڑے سے ڈرائنگ روم میں خاصی گہما گہمی تھی۔ آرکسٹرا دھیمی سروں میں بج رہا تھا۔ نسوانی مسکراہٹیں چہار اطراف اپنا جادو بکھیر کر رہی تھیں۔ لڑکوں کے بھاری بھرکم قہقہے خواب ناک ماحول کی خوشبوؤں میں ڈوبی کشش میں اضافہ کر رہے تھے۔ شوخ رنگ مستی بھری، مشکباری، تیز ہو کر گم ہوتی سرگوشیاں، جوان سراپوں کی پُرتپش ٹھنڈک بھری سرسراہٹ، سبھی کچھ تو موجود تھا آج اس گیدرنگ میں۔ کاشان احمد سے بات کرنے کے بعد ماہین کے اندر اُداسیوں نے ڈیرے ڈال دیے تھے۔ وہ ہاتھ میں سوفٹ ڈرنک کا گلاس پکڑے اُداس دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی روشنیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ اس وقت وہ تنہا بیٹھی تھی۔ دری اور ہیبو اس کے پاس نہیں تھیں۔ اس کے خمیدہ تبسم لبوں پر ملک عمار علی کا نام تھرتھرایا۔ اُس نے زور سے جھرجھری لی۔ اس کے قسیبح عارضوں کی چمک جیسے اچانک کسی نے کھینچ لی تھی۔ عمار علی کے ساتھ کیے گئے سفر کی تھکن آنکھوں میں اترتی چلی گئی۔ گریہ وزاری کی کیفیت نے اَن دیکھا دھواں اس کی رگ رگ میں پھونک دیا تھا۔ دل پر گانٹھ سی پڑ گئی تھی۔ آخر وہ اس چار سالہ ازدواجی زندگی پر ہر پل نوحہ کناں کیوں رہتی تھی۔ ملک عمار علی کی شدت پسندانہ محبتوں

کی تھکاوٹ کا بوجھ اب اس سے اٹھائے نہیں اٹھ رہا تھا۔ اب کی بار وہ یہ بوجھ اُتار کر پھینک دینا چاہتی تھی۔ کاشان زندگی جن فیصلوں میں ہمیں جوڑ دیتی ہے، ہم اس کے سامنے دم نہیں مار سکتے، نہ ہی ہم ان سے دامن بچا سکتے ہیں۔ شان اگر خداوند ہمیں ازل سے ہی ایک دوجے کی تقدیر میں لکھ دیتا تب ہی ہم مل پاتے لیکن یہاں تو ایسا کوئی سین نہیں ہوا۔ ملنا بچھڑنا تو اوپر والے کے اختیار ہی میں ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وقت ہی ہمارے اختیار میں نہیں رہتا۔ یہ ملک عمار علی کی بھول ہے کبھی دولت سے محبت اور وفا ئیں خریدی گئی ہیں؟ میری روح و دل پر اس ملک عمار علی کی پرچھائیں تک نہیں پڑ سکتی۔ میری آنکھوں میں کبھی تمہارے اُس کا اشتیاق نہیں مچلے گا۔ ملک عمار علی کب تک تم مجھے اپنے ساتھ گھسیٹتے پھرو گے۔

اب ماہین ہر صورت عمار علی سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک چھت تلے رہنا اب اس کے لیے اذیت ناک بنتا جا رہا تھا۔ ایسا احمقانہ خیال اکثر اس کے اندر انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے اسے کئی لوگوں کے بارے میں ہزار مرتبہ سوچنا تھا۔ اتنے خوبصورت اور بے لوث رشتوں کو وہ صرف اپنے طمع کی بھینٹ چڑھنے پر مجبور کر دے گی؟ دوسرے لمحے وہ اس سوچ سے لرز جاتی۔ ان سب سے اس کے ڈبل ڈبل رشتے تھے، جو اس سے بے تحاشا محبت کرتے تھے۔ آج تک کبھی کسی کی طرف سے اسے شکایت نہ ہوئی تھی۔ سبھی نے اپنی وارفتہ محبتوں کے ہنڈولوں میں اسے جھلایا تھا۔ وہ اندر ہی اندر زچ ہو کر بل کھاتی۔ وہ سب دعوے جھٹلاتی۔ ''جب اُس شخص سے مجھے محبت ہی نہیں ہے تو پھر میں اُس کے ساتھ کیوں رہوں۔'' اس کے اندر ایک چیخ و پکار مچ جاتی جو اس کی کنپٹیوں پر ہتھوڑوں کی طرح برستیں۔

''ماہی تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' ماہین کو قدرے خاموش گوشے میں بیٹھے دیکھ کر ریان اُس کے پاس آ گیا۔ اُس کے خیالات کی طویل ہوتی ڈور درمیان میں سے کٹ گئی۔

''تم سب کو دیکھ کر میں یہاں بھی انجوائے کر رہی ہوں۔'' اس نے بات بنائی۔

''اٹھو تمہیں اپنے چند نئے دوستوں سے ملاؤں۔'' ریان اس کا ہاتھ کھینچتا ہوا بولا۔ تو وہ اُس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

بلال حمید ہر رات شش و پنج میں پڑ جاتا اُسے اُم فروا کے ساتھ بیڈ شیئر کرنا پڑتا۔ کوشش کرتا نیند میں بھی اپنے اور اُم فروا کے درمیان فاصلہ رکھے۔ اکثر وہ درمیان میں کشن رکھ لیتا۔ جب سے ملک مصطفیٰ علی سے اس کی بات ہوئی تھی اور انہوں نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ بلال حمید اُم فروا سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھنے لگا تھا۔ اب وہ اس کا ہاتھ بھی نہیں پکڑتا تھا۔ اُسے ایسا کرنا اب اچھا نہیں لگتا تھا۔

اُم فروا اُس کے یوں کنی کترانے سے حیران تھی۔ ہر بیوی کی طرح اُس کی بھی خواہش تھی اس کا شوہر اس سے اپنی محبت کا اظہار کرے، اسے اپنے قریب ترین رکھے۔ اُس کی تعریف کرے۔ اُن دونوں کے درمیان تو روزِ اول سے ہی اجنبیت کی دیوار حائل تھی۔ بلال حمید نے اسے کوئی بھی خصوصی لمحہ نہ سونپا تھا۔ جس کے خیال سے ہی ہر لڑکی کے دل میں اتھل پتھل برپا ہو جاتی ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پسینے سے بھیگ جاتے ہیں۔ جب وہ کلی سے پھول کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ شادی کی پہلی صبح جب اُم فروا فجر کی نماز کے لیے اٹھی تھی۔ تو اس نے کھڑکی کا تھوڑا سا پردہ کھسکا کر باہر دیکھا۔ نوید صبح کی ہلکی سی سپیدی آسمان کی وسعتوں پر تکی دکھائی دی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ ایستادہ درختوں پر رات بتائے پرندوں کو محسوس ہو گیا تھا صبح ہونے والی ہے۔ اُن کی خوشی بھری

چہچہاہٹ اس کی سماعتوں میں پڑ رہی تھی۔ اُن کی سریلی آوازوں میں ایک میٹھی سریلی تان موجزن تھی۔ جب وہ وضو کر کے جائے نماز پر کھڑی ہوئی تھی تو اس کے دل پر بھاری سل کی مانند بوجھ تھا۔ بار بار یہی خیال اُسے پریشان کر رہا تھا۔

''کیا میں انہیں پسند نہیں آئی؟'' تمام رات انہوں نے ٹی وی لاؤنج میں گزار دی۔ اسی خیال نے اُم فروا کو پورا دن بے چین کیے رکھا۔ میں نے اس نیک لڑکی کی زندگی کے ساتھ کیسا بھونڈا مذاق کیا۔ میں اس کا قصوروار ہوں۔ میرے خدا میرا اتنا بڑا گناہ معاف فرمادے۔ وہ تہجد کی نماز کے لیے اُٹھا تو فجر کی اذان ہونے تک سجدے میں گرا رب سے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگتا رہا۔ گڑگڑا کر اُم فروا کی عزت کی سلامتی کے لیے دعائیں کرتا رہا۔ جائے نماز اس کے ندامت کے آنسوؤں سے بھیگتی رہی۔ تب وہ شرمندگی سے سوچتا۔ رب سچ میں تو اس قابل ہی نہیں ہوں کہ میرا ناپاک وجود اس پاک جائے نماز کو چھوئے۔ جبھی وہ جائے نماز کو نرم ہاتھوں سے ملے کرتا اور اس پر بوسے دینے شروع کر دیتا۔

'مالک میں کیا تھا؟ کوئی ایسی برائی تھی جو مجھ میں نہیں تھی۔ میں نے ہر غلط کام کو مجبوری کا نام دے کر کیا۔ اس لڑکی نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا۔ گندے نالے کی کچی بستی میں خوبصورت چہرے کی تلاش میں گیا۔ زندگی میں پہلی بار وہاں کی مسجد میں مولوی ابراہیم کی امامت میں جمعہ کی نماز ادا کی جانے یہ مولوی ابراہیم کی پُر اثر شخصیت کا کمال تھا یا کوئی اور غیر مرئی طاقت تھی۔ جس نے مجھے نماز پڑھنے پر اکسایا۔ میں پابندی سے نماز پڑھنے لگا۔ ساتھ ساتھ میں فیری کی رہنمائی میں اپنے مشن پر بھی لگا رہا۔ میں نے اپنی اپنی ماں کی زندگی میں قرآن پاک اپنے گاؤں کی ماسی ماہتاباں سے پڑھ لیا تھا۔ جسے گاؤں والے بے بے جی کہتے تھے۔

بے بے جی اپنے بچپن میں پولیو کے حملے میں ایک ٹانگ سے محروم ہو چکی تھیں، جب وہ جوان ہوئیں تو اُن کی شادی نہ ہو سکی۔ وہ گاؤں کے بچوں کو قرآن پاک پڑھانے لگیں۔ اپنے احاطے کے اکلوتے کچے کوٹھے سے ملحقہ چھپر کے نیچے بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے بچوں کو قرآن پاک پڑھایا کرتیں۔ سب بچوں کے درمیان بلال حمید بھی سر پر سفید ٹوپی رکھے، ہل ہل کر اونچی آواز میں سبق یاد کرتا دکھائی دیتا۔ وہ سب سے پہلے سبق سنا دیتا اور نیا سبق لے لیتا تب بے بے جی اُسے جلدی چھٹی دے دیتیں۔

مولوی ابراہیم فجر کی نماز پڑھا کر چلے جاتے تو بلال حمید ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھا قرآن پاک پڑھتا رہتا۔ بچپن میں ایک بار اُس نے قرآن پاک بند کیا تھا۔ اب کئی سالوں بعد اُس نے دوبارہ کھولا تھا وہ اتنی روانی سے پڑھتا کہ آدھے گھنٹے میں ایک سپارہ پڑھ لیتا۔ اس کے اندر تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ اُسے تھکن کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ مولوی ابراہیم کی بلال حمید پر خاص مہربانی تھی۔ اس کے نوعمر چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی جو اُس نے یہاں آنے سے ایک مہینہ پہلے رکھی تھی تاکہ یہاں کے لوگوں پر اُس کا اچھا تاثر پڑے۔ اسے یہاں پر زیادہ دیر نہیں رُکنا تھا ایک دن اُسے اچانک اُم فروا نظر آ گئی تھی، تب اُس نے اپنا قیام بڑھا لیا۔

اُم فروا کچن سے ناشتے کے برتن دھو کر آئی تو بلال حمید کو گہری سوچوں میں گم دیکھا۔

''کیا بات ہے آپ اس قدر خاموش کیوں ہیں۔ ٹی وی بھی نہیں دیکھ رہے۔'' اُم فروا نے اپنی نرم ہتھیلی کا دباؤ بلال حمید کے شانے پر ڈالا۔ وہ جواباً مسکرایا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے کندھے پر رکھا اُم فروا کا ہاتھ آہستگی سے پیچھے کر دیا۔ اُم فروا کو یوں اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے گرانا محسوس ہوا۔ لیکن بلال حمید کی بھاری

آنکھیں دیکھ کر اس کا دھیان اُس طرف لگ گیا۔

''رات آپ کو ٹھیک نیند نہیں آئی؟ آپ کی آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' اُس نے مختصر جواب دیا حالانکہ وہ تمام رات جاگتا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں اُمِ فروا کی فکر کے علاوہ کوئی اور بات نہیں سماتی تھی۔ اچانک اُس کا موبائل بجا، اسکرین پر ملک مصطفیٰ علی کا نمبر تھا۔

''السلام وعلیکم! ملک صاحب۔'' وہ اٹھ کر باہر نہ گیا کہ اُمِ فروا کو بُرا نہ لگے اس کا باہر جانا۔

''کیسے ہو بلال۔''

''خیریت سے ہوں۔ آپ سنائیں۔''

''ہاں سنو آج دوپہر میں تمہارے گھر آ رہا ہوں۔ اور کھانا بھی تمہارے گھر کھاؤں گا۔'' وہ بے تکلفی سے گویا ہوئے۔ ''اور تم بھی اپنے میں ہمت پیدا کر واور اُم فروا کو فیس کرنے کے لیے خود کو تیار رکھو۔'' فون بند ہو چکا تھا اچانک سے بلال حمید کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ اُمِ فروا اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''کس کا فون تھا۔'' اُمِ فروا نے پوچھا۔

''اُس روز جو میرے دوست آئے تھے ملک مصطفیٰ علی، اُن ہی کا فون تھا۔ فیصل ٹاؤن میں انہیں کسی سے ملنے آنا ہے۔ کہہ رہے تھے واپسی پر تمہاری طرف بھی چکر لگاؤں گا۔ تب تک کھانے کا ٹائم ہو ہی جائے گا۔ کچھ بنا لینا۔''

''اچھا جی۔''

''اگر کچھ سامان منگوانا ہے تو میں مارکیٹ سے لے آتا ہوں۔''

''الحمدللہ گھر میں سب کچھ موجود ہے۔ کیا پکاؤں؟'' وہ بلال حمید کے نزدیک بیٹھی پوچھ رہی تھی۔ اس وقت سادہ کاٹن کے سوٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ میک اپ سے آزاد چہرہ تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ موٹی سیاہ آنکھیں اُس پر گھنیری مڑی ہوئی دراز پلکیں کمان کی طرح بھنویں، ستواں ناک کٹاؤ، گلابی ہونٹ جیسے آبِ زم زم سے چہرے کو غسل دے کر آئی ہو۔ بار بار پلکوں کا لرزنا وقفے وقفے سے ہونٹوں کا کپکپانا اُسے الگ سا بنا رہا تھا۔

''وہ سادہ کھانا شوق سے کھاتے ہیں۔'' بلال حمید نے کہا۔

''یخنی والا پلاؤ بنا لیتی ہوں۔ ساتھ کڑاہی ہو جائے گی۔ آلو کے کٹلس بنے پڑے ہیں فش کو بھی مسالا لگا کر رکھا ہوا ہے۔''

''واہ فروا یہ تو پوری دعوت ہو گئی۔'' اپنے اوپر گھٹن کی کائی اُتارنے کی کوشش میں وہ مسکرایا۔

''تم کھانا تیار کر لو وہ ایک گھنٹہ تک آ رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

بلال حمید چاہ رہا تھا کھانے وغیرہ کھانے کے بعد اُم فروا سے بات کی جائے۔ جب اتنا کچھ اپنے بارے میں سنے گی تو جانے اس کی کیا حالت ہو گی۔ بلال حمید یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔

اُم فروا کچن میں کھانا بنانے کے ساتھ ساتھ نعت پڑھ رہی تھی اور بلال حمید کی تمام تر توجہ اُس کی نعت پر تھی۔ اس کے گلے میں سب سے روانی کے ساتھ آواز نکل رہی تھی جیسے بہتی ندی کا شفاف پانی گزرتا ہے۔

جب ملک مصطفیٰ علی یہاں پہنچے تو کھانا تیار ہو چکا تھا۔ پلاؤ دم پر رکھا ہوا تھا۔ بلال حمید انہیں لاؤنج میں لے آیا تھا اور اُن کے لائے فروٹ اور کیک کے شاپر بلال حمید نے کچن میں رکھ دیے تھے۔

''بلال میں سامان تو کافی لانا چاہ رہا تھا پھر کچھ سوچ کر میں نے ارادہ بدل دیا۔''
''ملک صاحب آپ میرے لیے جو کر رہے ہیں کیا وہ کم ہے۔''
''بلال میں نے تمہیں اسی وقت دوست سمجھ لیا تھا جب تم نے مجھ پر اعتماد کیا۔'' بلال حمید کچن میں آیا تو اُمِ فروا اُسے دیکھ کر بولی۔
''سنیں جی آپ کے دوست نے اتنی تکلیف کیوں کی۔''
''یہ سب میں نے بھی انہیں کہا ہے۔ سنو اگر کھانا تیار ہے تو ٹرالی میں لگا دو۔''
''بس پانچ منٹ اور...... وہ پلیٹیں اور چمچ رکھتے ہوئے بولی۔ اُمِ فروا کی مسکراہٹ بلال حمید کے دل میں چھید کر گئی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ بلال حمید کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک پُر تپش آگ کا دریا تھا جسے اُس نے عبور کرنا تھا۔ اس تکلیف دہ انکشاف پر تو اس کے اوپر پہاڑ گر پڑے تھے۔ وہ فنا ہو جائے گی۔ میں کیسے سامنا کر پاؤں گا اس کا۔
''مالک مجھے ہمت دینا۔'' بلال حمید دل ہی دل میں اُمِ فروا کا سامنا کرنے کی خدا سے ہمت مانگ رہا تھا۔ بلال حمید کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔
''اُمِ فروا آ کر ملک صاحب کو سلام کر لو۔'' جب پہلے اُمِ فروا نے بلال حمید کے کہنے پر انہیں سلام کیا تھا تو وہ سانسیں روکے ٹکر ٹکر اُسے دیکھتے چلے گئے تھے۔ اس کے چہرے سے نگاہیں نہ ہٹا رہے تھے۔ جب تک وہ اُن کے سامنے کھڑی رہی تھی۔
''کیا سوچ رہی ہو؟''
''میں کھانا لا رہی ہوں ناں تو سلام بھی کر لوں گی۔''
بلال حمید جلدی سے کچن سے نکل گیا تھا۔ اب اُس میں سکت نہیں تھی اُمِ فروا کا سامنا کرنے کی۔ اُس کے پیر من من کے ہو رہے تھے جو زمین سے اُٹھ نہ پا رہے تھے۔ وہ گھسیٹتا ہوا کچن سے نکلا تھا اور اب بے دم سا ملک مصطفیٰ علی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ بلال حمید پر نزع جیسی کیفیت طاری تھی۔
'بات کیسے شروع کی جائے۔' ملک مصطفیٰ علی سوچ رہے تھے۔ وہ بھی خاصی مشکل سچویشن سے دوچار تھے۔
کیا میری باتوں پر وہ یقین کرے گی؟ یا مجھے بھی بلال جیسا مکار اور دھوکے باز سمجھے گی؟ میری بات سننے کے لیے وہ تیار بھی ہوگی۔ میری پوری بات ہر صورت اُسے سننا ہوگی۔' ملک مصطفیٰ علی جو آج تک کسی کے سامنے نہیں گھبرائے تھے نہ ہی بات کرنے سے پہلے انہوں نے کبھی ایک بار بھی سوچا تھا۔ آج تو انہیں ایک ہزار بار سوچنا پڑ رہا تھا۔ اس نیک پاک دامن لڑکی کے سامنے بلال حمید کا اس قدر مکروہ پلان وہ کن لفظوں سے بیان کریں گے۔ شدید ارتعاش نے اُن کے ہاتھ سُن کر دیے تھے۔ زیادہ سوچنے سے اُن کے کندھوں میں کھنچاؤ بھر گیا تھا۔ سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اُدھر بلال حمید بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا۔ جب میری اصلیت اس پر کھل جائے گی تو شاید ایک منٹ بھی یہاں پر نہ رُکے۔ کیا مجھ سے لڑے جھگڑے گی؟ یا اپنا سر دیواروں سے ٹکرائے گی۔ اُس کے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں وہ اتنے غصے والی کب ہے۔ یقیناً وہ گہری خاموشی میں چلی جائے گی۔ کچھ عرصہ اس کے ساتھ رہنے سے وہ اُمِ فروا کے مزاج سے کافی واقف ہو چکا تھا۔ مالک رحم فرما تھوڑی دیر تک جو ہونے والا ہے اُس کے لیے ہمت عطا فرما۔ جان کنی جیسی بے اطمینانی تھی کہ بلال حمید کے گرد جال بن رہی تھی۔ وسوسے سر اٹھائے اُس

کے گرد کنڈلی تنگ کر رہے تھے اچانک وہ زور سے جھرجھری لے کر انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی پورسے دباتا بلال اپنے چہار اوٹ خواہشوں کے ایسے جنگل اگائے تھا کہ اُسے کبھی ادراک ہی نہ ہو سکا کہ وہ کتنا غلط کر رہا ہے۔
بلال حمید کی آنکھوں کی جامد پتلیوں میں آج بھی وہی منظر ٹھہرا ہوا تھا جب اُس نے تین گواہوں کے سامنے نکاح نامے پر تین جگہ دستخط کیے تھے۔ خدا اور اُس کے رسول کو حاضر ناضر جان کر اُم فروا کے ساتھ ہمیشہ وفادار بن کر رہنے کا عہد کیا تھا۔ اُس کا کیا گیا، یہ کیسا عہد تھا کہ اُسے نہ خدا کا خیال آیا نہ رسولؐ یاد رہے۔ اُس وقت بلال حمید کی دانست میں صرف یہ تھا چند روز بعد ہی وہ اسے طلاق دے کر فیری ماں کے حوالے کر دے گا اور اُس سے ایک بڑی رقم حاصل کر کے چلتا بنے گا۔ میں تمام عمر تمھارا س کیوں نہ کر سکا اب یہ کیسی لاچاری تھکن بن کر میرے پیروں سے لپٹ رہی ہے۔'' اُم فروا دبے پاؤں ٹرالی گھسیٹتی بلال حمید اور ملک مصطفیٰ علی کے درمیان لے آئی۔
''السلام وعلیکم!'' اُمِ فروا نے جھکی نگاہوں سے سلام کیا۔ اس کے ہونٹ ابھی تک تھرتھرا رہے تھے۔ چہرے پر ہلکا سا بوجھ بڑھا ہوا تھا۔
''وعلیکم السلام۔'' ملک مصطفیٰ علی نے نگاہیں اُم فروا کی طرف اٹھائیں۔ وہ مبہوت سے اُسے دیکھتے رہے۔ تھرکتی پلکوں کے بوجھ سے اُمِ فروا کے عارض دہک اٹھے۔ وہ جلدی سے کچن کی جانب بڑھی۔
''ملک صاحب کھانا شروع کیجیے۔'' اس وقت ان دونوں کو بھوک نہیں تھی لیکن کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے انہیں کھانے کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ دونوں خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ اُم فروا ٹرے میں کوک اور پانی کی بوتل رکھے نزدیک آ گئی۔ سینٹر ٹیبل پر اُس نے گلاس اور بوتلیں رکھ دی اور گلاسوں میں کوک ڈالنے لگی۔
''آپ کھانا بہت مزے دار بنائی ہیں۔''
''شکریہ۔''
''آپ بھی ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔''
''میں بعد میں کھالوں گی۔'' دوپٹے کی بکل مزید کستے ہوئے بولی۔
''اُمِ فروا کھالو ناں بعد میں ٹھنڈا ہو جائے گا۔''
''اچھا۔'' اُم فروا نے آنکھوں کے اشارے سے بلال حمید کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔
''ٹھیک ہے پھر تم کچن میں ہی کھالو۔ ملک صاحب ابھی یہاں پر بیٹھیں گے۔ جس بندے کو انہیں ملنا تھا وہ ایک گھنٹے بعد آئے گا۔''
''کوئی بات نہیں چائے قہوہ کیا پسند کریں گے؟'' اُم فروا اب اُن کی بیک کی طرف کھڑی پوچھ رہی تھی تاکہ اُن کی نظریں اس پر نہ پڑیں۔ بلال حمید کے کہنے پر اُم فروا نے انہیں سلام کیا تھا ورنہ وہ کبھی کسی غیر محرم کے سامنے نہ گئی تھی۔ اس نے کچن میں آ کر تھوڑے سے چاول پلیٹ میں ڈالے اور اسٹول پر بیٹھ کر کھانے لگی۔
وہ لوگ کھانا کھا چکے تھے اُم فروا کچن کی چیزیں سمیٹنے لگی۔ کھانا کھانے کے بعد بلال حمید ٹرالی کچن میں لے آیا تھا۔ ''اُمِ فروا تم کھانا صحیح طرح کھاؤ یہ کیا کھا رہی ہو۔'' بلال حمید نے اُس کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول دیکھ کر کہا۔
''کافی ہیں مجھے زیادہ بھوک نہیں ہے۔'' آج اُم فروا کو اپنے دل پر عجیب سا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ بچا ہوا کھانا اُم فروا نے پلاسٹک کے پیالوں میں ڈال کر فریج میں رکھا۔ تمام میلے

برتن اکٹھے کر کے سنک میں رکھے اور آستین فولڈ کر کے برتن دھونے لگی۔ بلال حمید اور ملک مصطفیٰ علی آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اُم فروا نے کچن کی صفائی کی اور اپنے بیڈروم میں آ گئی۔

''بلال بلا لاؤ اُمِ فروا کو۔'' ملک مصطفیٰ علی نے اُس سے کہا۔ وہ بھاری قدموں کو بمشکل اٹھاتا بیڈروم تک آیا۔ ''فرو کیا کر رہی ہو؟'' وہ بیڈ پر بیٹھی اُمِ فروا کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ زبردستی مسکرائی۔ ایک بے نام بے چینی اُس کے اندر بھر رہی تھی۔ اب اُمِ فروا سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''فرو ملک مصطفیٰ علی تم سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''مجھ سے کوئی بات......؟'' وہ نہایت تیز لہجے میں سرعت سے بولی۔

''ہوں۔''

''کیا بات ہے؟'' وہ ابھی تک حیران تھی۔ اُس کے لہجے میں تلخی اُتر چکی تھی۔ جبکہ آج سے پہلے اُس نے بلال حمید سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

''تم چلو تو سہی۔'' بلال کے منہ سے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں نکل رہی تھی۔

''میں کیوں جاؤں کسی غیر محرم کے سامنے بلاوجہ، جبکہ پہلے صرف آپ کی خاطر میں اُن کے سامنے چلی گئی تھی کیونکہ آپ میرے شوہر ہیں۔ آپ کا حکم ماننا میرے لیے ضروری ہے۔''

''فرو اب بھی میرا حکم سمجھو اور لاؤنج میں چلو انہیں تم سے بے حد ضروری بات کرنی ہے۔'' بلال حمید کا دل اس وقت خون کے آنسو رو رہا تھا۔

''میں اُن سے اور وہ مجھ سے اتنے فری نہیں ہیں جو انہیں مجھ سے ضروری بات کرنی ہے۔'' اچانک اُمِ فروا کی آنکھیں گلابی ہو گئی تھیں، آواز بھرانے لگی تھی۔ جگر جگر آنکھوں پر بمشکل بندھ باندھے بیٹھی تھی۔ بلال حمید کا یہ انداز اُسے بہت بُرا لگ رہا تھا کہ اس کا خاوند کسی غیر آدمی کے سامنے اسے لے جانے کے لیے اصرار کر رہا ہے۔

''بلال آپ کو مجھے غیر مرد کے سامنے جانے کے لیے نہیں کہنا چاہیے۔'' وہ حزن وملال میں ڈوبی آواز سے گویا ہوئی۔

''سنیں جی یہ گناہ ہے۔ آخر میرا اُن سے واسطہ ہی کیا ہے جو وہ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''اُمِ فروا دیکھو ضد نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں ناں پھر تمہیں گھبرانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔'' اس وقت بلال حمید کا دل چاہ رہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر رو پڑے۔

''میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی اُس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ پہلی مرتبہ وہ اپنے خدائے مجازی کی کسی بات پر انکاری ہو رہی تھی۔

''مجھے آپ سے ایسی اُمید نہیں تھی کہ ایک غیر محرم سے مجھے بات کرنے کے لیے مجبور کریں گے۔ میری پرورش اس انداز میں نہیں ہوئی میں یہ گناہ سمجھتی ہوں۔ مجھے آپ اپنی اور میرے رب کی نگاہوں میں گناہ گار نہ کریں۔ آپ میرے شوہر ہو کر مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ جس آدمی کو میں جانتی تک نہیں۔ آپ اُس کے سامنے مجھے لے جانا چاہتے ہیں۔''

''فرو خدا کے لیے میری بات مان جاؤ۔ اس میں ہم سب کی بہتری ہے۔ پھر میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہیں پریشان ہونے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ تمہارا شوہر ہونے کے ناتے میں تمہیں حکم دیتا ہوں تم میرے

ساتھ لاؤنج میں چلو۔''

''اگر آپ کا حکم ہے اور آپ اس بات کو معیوب نہ سمجھتے ہوئے مجھے حکم دے رہے ہیں تو ٹھیک ہے۔'' اس وقت اُم فروا نے آنسوؤں کے دریا اندر ہی روک لیے تھے۔

اُم فروا نے دوپٹا درست کیا اور بلال حمید کے پیچھے چلی آئی۔ وہ نگاہیں جھکائے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ملک صاحب حکم کریں آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے؟''

''جی ہاں میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

ملک مصطفیٰ علی اندر ہوتی اُم فروا اور بلال حمید کی تکرار سُن چکے تھے۔ اُم فروا کے وہ تمام مان جو اُسے بلال حمید پر تھے۔ اچانک سے ڈھے گئے تھے۔ اس وقت وہ بار بار پلکیں جھپکتی سوچ رہی تھی۔ یوں کسی غیر مرد کے سامنے بیٹھنے سے پہلے وہ مر جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔ ملک مصطفیٰ علی کسی گہری سوچ میں تھے۔

''اب میں آپ سے جو کہنے جا رہا ہوں وہ آپ کو بہت ہمت اور حوصلے سے سُننا ہوگا، دراصل بات بہت بڑی اور بے حد تکلیف دہ ہے۔ میں آپ کو پھر کہہ رہا ہوں۔ آپ کو ہمت کرنا ہوگی۔''

وہ تو بس آنکھیں پھیلائے سانسیں لے رہی تھی۔ اُس کے وجود میں سکت نہیں تھی۔ اُس کے وجود پر ہلکی ہلکی لرزش طاری ہو رہی تھی۔

''یہ بات آپ کو بتانے کے علاوہ اور کوئی آپشن نہیں ہے۔ اُمید ہے آپ تحمل و ہمت سے بلال اور میری پوری بات سنیں گی۔ آپ کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا ہے۔ بلال آپ کا قصوروار ہے۔ آپ اس کے لیے جو سزا بھی تجویز کریں گی وہ اس کے لیے تیار ہے۔ وہ سزا تب بھی اس کے جرم کے سامنے کم ہوگی۔'' اس وقت اُم فروا سراپا حیرت بنی ٹکر ٹکر اُن دونوں کو گھور رہی تھی۔ اُس کا رنگ فق ہو چکا تھا، چہرے پر دھواں ہی دھواں تھا۔ گلے میں کانٹے اُگ آئے تھے۔ جیسے کسی نے اُسے تلوار جیسی تیز مشین کے دو پاٹوں کے درمیان دے دیا تھا۔ وہ نہ سمجھ رہی تھی یہ تمام تمہید کس لیے باندھی جا رہی ہے۔ یہ کیسی باتیں ہیں جن کا اس سے کوئی تعلق ہے؟'' ملک مصطفیٰ علی گویا ہوئے۔ ''دراصل آپ کی اور بلال کی شادی اتفاقیہ ہوئی ہے۔ اور اس شادی کا مقصد کچھ اور تھا۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔ اور آپ کون ہوتے ہیں مجھ سے ایسی بے ہودہ بات کرنے والے۔ سنیں جی آپ انہیں منع کیوں نہیں کر رہے۔''

''بلال کے کہنے پر ہی میں یہاں آیا ہوں۔ بلال حمید کی بجائے ملک مصطفیٰ علی بولے۔ تاکہ آپ کو سچ بتانے میں بلال کی مدد کر سکوں۔'' پلیز آپ میری بات تحمل سے سنیں اور یہ سوچیں بجز وقت خدا نے آپ کو بہت بڑی پریشانی اور امتحان سے بچا لیا ہے۔ آپ کو پہلے میری اور بلال کی پوری بات سننا ہوگی۔ اسی میں آپ کی بہتری ہے۔'''' اُم فروا میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں تم آرام سے ہماری پوری بات سن لو۔'' بلال حمید اس دوران پہلی مرتبہ بولا۔

''خدا نے تمہیں بہت بڑی مصیبت سے بچانا تھا اس لیے اُس نے تمہارے لیے ملک مصطفیٰ علی کو بھیجا ہے۔''

''بس تمہیں ہمت کرنا ہوگی اچھی لڑکی۔ تم اتنی نیک باعزت باپردہ ہو مجھے سمجھ نہیں آ رہی ایسی بات میں تم سے کس طرح کروں۔''

''ملک صاحب آپ کو جو کہنا ہے جلدی کہہ دیں۔ اب مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ جلدی کہہ دیں۔ آپ

کھل کر بات کریں لحہ لحہ مجھے اذیت سے دوچار نہ کریں۔'' اُم فروا نے سلگتی آنکھوں پر یخ بستہ انگلیوں کی پوریں رکھ لیں۔''بلال نے آپ سے شادی کسی اور کے کہنے پر کی تھی۔'' ملک مصطفیٰ علی نے بم اُس کے سر پر پھوڑ دیا۔

''کیا......؟'' اس کی پھیلی آنکھیں ساکن ہو چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں جیسے کسی نے دہکتے انگارے انڈیل دیے تھے۔ جن کی جلن اور اذیت نا کی پاؤں جلی بلی کی مانند اسے اِدھر سے اُدھر پٹخ رہی تھی۔

''یہ شادی کسی اور مقصد کے لیے کی گئی تھی۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' اس کی گھٹی گھٹی آواز میں اچانک تلوار جیسی تیزی عود آئی تھی۔ وہ نرمیوں میں گندھی گداز لبوں میں باتیں کرنے والی لڑکی آج زندگی میں پہلی بار اس قدر کرختگی سے بولی تھی۔ ''آپ برائے مہربانی کھل کر بات کریں۔'' ''جب سے بلال کی آپ سے شادی ہوئی ہے۔ اس نے اپنا بھیانک منصوبہ بدل دیا ہے۔ اب یہ ہر ہر ساعت خدا سے اپنے گناہوں کی معافی کا خواستگار رہتا ہے۔ اپنے کیے پر نادم ہے۔ یہ اب صرف اور صرف آپ کی بہتری چاہتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح اُس عورت سے بچانا چاہتا ہے۔''

''کون عورت؟'' اُم فروا کا سر گھوم رہا تھا آنکھوں کے سامنے سفید دھند چھا رہی تھی۔ اُس کا جسم ٹھنڈا ہوا جا رہا تھا۔ ''وہ عورت جو فرسٹ ٹائم آپ کو دیکھنے آئی تھی اور پھر آپ کی شادی میں شامل ہوئی تھی۔''

''یہ تو بتا رہے تھے کہ وہ ان کی آنٹی ہیں۔'' اُم فروا کی آواز بار بار رندھ رہی تھی۔ اس کی سانسیں تیز ہوتی ہوئی لڑکھڑا رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر عجیب دھوپ چھاؤں کے پہرے آن ٹھہرے تھے۔

''اُس کا نام فیری ہے۔ وہ عصمت فروشی کا دھندہ معزز شہری بن کر کرتی ہے۔ بالآخر ملک مصطفیٰ علی نے اُس پر ایٹم بم گرا ہی دیا۔

''ک...... کا...... کیا......'' یہ اُس نے چکراتا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ لڑکھڑا کر صوفے کی بیک پر جا لگی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ زردی بھرے چہرے پر لرزا طاری تھا۔ اُم فروا میں ہلکی سی جنبش لینے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ اُس کے بدن سے کسی نے روح کھینچ لی تھی۔ اُس کی کھلی آنکھیں اب بھی بلال حمید کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا لگ رہا تھا۔

روح کے تار کاٹ دینے والی تلخ سچائی اُم فروا کو ہلکان کر گئی تھی۔ پتھروں کے اس شہر بے صدا میں اس وقت کس کو مدد کے لیے پکارتی۔ ملک مصطفیٰ علی اس لڑکی کو یوں بے آب مچھلی کی مانند تڑپتا دیکھ کر دکھی ہو گئے تھے۔ بلال حمید اندر ہی اندر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ وہ تو اُم فروا کو پھولوں کی طرح ہنستا کھلکھلاتا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت وہ کس بے بسی و کرب سے دوچار تھی۔ وہ بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ اُس کے سینے میں خنجر پیوست ہو رہے تھے۔ اُس کا دل چاہا اس معصوم لڑکی کے پیروں سے لپٹ کر اپنی غلطی کی معافی مانگ لے۔ کیا اس کے معافی مانگ لینے سے اُمِ فروا کے دل کو گھائل کر دینے والے زخم مندمل ہو جاتے۔ اُس کی وہ تکلیف ختم ہو جاتی۔ جو بلال حمید نے اُسے سونپی تھی۔

☆......☆......☆

وہ اُمِ فروا سے کہنا چاہتا تھا کہ تم جو سزا مجھے دو میں سہنے کے لیے تیار ہوں۔ بے شک مجھے دار پر لٹکا دو ابھی بھی مجھے پھانسی دے دو اور میرے پیروں تلے تختہ تم خود کھینچو۔ تم جیسی نیک لڑکی تو نصیبوں والوں کو ملتی ہے۔ ایسا قدر دان جو تمہیں سینت سینت کر رکھتا۔ جو وضو کر کے غیر محسوس طریقے سے تمہاری پرستش کرتا، تمہاری پاکیزگی کی

عقیدت میں اُس کے رخسار بھیگتے، اُس کے ہونٹ تمہارا نام لینے سے پہلے غسل کرتے۔ اُس کا جنم صرف تمہاری پاکی بیان کرنے کے لیے ہوتا۔ وہ تمہاری عصمت کی قسم کھاتے ہوئے اپنی تسبیح کے دانے گراتا۔'' بلال حمید گہری سوچوں میں غرق اُم فروا سے ہمکلام تھا۔ جو اس وقت ایک بت کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں خشک تھیں۔ ملک مصطفیٰ علی نے آہستہ آہستہ نپے تلے لفظوں میں اُس سے تمام بات کہہ دی۔ وہ یونہی گم صم بیٹھی رہی۔ ملک مصطفیٰ علی نے بلال حمید کی طرف اشارہ کیا۔ بلال حمید بے دم سا پیر گھسیٹتا اُم فروا کے نزدیک آیا۔ وہ اس وقت پتھر کی ہو چکی تھی۔ بلال حمید نیچے بیٹھ گیا اور اُس کے پیروں پر اپنے ٹھنڈے ہاتھ رکھ دیے۔ اپنے پیروں پر کچھ بوجھ پڑنے سے وہ یک لخت ہڑبڑائی۔ وہ ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ نے میرے پیروں کو کیوں ہاتھ لگایا۔ ابھی تک میں آپ کی منکوحہ ہوں۔ آپ کا میرے پاؤں کو ہاتھ لگانا۔ میرے لیے گناہِ عظیم ہے۔'' وہ بولتے بولتے دیوار سے جا لگی۔

''میرے مالک مجھے معاف فرما دے! اس میں میری خطا نہیں ہے کہ میرے مجازی خدا نے میرے پیروں کو چھوا۔'' گھٹی گھٹی سسکیاں بھرتے ہوئے وہ چکراتے سر کے ساتھ بول رہی تھی۔

اُن دونوں کو ایک اور جھٹکا لگا۔ یہ لڑکی اب بھی ایسا سوچ رہی ہے۔

''اُمِ فروا میں قابلِ معافی نہیں ہوں۔ تمہاری ہر تجویز کردہ سزا کے لیے تیار ہوں۔'' ''تم حکم تو کرو۔'' اُمِ فروا کا پورا سراپا۔ اب بھی کپکپا رہا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی نے قریب پڑی بوتل میں سے گلاس میں پانی ڈال کر گلاس اُمِ فروا کو تھمانا چاہا۔ لیکن اُس نے نفی میں سر جھٹک دیا۔

''اُمِ فروا پلیز میری درخواست پر غور کریں۔'' ملک مصطفیٰ علی نے فرسٹ ٹائم اُس کا نام لیا تھا۔ ''بلال کے اندر ایک اچھا انسان ضرور موجود ہے۔ اسی لیے تو اس کے اندر کے اچھے انسان نے آپ کو بچا لیا۔ یہ طرح طرح کے بہانے بنا کر فیری کو ٹالتا رہا اور کسی ایسے شخص کی تلاش میں رہا جو اس کی مدد کرتا۔ خدا نے مجھے آپ دونوں کی مدد کے لیے بھیج دیا۔ اے نیک لڑکی! میں اور بلال پہلے آپ سے بات کرنا چاہتے تھے کہ بلال سے جو نا قابلِ معافی غلطی ہوئی ہے آپ کو بتا سکے۔ اس کے بعد اُس عورت کی طبیعت صاف کریں۔ میں اُس عورت کو کب کی عبرت ناک سزا دے چکا ہوتا۔ لیکن میں اور بلال نے یہی مناسب سمجھا پہلے آپ کے سامنے تمام صورتِ حال رکھی جائے۔ خدا نے بلال کو ہدایت دی۔ یقیناً آپ ہی سبب بنی ہیں اس کی ہدایت پانے میں۔ بلال کو اس دلدل میں سے نکالنے کی وجہ بھی آپ ہی ہیں۔ صرف آپ کی وجہ سے یہ صحیح راستے پر آیا اور میں بھی۔ اُم فروا آج آپ کے سامنے پہلی مرتبہ میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں نے بھی نادانستگی میں بے شمار گناہِ کبیرہ کیے۔ اپنے نفس کی غلامی کرتا رہا۔ اسے تسکین پہنچانے کی خاطر میری نگاہ سے صحیح اور غلط کی تمیز ختم ہو گئی۔ اب آپ کو دیکھ کر خیال آتا ہے ایسے لوگوں کی وجہ سے ہی ابھی تک یہ دنیا قائم ہے۔'' سہمی ہوئی ہچکیاں جبراً روکتی اُم فروا کا یہ ملکوتی جمال حشر برپا کر دینے والا رنجیدہ اُداسی کے پیرہن میں مقید حسن ملک مصطفیٰ علی کو مبہوت کر رہا تھا۔ اس کا روپ ایسا جادو بھرا کہ وہ بات کرتے کرتے غیر ارادی طور پر بار ہا اس سے نگاہیں کتراتے رہے۔ جو ابھی بھی دیوار کے سہارے کھڑی تھی اُس کے بوجھل پاؤں پر اب بھی لرزہ طاری تھا۔ اچانک اسے لگا اس کی ٹانگیں بیکار ہو رہی ہیں۔ اب وہ مزید وہاں کھڑی رہی تو ڈھے جائے گی۔ وہ جلدی سے زمین پر بیٹھ گئی۔

''اللہ! اللہ! اُس کے سختی سے بھینچے ہونٹوں سے اپنے پاک رب کا ذکر بکھر رہا تھا اطراف میں اس کے ہر نکلتے

سانس کے ساتھ اللہ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ اللہ اللہ کی صدائیں وہ دونوں بت بنے اس اللہ والی کی زبان سے نکلتی سُن رہے تھے۔ اُمِ فروا پر اک جنون بھری رقت طاری ہو چکی تھی۔ اُمِ فروا کو اس حالت میں دیکھ کر ملک مصطفیٰ علی جیسے مضبوط وجود کے طویل قامت والے شخص کے ہاتھوں میں پسینہ آ گیا تھا۔ اُن کی کشادہ پیشانی بھی نم ہو چکی تھی۔ اس وقت بلال حمید کو ایسے محسوس ہو رہا تھا کوئی تیز دھار والی نوکیلی چھری سے اُس کے سینے پر لمبی لمبی لکیریں ڈال رہا ہے۔ بلال حمید کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو جاری تھے۔ جو تیزاب کی مانند جھلسا دیے جانے والے جو اُس کے گالوں کی چمڑی میں سوراخ بنا گئے تھے۔

ملک مصطفیٰ علی کے دل کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ اُنہیں اس بندی کے رُوبرو اپنا آپ بہت ہی ارزاں اور حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کی ہچکیوں کے درمیاں بدستور، اللہ ہا، اللہ ہا کی صدائیں جاری تھیں۔ جیسے اندر سے اُس کا دل کٹ رہا تھا۔ اُمِ فروا کے وجود پر ایک وجدان بھرا لرزہ طاری تھا۔

''اُمِ فروا ہمت سے کام لو۔'' بلال حمید اُس کے قریب آیا۔

''اٹھو شاباش۔'' وہ تو زندہ لاش کی طرح بے حس ہو چکی تھی۔ بلال حمید نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر صوفے پر لا کر بیٹھا دیا اور پانی کا گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ دو چار گھونٹ پینے کے بعد اُمِ فروا کی حالت بہتر ہونے لگی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اچھی طرح آنکھیں صاف کیں۔ اُس کی بھیگی، لرزتی پلکیں اب بھی اس کے عارضوں پر کانپ رہی تھیں۔ ستواں ناک سرخ ہو چکی تھی۔

''اُمِ فروا دنیا کی ہر سزا میرے قصور کے سامنے کم ہے لیکن اچانک میرے اندر جنم لینے والے اچھے انسان نے مجھے گناہِ کبیرہ سے بچا لیا۔ تم معاف کر دو مجھے۔''

''دیکھیں آپ کے ساتھ ایسا ناقابلِ معافی کھیل کھیلا گیا ہے۔ آپ کی پاک دامنی کا شاید یقیناً اللہ نے بھی ذمہ لے رکھا تھا تبھی تو آپ محفوظ جگہ پر ہیں۔ اب آپ کو ان حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ چاہیے۔'' ملک مصطفیٰ علی بولے تھے۔

''آپ مجھے میرے والدین کے گھر چھوڑ دیں۔'' وہ بمشکل کہہ پائی۔

''ابھی آپ ادھر رہیں۔ حالات کنٹرول ہو جائیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد آگے بڑھنا ہوگا۔ اپنے والدین پر آپ اتنی بڑی اُفتاد نہ توڑیں۔ وہ بھی آپ کی طرح بکھر جائیں گے۔ آپ ہمارا ساتھ دیں، ہم آپ کی بہتری کے لیے ہی سب کچھ کر رہے ہیں۔'' ملک مصطفیٰ علی اُمِ فروا کے سامنے بیٹھ گئے۔ ''اُمِ فروا کیا پتا آپ ہی ہمارے لیے وسیلہ بخشش بن جائیں۔'' ملک مصطفیٰ علی کبھی کسی سے اس قدر منت سماجت والے لہجے میں بات نہیں کرتے تھے۔ انہیں کیا ہوتا جا رہا تھا وہ خود حیران تھے کہ اُن کے اندر یہ اچانک کیسی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اچانک سے دنیا کی آسائش انہیں پھیکی اور بے کشش کیوں محسوس ہو رہی ہیں۔ مجھے بار بار خدا کی وحدانیت یاد آ رہی ہے جو ہمارے ہر فعل سے واقف ہے۔ گواہ ہے ہمارے اعمال کا، سات پردوں میں چھپ کر بھی گناہ کر لیں رب ہر جگہ، ہر لحہ موجود ہے۔ وہ ہمیں دیکھتا ہے۔ روزِ محشر جب اُس رب کی چپ ٹوٹے گی تب کوئی پناہ گاہ ہمیں قبول نہیں کرے گی۔ وہ ہم سے ایسا منہ موڑے گا کہ ہمیں دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا تب وہ سات روزن بھی بند ہو جائیں گے جن کے پیچھے چھپ کر ہم گناہِ کبیرہ بڑی بہادری سے کرتے پھرتے تھے اور وہ ہمیں خاموشی سے دیکھتا رہتا تھا۔'' یہ پانی پئیں۔'' بلال حمید نے گلاس ملک مصطفیٰ کی جانب بڑھایا جو انہوں نے

خاموشی سے پکڑلیا اور پورا گلاس ختم کر دیا۔ اُمِ فروا پہلے سے کچھ بہتر فیل کر رہی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی اُس کی بہتر حالت دیکھ کر بولے۔

''مراد ولا میں آپ کے لیے ایک گھر کا انتظام کر دیا ہے۔ وہ ایک چھوٹی سی انیکسی ہے۔ فی الحال آپ وہیں شفٹ ہو جائیں۔ اس کے بعد فیری سے بھی نمٹ لیتے ہیں۔ آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا پڑے گا آپ اپنے پیرنٹس کو کچھ نہیں بتائیں گی بلکہ ہمیشہ کی طرح خوش خوش اُن سے ملیں گی۔''

''آپ وہاں شفٹ کیوں ہوئیں؟ یہ بات بلال سنبھال لے گا اور مولوی صاحب کو بھی مطمئن کر دے گا۔ یہ انہیں بتادے گا کہ اس نے میری فیکٹری میں جاب کر لی ہے۔ یہ فیکٹری ملک مراد ڈیری کے نام سے کافی معروف ہو چکی ہے۔ اس میں اسٹنٹ سپروائزر تعینات ہو چکا ہے اور گھر بھی کمپنی کی جانب سے ملا ہے۔ اِس لیے ہم وہاں شفٹ ہو گئے ہیں۔ آپ بھی یہی بتائیے گا اپنے گھر والوں کو۔ اگر آپ میری بات سے مطمئن نہیں ہیں تو جس طرح آپ چاہیں گی ویسا ہی ہو گا۔''

''مجھے اب کسی پر اعتبار نہیں رہا۔ کیا پتا اِس بار بھی آپ میرے ساتھ جھوٹ بول رہے ہوں؟'' اُمِ فروا لکڑی کی طرح سخت زبان کو بمشکل ہلا پائی۔

''نہیں...... نہیں...... پہلے غلطی ہوئی ہے اب ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ اُم فروا تم یقین کرو میری بات پر۔ بس ایک مرتبہ تم محفوظ ہاتھوں میں چلی جاؤ، اِس کے بعد میں مر بھی جاؤں تو کم از کم مجھے تمہاری فکر تو نہیں ہو گی۔'' بلال حمید نے اُمید بھری نگاہوں سے ملک مصطفیٰ علی کی طرف دیکھ کر اُم فروا سے کہا۔ وہ اُٹھ کر بیڈ روم میں جانے لگی۔ تو ملک مصطفیٰ علی نے اُسے پکارا۔

''آپ اپنا سامان پیک کر لیں، شام کو میں ٹرک بھیج دوں گا۔ ساتھ لیبر اور دو گن مین بھی ہوں گے۔ آپ آج ہی لال حویلی شفٹ ہو جائیں تو بہتر ہے۔'' اُم فروا نے اثبات میں سر ہلایا اور اندر چلی گئی۔

''اللہ تیرا صد شکر ہے۔ ایک مرحلہ تو طے ہو گیا۔'' بلال حمید زمین پر سجدے میں گر گیا۔ جب اُس نے سجدے سے سر اٹھایا تو اُس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ فرش سے اٹھا اور ملک مصطفیٰ علی کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ ملک صاحب میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں۔''

''بلال یہ سب کچھ اس نیک لڑکی کی وجہ سے خدا کے حکم سے ہوا ہے۔ اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ ہاں بلال تم یہاں سے شفٹ ہونے کے بعد اپنے موبائل کی سم تبدیل کر لو۔''

''جی بہتر۔'' بلال حمید نے دیکھا اُم فروا اپنی مخصوص جگہ پر جائے نماز بچھائے عصر کی نماز پڑھ رہی تھی۔

''ملک صاحب آپ نے جو کچھ میرے ساتھ کر دیا ہے یہ احسان میں تمام عمر نہیں اُتار پاؤں گا۔ کوئی کسی کے لیے اتنا نہیں کرتا۔''

''شکریہ ادا کرنا ہے تو اس نیک لڑکی کا ادا کرو۔ جس کی پاکیزگی دیکھ کر میرے اندر برا انسان مر گیا۔ میں قطعی اس بات سے لاعلم تھا۔ میں تو اس بات سے لاعلم تھا کہ میرے اندر کی بے شمار پرتوں میں آخری پرت کے اندر کوئی صالح نفس براجمان ہے۔ میں غافل تھا اُس سے۔ جس کو اس لڑکی نے جگایا۔ اس لڑکی کے ہم دونوں مقروض ہو چکے ہیں۔ بلال تمہارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تم اُم فروا کو لائے کس ارادے سے تھے اور جب تم نے خدا کی رحمتیں سے گندھے پُر نور چہرے کو دیکھا تو تمہارا ارادہ خود بخود بدل گیا۔ تم اپنے کیے پر شرمندہ ہوئے۔

احساسِ ندامت نے تمہارے اندر بے چینی بھردی۔ بلال میں سمجھ سکتا ہوں تب تم پل پل کی موت مرے ہوگے۔ تمہارے ضمیر نے تمہیں کسی ساعت چین نہ لینے دیا ہوگا۔ تم نے بہت اچھا کیا مجھ پر بھروسہ کر کے، بلال تم درست کہتے ہو۔ انسان کو کبھی نہ کبھی نہایت مجبوری کی حالت میں کسی نہ کسی پر اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے۔ تمہاری وجہ سے میں نے بھی کوئی نیکی کمالی۔''

''ملک صاحب ہمارا اتفاقاً ملنا خدا ہی کے حکم سے تھا۔ آپ بھی میرے لیے دعا کرتے رہیں۔ اب اُمِ فروا مجھے معاف کردے۔''

''بلال اُس کے ساتھ تو بہت بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ اب اگر وہ معاف کرتی ہے تو یہ اُس کی اعلیٰ ظرفی ہوگی۔''''

ملک صاحب آپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ میں آپ کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاتا ہوں۔''

''بلال تین کپ بنا کر لانا۔''

''جی ضرور۔''

''چائے پی کر پھر مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے جاتے ہیں۔'' بلال حمید نے بیڈروم کے دروازے کے قریب جا کر دیکھا۔ اُمِ فروا سجدے میں گری ہوئی تھی اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا اور اس کی سسکیاں کمرے کی سوگوار خاموشی کو مزید اُداس کر رہی تھیں۔ بلال حمید کچن میں چائے بنانے چلا گیا۔ اُس نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور ٹرالی میں کپ لگانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے کی ٹرالی لیے لاؤنج میں آ گیا۔ جہاں ملک مصطفیٰ علی ٹانگ پر ٹانگ رکھے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کی گہری براؤنش آنکھوں میں اُلجھاؤ بھرے بھنور ابھر ڈوب رہے تھے۔ بھاپ اڑاتی چائے کی پیالی بلال حمید نے اُن کی طرف بڑھائی۔ وہ چونکے۔

''شکریہ۔'' وہ گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگے۔ دوسری پیالی بلال حمید اٹھائے اُمِ فروا کو دینے بیڈروم میں چلا آیا۔ وہ ابھی تک سجدے میں تھی۔

''اُمِ فروا یہ چائے رکھ رہا ہوں۔'' بلال حمید نے سائیڈ ٹیبل پر پیالی رکھتے ہوئے اُسے پرچ سے ڈھک دیا۔ اب وہ اُسے فرو کہنے سے ہچکچانے لگا تھا۔ اس وقت وہ اُس کا سامنا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ چائے رکھ کر وہ جلدی سے باہر آ گیا اور اپنی پیالی اٹھاتے ہوئے سامنے بیٹھ گیا۔

رات کو ہی یہ لوگ مراد ولا کی دو کمروں کی انیکسی میں شفٹ ہو گئے تھے۔ اُمِ فروا نے صرف اپنے جہیز کا سامان اٹھایا تھا وہاں سے۔ باقی سامان اُس شخص کا تھا جس نے کچھ عرصہ کے لیے بلال حمید کو یہ گھر دیا تھا۔ جاتے ہوئے بلال حمید نے گھر کی چابیاں ہمسائے کو دے دی تھیں کہ عصر نامی کوئی لڑکا آئے تو اُسے دے دینا۔

☆......☆......☆

یہ بے حد خوبصورت اسٹائلش انیکسی تھی۔ جو مراد ولا کے رہائشی ایریا کی بیک پر تھی۔ مراد ولا میں ایسی پانچ انیکسیاں تھیں۔ اکثر ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ علی کے دوست یا بابا جان کے قریبی جاننے والے لاہور شہر میں مہمان آنے والوں دوستوں کے لیے مخصوص تھیں۔ یہاں پر اکثر کوئی نہ کوئی آ کر ٹھہرتا تھا۔ سبھی انیکسیاں فرنیشڈ تھیں۔ ضروریاتِ زندگی کی تمام سہولیات سے آراستہ۔ فی الحال اُمِ فروا نے سامان اسٹور میں رکھوا دیا تھا۔ اپنی ضرورت کی چند چیزیں اس نے بیڈروم میں رکھ لی تھیں۔ صبح فجر کے وقت وہ یہاں پہنچے تھے۔

ایک بیڈروم انٹرنس کے کوریڈور کے ساتھ تھا۔ سامنے بڑا سا ہال، دائیں سائیڈ پر ایک اور بیڈروم اور اسٹور

روم تھا۔ ہال کے فرنٹ پر یُو شیپ اسٹائلش کچن تھا۔ باہر چھوٹا سا لان تھا۔ جس کے تین اطراف کافی اونچی روکری تھی۔ لان موسمی پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ مخمل جیسی ہموار گھاس بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ انٹرنس کے چھوٹے سے برآمدے میں اور ہال میں گلاس ونڈو کے قریب انڈر پلانٹ پودے خوبصورت گملوں میں رکھے ہوئے تھے۔ جنہیں دیکھ کر طبیعت فریش ہو جاتی۔

جب وہ پہنچے تو تھوڑی دیر بعد اُمِ فروا نے وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کرنے لگی۔ بلال حمید باہر سے دروازہ، لاک کرتا لال حویلی کی مسجد میں نماز پڑھنے چلا گیا۔ جہاں لاؤڈ اسپیکر پر دعوتِ نماز دی جا رہی تھی کہ فجر کی نماز کی جماعت کھڑی ہونے میں پانچ منٹ ہیں۔

جب بلال حمید مسجد میں پہنچا تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی، صرف دو صفیں تھیں۔ بلال دوسری صف میں کھڑا ہو گیا۔ جماعت کے اختتام پر سبھی مزارعوں، ملازمین اور بچے آہستہ آہستہ مسجد سے نکلنے لگے۔ سبھی گزرتے ہوئے ایک نگاہ بلال حمید پر ضرور ڈالتے۔ شاید اُن لوگوں نے سوچا ہو گا کہ کسی کے گھر میں کوئی مہمان آیا ہو گا۔ یا انیکسی میں ٹھہرا کوئی مہمان ہو گا۔ اس وقت بلال حمید مسجد میں تنہا رہ گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ اللہ کی بارگاہ میں، اُس کی ذاتِ مقدس کے سامنے اٹھے ہوئے تھے۔ پھر وہ سجدے میں گرا گریہ وزاری سے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ وہ سسک رہا تھا۔

''مالک تُو میرے لیے کچھ بہتر کر دے۔ تجھ سے سچے دل کے ساتھ اپنے گناہوں کی معافی کا طلب گار ہوں۔ مالک! تُو میری مدد فرما تاکہ آئندہ میں کوئی گناہ نہ کر سکوں۔ تیرے تابعدار، فرمانبردار بندوں میں شامل ہو جاؤں۔ رب سوہنے اس خطار کار بندے کو معاف فرما دے۔ ایک لڑکی کی بابت تُو نے مجھے توبہ طلب کرنے والوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ مولا! رب کائنات میری تمام مشکلات کو آسانیوں میں بدل دے۔''

''بلال حمید دیر تک سجدے میں گرا گڑگڑا کر اللہ پاک سے اپنی خطاؤں کی معافیاں مانگتا رہا۔ اب اس کا دل ندامت کے آنسوؤں کے بعد کافی ہلکا ہو چکا تھا۔ وہ خود کو بہت بہتر پا رہا تھا۔ وہ اٹھا رومال سے چہرہ صاف کیا اور آہستہ روی سے چلتا ہوا مسجد سے باہر نکل آیا۔ ایک ہاری اپنے بیلوں کو ہانکتا ہوا اُس کے قریب سے گزرا۔ یہ مسجد لال حویلی کے رہائشی احاطے کے باہر کھیتوں کی طرف تھی۔

بیلوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی پُرسوز آواز کانوں کو بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ لڑکا اپنی ہی ترنگ میں ماہیے گاتا جا رہا تھا، بہت اونچی آواز میں۔ وہ کھیتوں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اب وہ بہت دور نکل چکا تھا۔ اُس کی سریلی آواز اور بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز مل کر اب بھی بلال حمید کی سماعتوں کو چھو رہی تھی۔ صبح کاذب کی نرمل سپیدی بڑھ رہی تھی۔ پرندے اپنے گھروندوں سے نکل کر اڑان بھرتے فضا میں بکھرتے، خداوند قدوس کی ثنا خواہی کر رہے تھے۔ درختوں کے پتوں سے جھانکتے جب کچی نیند میں اپنے پر کھولتے تو ایک پُراسرار ارتعاش پھیلتا چلا جاتا، تب اُن سب کی ملی جلی خوشی کی چہچہاہٹ خوبصورت ردھم کا تاثر پیش کرتی تھی۔ قدرت کے حسن کا فیاضی بھری خوبصورتی سے اس کائنات بنانے والے مالک کا صد شکر ادا کر رہے تھے۔ کنویں کے رہٹ کی گڑگڑاہٹ دور سے سنائی دے رہی تھی۔ اس وقت پورا لاہور خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ لیکن لاہور ہی کے پوش علاقہ میں اپنے شوق کے لیے بنایا گیا، گاؤں مراد ولا صبح صادق کی پہلی پو پھوٹنے کے ساتھ ہی جاگ گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا لال حویلی کے اندرونی گیٹ کی جانب بڑھا۔ اپنی شناخت کروا کر وہ گیٹ کے اندر

داخل ہوگیا۔ دربان نے خوشی سے مصافحہ کیا۔ ملک مصطفیٰ علی نے بھی دونوں گیٹوں کے دربانوں کو بتا دیا تھا کہ بلال حمید میرا دوست ہے اور وہ کچھ مدت کے لیے یہیں پر انیکسی نمبر تین میں رہے گا۔ بلال حمید حویلی کے مردان خانہ سے گزرتا ہوا انیکسی نمبر تین کی جانب بڑھنے لگا۔ تارکول کی براؤنش سڑک سے گزر کر وہ انیکسی کی طرف آ گیا۔ اُس نے لاک کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ گھر میں ایک ہو کا عالم تھا۔ گہری خاموشی سے بلال حمید کو گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ اُس نے ہال کی تمام کھڑکیوں کے پردے اطراف میں کر دیے، جہاں سے اِس انیکسی کے لان کا ویو بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دبے قدموں بیڈ روم کی طرف آیا تو اُمِ فروا کرسی پر بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھی۔ وہ الٹے پاؤں واپس مڑا اور کچن میں چلا گیا۔

کچن میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ برتنوں والی کیبنٹ میں ضرورت کے تمام برتن موجود تھے۔ دوسری کیبنٹ میں مسالا جات چائے چینی آئل سب کچھ ڈبوں میں ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔ شاید اُمِ فروا نے فجر کی نماز کے بعد کچن کا سامان ترتیب سے رکھ دیا تھا۔ اِس وقت بلال حمید کا دل چائے پینے کو چاہ رہا تھا۔ فریج میں دودھ وغیرہ موجود تھا۔ اس نے چولہے پر پانی چڑھا دیا۔ دو دن پہلے ہی تو وہ گھر کا تمام راشن لایا تھا، جو آتے ہوئے وہ ساتھ لے آیا تھا۔ بلال حمید نے دو کپ چائے کے بنائے ٹرے میں رکھے اور ہال میں آ گیا۔ اُمِ فروا اُسے دکھائی نہ دی۔ وہ بیڈ روم میں ہی آ گیا۔ یہاں بھی وہ نہیں تھی۔ شاید واش روم میں ہو۔ اُس نے گلاس ٹیبل پر ٹرے رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واش روم سے نکلی۔ بلال حمید نے اُس کی سوجی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اُسے لگا جیسے اُس کے دل پر کسی نے گھونسہ مار دیا ہو۔ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک وہ روتی رہی ہوگی۔ بلال حمید کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔

''اُمِ فروا چائے لے لو۔ روزانہ تم مجھے چائے بنا کر پلاتی ہو، سوچا آج میں تمہیں، اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلاؤں۔'' اُمِ فروا نے کوئی جواب نہ دیا، نہ ہی اُس نے بلال حمید کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈ کور کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے بیڈ کشن ترتیب سے رکھنے لگی تھی۔ وہ یوں ہی پلٹی بلال حمید اُس کا اُداس چہرہ دیکھتے ہوئے پھر بولا۔ ''اُمِ فروا چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' اُس نے خاموشی سے چائے کا کپ اٹھایا اور بیڈ پر جا کر بیٹھ گئی۔ دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ بلال حمید کو اس خاموشی سے گھبراہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔

''اُمِ فروا ابھی تک تم نے مجھے معاف نہیں کیا۔'' وہ کرسی سے اُٹھ کر اس کے قریب بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اُمِ فروا نے لمحہ بھر کے لیے شکوہ بھری نگاہوں سے بلال حمید کی طرف دیکھا اور دوسرے لمحے گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے پر نظریں مرکوز کر دیں۔ اتنے دن ساتھ گزارنے کے دوران ایک مرتبہ بھی اُمِ فروا کے چہرے پر ہلکا سا تناؤ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ جب بھی بلال حمید سے باتیں کرتی لگتا اُس کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔

''اُمِ فروا مجھے جواب دو۔'' وہ ملتجیانہ لہجے میں اُسے دیکھ رہا تھا۔

''اتنا کچھ آپ نے میرے ساتھ کر دیا اور اب چاہتے ہیں کہ میں آپ کو معاف کر دوں۔''

''اُمِ فروا میں مانتا ہوں مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی ہے۔ اگر تم مجھے معاف کر دو تو تمہارا ایک اور احسان ہوگا مجھ پر۔ خدا بھی تو اپنے بندوں کو معاف کر دیتا ہے ناں۔''

''ہوں خدا معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ خدا ہے اور خدا بے نیاز ہے۔''

''تو تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟'' اب وہ بنا جواب دیے خاموشی سے چائے پیتی رہی۔ بلال حمید نے محسوس

کیا اُم فروا اُس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ چائے کی چسکیاں بھرتی رہی۔
''آپ آج مجھے میرے میکے چھوڑ دیں۔''
''اُم فروا ابھی تم وہاں کیسے جاسکتی ہو۔''
''کیوں نہیں جاسکتی؟''
''میں تمہیں منع نہیں کررہا لیکن تم اپنی حالت دیکھو تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ چہرے پرغم کے پہاڑ اُتر آئے ہیں۔ وہ لوگ پریشان ہوجائیں گے۔ تمہاری طرف سے کئی خدشات اُن کے دل میں اٹھیں گے۔ کئی سوال تم سے پوچھے جائیں گے۔ اگر انہیں ذراسی بھی بھنک پڑگئی تو اچھا نہیں ہوگا۔ وہ لوگ پریشان ہوجائیں گے۔ تمہارا سامنا کرتے ہوئے میں گھبرا رہا ہوں۔ مولوی صاحب اور بے بے جی کا سامنا کیسے کرپاؤں گا۔ میں مولوی صاحب جیسے شریف النفس شخص کے سامنے کیسے کھڑا ہو پاؤں گا۔ اُم فروا تم اُن سے فون پر بات کرلو لیکن ایسا ویسا انہیں کچھ نہ بتانا۔ دیکھو تم تو پریشان ہو ہی مگر اب انہیں پریشان مت کرو۔ اچھی لڑکی خدا سے میں نے سچے دل سے توبہ کی ہے۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگی ہے۔ آئندہ گناہ نہ کرنے کی مدد چاہی ہے پاک پروردگار سے۔ اُم فروا تمہیں دیکھ کر، تم سے مل کر اس گناہ گار کو رب یاد آیا۔ اپنے گناہوں کی تعداد سے شرمندگی کا احساس روح میں اٹھا۔ میں اب فلاح کی جانب آنا چاہتا ہوں۔ بھلائی کی جانب قدم بڑھانا چاہتا ہوں۔ بار بار کہوں گا میرے اندر یہ تمام تبدیلیاں صرف تمہاری وجہ سے آئیں۔ کسی نے غیر محسوس طریقے سے مجھے نیکی کی دعوت دی۔ رب سے روشناس کرایا۔ اُس کا ہر جگہ، ہر لمحہ ہونے کا یقین میرے اندر پختہ کیا۔ اگر تم مجھے معاف نہیں کروگی تو شاید میرا رب بھی مجھے معاف نہ کرے اور میں منجدھار میں ڈوب جاؤں۔'' اس وقت بلال حمید کا لہجہ بھیگ رہا تھا۔'' پھر بلال حمید نے سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 104 اُم فروا کے سامنے پڑھی۔ (ترجمہ) اور تم میں سے ایسے لوگ بھی ہونے چاہیں جو نیکی طرف بلائیں اور اچھے کام کرنے کو کہیں اور بُرے کاموں سے روکیں اور یہی لوگ مراد کو پہنچیں گے۔''

اُم فروا نے تب ایک نگاہ بلال حمید پر ڈالی، اُس کی آنکھیں سچ بول رہی تھیں۔
''تم مجھے ایک مرتبہ معاف کردو۔ میں سدھرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے نیکی کی طرف آنے کی دعوت تو دو۔'' وہ اُمِ فروا کے جواب کا منتظر تھا۔ لیکن اس کی چپ نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ بلال حمید نے اُس کی خاموشی پر صبر کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔
''میں اور ملک صاحب آج فیری کی طرف جائیں گے۔ اُس کے چار لاکھ بھی واپس کرآؤں گا اور ملک صاحب اُسے سمجھا بھی دیں گے۔ اُس کی طبیعت خوب اچھی طرح صاف کرکے آئیں گے۔ اب ذرا سنبھل کر رہے۔ اگر اُس نے ایسا ویسا کچھ کرنے کی کوشش کی تو ملک صاحب اپنے ہی طریقے سے اُس سے نمٹ لیں گے۔ ورنہ وہ اپنے انجام کی خود ذمے دار ہوگی۔ اسی عورت نے مجھے اس گناہ آلود زندگی کی طرف راغب کیا تھا۔ میں تو اپنے تایا اور اُس کے بیٹوں کے مظالم سے تنگ آکر یہاں نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ فیری نے ایسے میرا برین واش کیا کہ اچھائی برائی کا فرق ہی میرے اندر سے مٹ گیا۔ بغیر سوچے میں اُس عورت کے اشاروں پر چلتا رہا۔ اُمِ فروا تم جیسی پاک لڑکی کے قابل میں تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا، نہ پہلے تھا نہ ہی اب ہوں۔ میرے جسم کا ایک ایک رواں گناہوں میں لتھڑا ہوا ہے۔ میں تو اس سوچ تک پہنچ ہی نہیں سکتا کہ میرے جیسا غلیظ شخص تمہاری

طلب کرے۔'' بلال حمید کی آواز اُس کے اطراف بازگشت بن کر بکھر رہی تھی۔ اُسے کانوں سے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بس کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ وہ اُم فروا کی جھکی آنکھیں دیکھتا رہا بلال حمید اپنا آبلۂ دل کیسے چیر کر اُم فروا کو دکھاتا جس میں اس کے لیے پاک جذبے سسک رہے تھے۔ وہ اُم فروا سے بحرِ بیکراں کی وسعتوں سے بھی بڑھ کر محبت کرتا تھا۔ ایسی محبت جس میں کسی بھی قسم کی ریاکاری یا جھوٹ شامل نہیں تھا۔ بلال حمید ہر طرح سے اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی خاطر ہر سزا کے لیے تیار تھا۔ بس اُم فروا پر کوئی آنچ نہ آئے وہ یہی سوچتا رہتا تھا۔ اسے ہر طریقے سے فیری سے بچانا چاہتا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ بلال حمید کی سوچوں کی پٹاری بکھرتی چلی گئی۔ وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ''السلام وعلیکم جی!''

''وعلیکم السلام۔''

''یہ حویلی سے آپ کا ناشتہ آیا ہے۔''

''اِس کی ضرورت تو نہیں تھی۔''

''جناب ملک صاحب کا حکم ہے! آپ کا ناشتہ کھانا حویلی کے اندرون خانہ سے ہی آئے گا۔ جناب میرا نام نصر اللہ ہے۔ چھوٹے ملک صاحب نے مجھے آپ کی خدمت کے لیے مقرر کیا ہے۔ بازار سے کچھ منگوانا ہو تو بتا دیا کریں۔ لال حویلی کے پہلے گیٹ کے سامنے سڑک کراس کر کے بالکل مین پر سپر مارکیٹ ہے۔ روزانہ صبح دس بجے میں سودا سلف لینے جاتا ہوں، آپ بھی بتا دیا کریں۔''

''نصر اللہ بھائی بہت شکریہ۔'' بلال حمید نے اُس کے ہاتھ سے ناشتہ کی ٹرے پکڑ لی۔

''میں جاؤں۔''

''ہاں۔'' وہ واپس چلا گیا۔

بلال حمید دروازہ بند کر کے اندر آ گیا۔ ہال کے سینٹر ٹیبل پر اُس نے ٹرے رکھ دی۔ اوپر سے ٹرے پوش ہٹایا تو پراٹھے، انڈے، حلوہ پوری اور تھرماس میں چائے۔ بلال حمید اُم فروا کے بیڈروم میں آ گیا۔

''اُم فروا ملک صاحب نے ناشتہ بھجوایا ہے، آ جاؤ ناشتہ کر لو۔ کل سے تم نے کچھ نہیں کھایا۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' بلال حمید کی طرف دیکھے بغیر وہ بولی اور ہاتھ میں پکڑی تسبیح پڑھتی رہی۔

''تھوڑا سا کھا لو۔ خدا کے رزق کے لیے انکار نہیں کرتے۔ اٹھو شاباش گرم گرم ناشتہ ہے ٹھنڈا ہونے پر بدمزہ ہو جائے گا۔'' وہ ویسے ہی بیٹھی رہی۔

''اُم فروا تم خود ہی تو کہتی ہو۔ شوہر کی ہر جائز بات ماننی چاہیے۔ میں تمہارا شوہر ہوں ناں۔'' وہ اُم فروا کے نزدیک آ گیا۔ اُس نے اثبات میں پلکوں کو جنبش دی۔

''پھر اُٹھ جاؤ اور ناشتہ کر لو۔'' وہ خاموشی سے بلال حمید کے پیچھے ہال میں چلی آئی۔ جو بیک وقت ڈرائنگ روم، لیونگ روم، لاؤنج کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ امپورٹڈ قیمتی قالین پر وہ سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتی صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ بلال حمید کچن سے پلیٹیں چائے کے کپ لے آیا۔ بلال حمید نے ٹیبل مزید قریب کھسکا لیا اور اس کے دائیں سائیڈ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''شروع کرو۔''

''آپ لیں۔'' بلال حمید نے پیار سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور بسم اللہ پڑھتے ہوئے پلیٹ میں ایک پوری

اور تھوڑا سا حلوہ ڈال لیا۔ ملک صاحب نے اتنا ڈھیر سارا ناشتہ بھجوا دیا ہے۔ ہم دو ہی تو لوگ ہیں۔'' اس نے کوئی جواب نہ دیا تب وہ بھی خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا۔ اُمِ فروا کو اپنا چھوٹا سا، صاف ستھرا گھر یاد آ گیا جہاں وہ تخت پوش پر بیٹھ کر بے بے جی اور ابا جی کے ساتھ ناشتہ کیا کرتی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد اُمِ فروا برتن اٹھا کر کچن میں لے گئی۔ کافی سارا ناشتہ بچ گیا تھا جو اس نے فریج میں رکھ دیا۔ ناشتے والے برتن دھو کر انہیں خشک کر کے ٹرے میں رکھ دیا اور اُوپر ٹرے پوش ڈال دیا۔ وہ دوبارہ اپنے بیڈروم میں آ گئی۔

''اُمِ فروا لان میں چلو گی۔ کچھ دیر تازہ ہوا میں بیٹھتے ہیں۔'' وہ خاموشی سے بلال حمید کے پیچھے لان میں چلی آئی۔ ہیج کی کافی اونچی باؤنڈری تھی۔ لان میں لوہے کی سفید کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کیاریوں میں لگے رنگ برنگے پھولوں میں کھو گئی جو ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ سے ملتے ایک دوسرے کے گلے مل رہے تھے۔ موسم بہت اچھا ہو رہا تھا۔ آسمان پر سفید، سرمئی بادل اکٹھے ہو گئے تھے۔ بادل تیزی سے مغرب کی سمت بڑھ رہے تھے انہیں شاید کہیں اور جا کر برسنا تھا۔ کچھ توقف بعد سورج بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ وہ کافی دیر تک پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ بلال حمید سامنے چیئر پر بیٹھا پھولوں کے پاس گم صم کھڑی اُمِ فروا کو دیکھتا رہا اس وقت وہ سوچ رہا تھا میں اس اچھی سی لڑکی کے ہرگز قابل نہیں ہوں۔ فیری کا مسئلہ حل ہو جائے تو میں اس سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ میرا سایا بھی اس پر نہ پڑے۔ کوئی نیک اور شریف لڑکا اس کی زندگی میں بہار بن کر آ جائے۔ تب میں اُمِ فروا کو بحفاظت اُسے سونپ سکوں جو صحیح معنوں میں اس کا حق دار ہونے کا اہل ہو۔ اسی کی طرح نیک ہو۔ میں تو اس کے لیے بنایا ہی نہیں گیا۔ اس کے لیے کوئی اور ہے انشاء اللہ وہ جلد آئے گا۔ اللہ پاک خود اسباب پیدا کر دے گا۔'' ملک مصطفیٰ علی اسی طرف آ گئے۔

''السلام وعلیکم ملک صاحب!'' بلال حمید کھڑا ہو گیا۔

''وعلیکم السلام بلال کیسے ہو؟'' ملک مصطفیٰ علی نے مصافحہ کرتے ہوئے بلال حمید کا کندھا تھپتھپایا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ ''اور سناؤ کیسے ہو۔'' ملک مصطفیٰ علی کی نگاہیں بار بار اُمِ فروا کی طرف اٹھ رہی تھیں جو پھولوں میں گھری اپنی اہمیت مزید بڑھا چکی تھی۔ کوئی مسئلہ تو پیش نہیں آیا۔''

''نہیں ملک صاحب۔'' ملک مصطفیٰ علی نے خفیف لمحوں میں پھر اُدھر دیکھا۔ اس وقت اُمِ فروا سفید لباس میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اُس کی بڑی سیاہ آنکھیں، اُن پر گھنیری مڑی ہوئی پلکیں۔ جنہیں وہ بار بار جھپک رہی تھی، بند ہونٹوں کے ساتھ وہ کھڑی پھولوں کے ٹھنڈے رنگوں سے اپنی آنکھوں میں تراوٹ بسا رہی تھی۔ اس کی اندرونی دلگیر کیفیت سے کوئی آگاہ نہیں تھا۔ اس تکلیف دہ حقیقت نے تو اس کے حواس ہی گم کر دیے تھے۔

اب بھی اس کی نم نم آنکھیں ہراساں تھیں کہ اس کے ساتھ ہو کیا گیا ہے؟

اس کے اندر ساون کی ابھاگن رُت جیسا جل تھل تھا۔ وہ تو اپنے شوہر کی ہمراہی میں اپنے ایثار اور اُس کی لازوال پرستشوں سے اپنا قد اونچا کرنے کے لیے بابل کے آنگن کو خیر باد کہہ کر ان منزلوں کی جانب نکلی تھی۔ لیکن بلال حمید نے اسے پستیوں میں دھکیل دیا تھا۔ اُس نے مولوی ابراہیم کی بیٹی کے ساتھ کیا بھی تو بہت بُرا تھا۔ اُس نے یہی تو سوچا تھا اس بے تحاشا خوبصورت لڑکی کو جانور نما امیر زادوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھا کر اُس ڈائن نما عورت سے دس لاکھ بٹور لے گا۔ اُمِ فروا کے اندر آتش فشاں موجزن تھے۔ جن کی دراڑوں سے قطرہ قطرہ لاوا باہر نکل رہا تھا۔ اور اسے اپنے حصار میں جکڑ رہا تھا۔ کل سے مسلسل یہ عمل اُمِ فروا کے ساتھ جاری تھا۔

اس کے روم روم سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ سچی محبتوں کی متلاشی بن کر وہ بلال حمید کی زندگی میں آئی تھی۔ وہ اُس کے ہر فعل سے بھروسا، سچائی وایمانداری چاہتی تھی۔ لیکن تہس نہس کر دینے والی اٹل حقیقت سینہ تانے اس کے روبرو کھڑی تھی۔ اب بلال حمید کا چہرہ اس کی آنکھوں میں ایسی چبھن پیدا کر رہا تھا جیسے گلے میں پھنسی ہڈی اذیت پہنچاتی ہے۔ اس کی نظریں اب بھی پھولوں پر ٹھہری ہوئی تھیں لیکن ذہن کہیں اور دھکے کھا رہا تھا۔ وہ اپنی مومی انگلیاں سفاکی سے مروڑ رہی تھی۔ اُم فروا نے اِس دوران ایک مرتبہ بھی پیچھے بیٹھے بلال حمید کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ ملک مصطفیٰ علی کی آمد سے بھی بے خبر تھی۔ بڑے سے دوپٹے کا ہالہ اس کے شہابی چہرے کو اور پاکیزگی بخش رہا تھا۔ اس لڑکی کی پاکیزگی کو دیکھ کر اس کا نام لینے سے پہلے ہونٹوں کو آبِ زم زم سے غسل دینا چاہے تھا۔ کیسا تماشا بنا دیا تھا بلال حمید نے اس کا۔

''ملک صاحب آپ نے ناشتہ بھجوانے کی ایسے ہی تکلیف کی۔''

''بلال تکلیف کیسی، تمہیں میں نے دوست کہا ہے۔ یقیناً تمہارے دل میں بھی سوال اٹھتا ہوگا کہ میں تم پر اتنا مہربان کیوں ہوں۔ بلال تم نے جس نیک کام کا ارادہ کیا ہے اُس میں تھوڑا سا حصہ میں بھی ڈالنا چاہتا ہوں۔ اُم فروا ایک غیر معمولی شخصیت ہے میں نے آج سے پہلے ایسی نیک سیرت لڑکی نہیں دیکھی۔ مانا کہ اُجلے چہرے اکثر دھوکہ بھی دے جاتے ہیں۔ میں نے بہت لوگوں کی آنکھیں غور سے دیکھی ہیں۔ مجھے آنکھیں پڑھنے کا ہنر آتا ہے۔ اُم فروا کی آنکھیں ایک سچی مومنہ والی آنکھیں ہیں بلال۔ تمہارے ساتھ بھی تو رہ رہی ہے۔ تم نے اس کی آنکھیں نہیں پڑھیں؟''

''ملک صاحب میں نے تو بس اس کے بارے میں اتنا جانا ہے کہ دن کے بارہ گھنٹوں میں سے آٹھ گھنٹے وہ عبادت الٰہی میں مشغول رہتی ہے۔''

''کیا ایسی لڑکی تم نے پہلے کبھی دیکھی؟''

''نہیں دیکھی ملک صاحب! شاید یہی وجہ تھی کہ جس مقصد کے لیے میں اسے لایا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا ارادہ بدل گیا۔ میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا۔ اس کی وجہ سے میں بدل گیا۔ میرے اندر کے کسی کونے کھدرے میں ایک اچھا انسان موجود تھا۔ اس نے اُسے اَن کہے احساس سے جھنجوڑ ڈالا۔ تب میں ایسے ہڑبڑایا جیسے کسی نے مجھے سو واٹ کا کرنٹ لگا دیا ہو۔'' دھوپ کی حدت بڑھ رہی تھی۔ اُم فروا کب کی اندر جا چکی تھی۔

''ملک صاحب اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ دونوں اندر کی جانب بڑھنے لگے۔

''میں بھی آج اسی لیے فیکٹری نہیں گیا کیونکہ تمہیں چند باتیں سمجھانی تھیں۔ تم بلا وجہ لال حویلی سے باہر نہ نکلنا۔ تم نے سم تبدیل کر لی؟''

''جی ہاں میرے پاس ایک دوسری سم بھی تھی۔''

''پھر بھی احتیاطاً تم ان پر فون نمبر اٹینڈ نہیں کرو گے۔'' دونوں باتیں کرتے ہوئے ہال میں پہنچ گئے تھے۔ اُم فروا بیڈ روم میں تھی اور دروازہ بند تھا۔ ملک مصطفیٰ علی صوفے پر بیٹھ گئے۔ بلال حمید فریج سے کولڈ ڈرنک نکال لایا۔ ملک مصطفیٰ علی نے اُس کے ہاتھ سے گلاس پکڑ لیا۔ بلال حمید اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔

''بلال یہاں پر تم بالکل محفوظ ہو۔''

''ملک صاحب فیری سے لیے گئے چار لاکھ میرے پاس موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں وہ پیسے میں اُسے جلدی پہنچا دوں۔''

''میں تمہارے ساتھ اُس عورت کے پاس چلوں گا اور اُسے اچھی طرح ذہن نشین کرادوں گا۔ اگر تب بھی نہ مانی تو اُس کا تماشا زمانہ دیکھے گا۔ ایسا کیس بنوا کر تا حیات سلاخوں کے پیچھے ڈلواؤں گا کہ تمام عمر ایڑیاں رگڑتی رہے گی۔ وہ جو کاروبار کررہی ہے، اُس پر تو ویسے ہی کیس ہوسکتا ہے۔ معصوم، مجبور لڑکیوں کو اس کام میں ڈالتی ہے اور اپنی من چاہی رقم بٹورتی ہے۔ مردوں کو گناہ کے لیے اُکساتی ہے۔ وہ اس عیاشی کے لیے جانے کہاں کہاں سے، کس کس طریقے سے کمایا پیسہ اُس عورت کی جھولی میں ڈالتے ہوں گے۔ اپنی بیویوں کے پرس خالی کرتے ہوں گے۔ اُن کا زیور اڑا لیتے ہوں گے۔ اُن کے گھروں میں جانے کتنی لڑائیاں ہوتی ہوں گی اور خدا کے مجرم الگ!'' بولتے بولتے ملک مصطفیٰ علی ایک لمحے کو کانپ گئے۔ انہوں نے بھی تو ایسے گناہِ کبیرہ بہت کیے تھے۔ کیا انہیں خدا یاد نہیں تھا؟ جب وہ چھپ کر برائی کرتے تھے تو خدا انہیں نہیں دیکھتا تھا؟ آج وہ غلط کو غلط ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر اپنی باری پر کہاں تھے۔''

کوئی انہیں اندر سے جھنجوڑ رہا تھا۔ اُن کی چوڑی پیشانی پر پسینے کے قطرے اُتر آئے۔ بلال حمید سے اُم فروا کے متعلق سُن کر پھر جب وہ اُم فروا سے ملے تو اچانک سے یکسر وہ بدل گئے۔ تب انہیں خود سے بیزاری محسوس ہونے لگی تھی۔ اگر کسی نے صراطِ مستقیم کے راستے پر چلنا ہے تو خدا کو پہچانے، قرآن پاک میں اللہ کے بتائے ہوئے احکامات پر عمل کرے۔ اگر ایسا بھی نہیں کرسکتا تو اللہ کی بندی اُم فروا کو دیکھے۔ مولوی ابراہیم اور اُن کے بیٹے اسماعیل کو دیکھے۔ متقی پرہیز گاروں کی بیٹھک میں بیٹھے۔ زاہدوں، عابدوں کے پاس جائیں، وہاں خدا ہوگا۔ اُن سے ملے انہیں محسوس کرے جنہیں ہم نہیں دیکھ پاتے لیکن وہ تو ہمیں دیکھ لیتے ہیں۔ اُن کی موجودگی کی گواہی بار بار دل دیتا ہے۔ اُن کی خوشبو ہمارے اندھیرے دل کو منور کر جاتی ہے۔ ملک مصطفیٰ علی کے بھی کچھ ایسے جذبات تھے۔ ''بلال تم دو چار دن رُک جاؤ۔ میں اپنے طور پر اُس عورت اور اُس کے پچھلے سلسلے اُس کی اپروچ کا پتا کراتا ہوں تب اُس کے ساتھ بات کر کے مزہ بھی آئے گا۔ اُسے پتا بھی تو چلے کہ اب کوئی اُس کی ٹکر کا آیا ہے۔''

''ملک صاحب اُس کی پہنچ بہت دور دور تک ہے۔ کئی کو تو میں بھی جانتا ہوں۔ وہ سب بڑے بڑے سیاست دان، بیوروکریٹ، معروف کمپنیوں کے مالکان، پولیس کے اعلیٰ افسران فیری کے تلوے چاٹتے ہیں۔ اب تک وہ منجھی ہوئی شکارن بن چکی ہے یہ سبھی لوگ اُس کی ڈھال بنے ہوئے ہیں۔ اسی لیے تو دندناتی پھرتی ہے۔ وہ خود میں بڑا دم خم سمجھتی ہے۔ اس ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والوں کی وجہ سے۔''

''میں اس عورت کے خلاف ثبوت اکٹھے کر کے اسے عبرت ناک سزا دلواؤں گا تاکہ آئندہ وہ کسی مجبور لڑکی کو تباہ نہ کرسکے۔'' ''اگر اس ملک کے کرتا دھرتا بُرے لوگ ہیں تو اچھے لوگ بھی ضرور ہیں۔ کوئی تو ایسی عورت کو اس کے انجام تک پہنچائے گا۔''

''ملک صاحب خدا آپ کو ہمت دے۔''

''بلال اُم فروا کا خیال رکھنا۔'' ملک مصطفیٰ علی نے بغور بلال حمید کی طرف دیکھا۔

(عشق کی راہداریوں میں، زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتے اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط، انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

اس کی ساس نے بالکل درست کہا تھا کہ ان کی دونوں بہوؤں نے اپنی اپنی تعلیم سسرال آ کر ہی مکمل کی تھی، مگر وہ یہ اہم بات فراموش کر گئیں کہ ان دونوں کے شوہر یہیں کراچی میں سیٹل تھے اور دامے درمے سخنے قدمے جب جہاں ضرورت ہو......

ہاؤس وائف اور ورکنگ وومین کی زندگی کا فسانہ، ناولٹ کی صورت

بس میں نے کہہ دیا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ تہنیت مسلسل جھنجلا رہی تھی۔ اسے اپنی امی پر غصہ آ رہا تھا۔

''یہ شادی نہیں ہو سکتی۔'' شارب نے کارپٹ پر لیٹے لیٹے ہانک لگائی۔

''تم تو چپ ہی رہو۔'' تہنیت کا ہاتھ شارب کی طرف بڑھا، وہ چوکنا تھا، فوراً ہی دوسری طرف کھسک لیا۔

''ایک تو میں تمہارا ساتھ دے رہا ہوں اور تم...... احسان فراموش۔'' اس نے تہنیت کے غصے کو ہوا دی۔

''میں نے کب کسی سے مدد کی درخواست کی ہے۔ نہیں چاہیے مجھے کسی کا احسان۔ میں خود اپنے لیے......''

''ہاں، ہاں اپنے حق کے لیے لڑ سکتی ہو۔ ایسا کرو چیف جسٹس اور وکلاء کی طرح کامیاب تحریک چلاؤ، شاباش۔'' شارب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے لمبی تقریر کر ڈالی۔

''شارب!'' امی نے گھورا۔

''ہاں چلاؤ گی، تحریک بھی چلاؤں گی۔ میں لڑ سکتی ہوں اور، اور مر بھی سکتی ہوں۔''

''شاباش کیا تقریر کی ہے۔ میں لڑ سکتی ہوں اور لڑا بھی سکتی ہوں۔'' وہ ایک مرتبہ پھر بولا۔

''لڑا تو نہیں سکتی البتہ مار سکتی ہوں اور وہ بھی تمہیں۔'' وہ اس کو مارنے کے لیے اٹھی، لیکن شارب کہاں آسانی سے ہاتھ آنے والا تھا۔

وہ خود ہی اسے نہ پکڑ پائی اور سامنے پڑی تپائی سے ٹھوکر کھا کر وہیں بیٹھ گئی۔ دل جو ویسے ہی رونے پر آمادہ تھا، اس ذرا سی ٹھیس نے کام آسان کر دیا اور وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔

''تہنیت بیٹا کیا ہوا؟ کیا زور سے چوٹ لگ گئی ہے۔'' امی فوراً ہی قریب آ گئیں۔ شارب بھی دوڑا آیا۔

''کیا ہوا، کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں ہوا، ہوگا کیا، مروں گی نہیں۔'' وہ

جھنجلائی۔

''خدا نہ کرے، ایسی بے تکی باتیں کیوں نکال رہی ہو منہ سے۔'' امی نے گھر کا۔

''ساری بے تکی ہی باتیں ہو رہی ہیں گھر میں، کتنی مشکل سے ایڈمیشن ملا تھا، مجھے۔ کیا کیا منصوبے بنائے تھے میں نے، اپنی تعلیم کے اور آپ نے لے کر سب خاک میں ملا دیے۔'' وہ اب زور و شور سے رو رہی تھی۔

''میں نے تو بیٹا تمہارے بھلے ہی کے لیے سب کیا ہے، پھر تم سے پوچھا بھی تو تھا، تب تو تم نے کچھ نہیں کہا۔'' امی اس کے رونے سے پریشان تھیں۔

''تو اب بھی کیا کہہ رہی ہوں۔'' وہ سسکی۔

''ارے تو پھر یہ رونا دھونا؟'' امی کی سمجھ میں بات نہیں آ رہی تھی۔

''آپ نے جو چاہا کیا، میں خاموش رہی کہ نہیں، مگر اب آپ ان بیگم صاحبہ کے حکم پر بلاوجہ چٹ منگنی پٹ بیاہ پر کیوں راضی ہو گئیں۔''

امی اس کے ان بیگم صاحبہ کہنے پر اپنی بے ساختہ مسکراہٹ نا روک پائیں۔

''کیا بات ہے بھئی، بلے بلے، ابھی سے ساس کو القاب و آداب کے ساتھ یاد کرتی ہو۔ تم واقعی قوم کی قابلِ فخر بیٹی ہو۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''ماروں گی میں تم کو، آپ سمجھالیں اس کو امی۔ ورنہ یہ بہت بُرا پٹے گا۔''

''اچھا بھی پٹتے ہیں امی جی۔'' شارب کی معصومیت دیکھنے والی تھی۔

''شارب بُری بات ہے بیٹے۔ بہن کو اور وہ بھی مہمان بہن کو کوئی ستاتا ہے۔ بہت یاد کرو گے جب چلی جائے گی۔'' امی نے شارب کو سمجھایا۔

''یہی تو، یہی تو بات ہے بیٹھے بٹھائے مہمان بنا دیا۔ اب میں خاک اپنی تعلیم جاری رکھ پاؤں گی۔ بی۔ اے کوئی گڑیا کا کھیل ہے۔ جان مارنی پڑتی ہے پڑھائی میں تب جا کر کہیں کچھ بن پاتا ہے انسان اور یہاں تو ابھی پورے دو سال مکمل کرنے میں باقی ہیں، آخر ان کو اتنی جلدی کیوں ہے۔''

''ہائے اڑنے بھی نا پائے تھے گرفتار ہم ہوئے۔'' شارب کو اب جانے کون کون سے مصرعے یاد آ رہے تھے۔

''امی آپ کو پڑھانے کا بھی شوق ہے اور گھر سے بھگانے کا بھی۔''

''بیٹیاں تو ہوتی ہی ہیں پرایا دھن، انہیں رخصت کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہی دستور ہے زمانے کا۔'' امی نے اسے کھینچ کر گلے لگا لیا۔ ''تم کیا جانو میرے دل کی حالت، یہ تو تم تب سمجھو گی جب خود ماں بنو گی اور میری جگہ پر ہو گی۔ میں نے تو کوئی کام بھی تمہارے پوچھے بغیر نہیں کیا۔ حد تو یہ ہے کہ خود فراز کی امی سے کہا کہ لڑکی لڑکے کا ایک دوسرے کو دیکھ لینا بہتر ہوتا ہے۔''

''کہا تھا کہ نہیں، جواب دو۔ تم نے اسے دیکھ لیا پھر تم سے پوچھ کر جواب بھجوایا اور تم بھی یہاں پڑھ رہی ہو، وہ بھی وہاں لندن میں پڑھ رہا ہے۔''

''تو پڑھتا رہے یہ بلاوجہ...... ہوں'' اس نے سر جھکایا اور جملہ مکمل کیے بغیر سب کچھ کہہ گئی۔

دراصل وہ سمجھی تھی کہ اب صرف بات پکی ہو گی۔ فراز سے اس کے والدین مطمئن تھے اور خود تہنیت کو بھی اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی، البتہ شارب کو وہ جیسا لگتا تھا اور تہنیت اس کی شرارت سمجھنے کے باوجود بھی کبھی چڑ جاتی تھی اور اب جو یہ نیا شوشا چھوڑا گیا تھا کہ صرف بات طے نہ ہو، نکاح بھی ساتھ ہی ہو جائے۔ ایک تو اس سے بندھن مضبوط ہو گا دوسرے تہنیت کا ویزا بھی آسانی سے لگ

جائے گا۔

تہنیت کو سخت اختلاف تھا۔ اس کو اپنی تعلیم یہیں مکمل کرنی تھی اور اس کا لندن امریکا کہیں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اپنی دوستوں، رشتے داروں کے باہر جانے کے کیریئر پر ہنستی تھی، کیا نہیں ہے یہاں؟ یہ ملک جنت ہے اور میں اپنی جنت کیوں چھوڑ کر جاؤں۔ پر جب سے 9/11 کے بعد سے مسلمانوں پر خاص طور پر مسلمان نوجوانوں پر گزرنے والے سخت حالات سنتی تو اور اس کا دل وہاں سے ہٹ جاتا۔

امی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب تہنیت چاہتی کیا ہے، اس لیے ذرا جھنجلا کر بولیں۔

''جو چاہتی ہو کھل کر کہو۔''

''میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ نے جو یہ...... اپنے نکاح کی بات ان سے کرتے ہوئے اسے حجاب آرہا تھا۔

''بیٹا جب ہاں کرنے کا ارادہ ہی کرلیا تو وہ جو رسم بھی چاہے کریں۔'' امی اب اس کی بات سمجھی تھیں۔

''مگر کیوں امی ابھی کیوں؟''

''بیٹا نکاح ایک مضبوط بندھن ہے اور تم کیوں پریشان ہو۔ تمہارے پاپا اور میں جب مطمئن ہوئے ہیں تب ہی تو بات طے کی ہے۔ پھر اچھا ہے تمہارے ویزے وغیرہ کا مسئلہ بھی آسان ہو جائے گا۔''

''جب مجھے کہیں جانا ہی نہیں تو ویزے کا کیا سوال؟''

''کیوں؟ جانا کیوں نہیں ہے تمہیں، پیا کے گھر تو جانا ہی ہوگا۔'' شارب پھر بیچ میں کودا۔

''امی آپ اسے تو منع کریں۔'' وہ زور سے چیخی۔

''اُف، بنا تو کوئی دیکھے، حالاں کہ کچھ دنوں بعد خود ہی گاتی آؤ گی، پیا کا گھر پیارا لگے۔''

''کبھی نہیں، مجھے اپنے گھر سے پیارا اور کوئی گھر لگ ہی نہیں سکتا۔''

''ایسے نہیں کہتے بیٹا، وہ بھی تو تمہارا گھر ہوگا۔'' امی نے سمجھایا۔

''تو کیا میرا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں؟'' وہ اداس ہوگئی۔

''نہیں، ماں باپ کا گھر تو اپنا ہوتا ہی ہے، مگر لڑکیوں کا اصل گھر ان کے پیا کا گھر ہوتا ہے۔'' شارب نے امی کی بات پورے ہونے سے پہلے کہا۔

''تمہیں ان معاملات کی بڑی سمجھ داری آگئی ہے۔'' وہ بھائی سے الجھی۔

''اچھی بات ہے بیٹا، بھائی سمجھا رہا ہے تو سمجھو۔ ہم سب چاہتے ہیں تمہارے لیے وہ گھر جنت بن جائے۔ تم سکھی رہو۔''

''دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔'' شارب نے ہاتھ اٹھا کر دعا مکمل کی۔

اس مرتبہ تو وہ ہنس پڑی۔ ''اچھا دادی اماں۔''

☆......☆......☆

تہنیت کی ہونے والی ساس بہت سمجھ دار سی خاتون تھیں۔ فراز سے بڑے دونوں بیٹوں کی شادیاں کرچکی تھیں۔ ان کی دونوں بہوئیں نا صرف پڑھی لکھی تھیں بلکہ جاب بھی کررہی تھیں۔ سب سے بڑی نوشین ڈاکٹر تھی اور دوسری اریبہ ایک کالج میں پڑھا رہی تھی۔ وہ نئے زمانے کے تقاضوں سے پوری طرح واقف تھیں، اسی لیے جب انہوں نے نکاح کی تجویز پیش کی تو تہنیت کے والدین کے پاس انکار کا کوئی جواز ہی نہیں تھا، سوائے اس کے کہ تہنیت ابھی پڑھ رہی ہے۔ پڑھائی ڈسٹرب ہوگی۔''

''ارے یہ کیا کہا آپ نے؟ یہ جو نوشین صاحبہ ہیں، یہ میڈیکل کے چوتھے سال میں تھیں، جب رخصت ہو کر ہمارے گھر آئیں۔ نا صرف تعلیم مکمل کی بلکہ ہاؤس جاب کی ٹف روٹین بھی نبھائی اور اب ماشاء اللہ جاب کر رہی ہیں اور اریبہ صاحبہ نے بھی اپنا ماسٹرز اپنے گھر میں آ کر ہی پورا کیا تھا اور پوچھ لیں دونوں سامنے ہیں۔ میں نے بیٹی کہا تو بیٹی سمجھا بھی، تبھی تو زندگی بڑی سبک خرامی سے اپنا سفر طے کر رہی ہے۔ سارے مرحلے سامنے ہی طے ہو رہے ہیں، سکون سے رسان سے۔ نوشین کا میکہ اسلام آباد میں ہے اور اریبہ کے والدین اور بھائی سب سعودی عرب میں رہتے ہیں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ ان شاء اللہ کسی قسم کی کوئی پریشانی کا ذکر تک نہیں سنیں گے آپ اور علم حاصل کرنا وہ بھی ہمارے گھر میں، کیا مشکل ہے۔ اسے وہاں علم دوست ماحول ملے گا۔''

ہاں کرتے ہی بن پڑی۔ بڑی دھوم دھام سے نکاح ہوا۔ نوشین نے تہنیت کو ایک سیل فون لا کر دیا۔

''یہ فراز نے بھیجا ہے تمہارے لیے، ہائے ہائے میرا بیچارا دیور، کیسی پڑھائی، کہاں کی پڑھائی بس اب تو سبق محبت رٹ رہا ہے۔''

''اسے تو تم سے وہ ہو گیا ہے، وہ کیا کہتے ہیں، بھابی۔'' اسے اریبہ نے بھی مزا لیا۔

''Love in first sight'' نوشین کھلکھلائی۔

دونوں جٹھانیاں بہت اچھی تھیں، دوستانہ ماحول میں چھیڑ چھاڑ کرتی تھیں۔ تہنیت کو دونوں ہی اچھی لگیں، پھر ساس جو کہ عید تہوار ہی کا نہیں، گرمی، سردی، سالگرہ اور پاس ہونے پر ہر موقع کا خیال رکھ رہی تھیں۔

اُس دن جب تہنیت اپنی عزیز از جان دوست طیبہ کے ساتھ گھر میں داخل ہو رہی تھی تو وہ اپنی گاڑی سے آموں کی پیٹی اتروا رہی تھیں، تہنیت کے سلام کے جواب میں انہوں نے بڑی گرمجوشی سے طیبہ کو بھی تہنیت کے ساتھ ہی گلے لگا لیا، پھر پاس ہی پڑے شاپر زاٹھا کر تہنیت کو پکڑاتے ہوئے بولیں۔

''گرمی بہت ہو رہی تھی میں نے لان کے کچھ نئے پرنٹ دیکھے تو تمہارے لیے بھی لیتی آئی۔ اب خدا کرے، تمہیں بھی پسند آ جائیں۔''

''آپ ہر دفعہ اتنا تکلف کیوں کرتی ہیں۔'' امی، آم کی پیٹی دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں۔ ''کہاں اچھا لگتا ہے بیٹی کے سسرال سے کچھ نہ کچھ وصول کرتے رہنا۔''

''بھئی، ہماری تہنیت کو آم پسند ہیں تو یہ میں اپنی بہو کے لیے لائی ہوں۔ آپ پلیز کوئی خیال نہ کریں۔'' وہ ہنس کر بولیں۔

گرچہ جلدی میں تھیں، مگر پھر بھی امی کے ساتھ ساتھ تہنیت اور طیبہ بھی ان کی خاطر مدارت میں لگ گئیں اور ان کے جاتے ساتھ ہی طیبہ نے بڑے بھولپن سے تہنیت کی امی سے کہا۔

''آنٹی میرے لیے بھی ایک ایسی ہی ساس ڈھونڈ یے، تہنیت کے تو مزے ہیں۔''

وہ گل احمد کے سوٹ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی جن کے رنگ اور پرنٹ پکار پکار کر اپنی قیمت کا اعلان کر رہے تھے۔

طے تو یہ ہوا تھا کہ رخصتی دو سال بعد ہو گی مگر فراز کی بے تابیاں تہنیت کو کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھیں اور وہی ہوا، ایک سال ہی گزرا تھا کہ ایک دن فراز کی ممی نے یہاں آ کر یہ مژدہ سنایا کہ فراز عید پر آ رہا ہے، وہاں یہ بھی کہہ دیا کہ آپ لوگ تیاری رکھیں، بس میں اپنی بہو کو اپنے گھر لے جاؤں گی۔

''مگر ابھی، اتنی جلدی، کیا تیاری ہو سکے گی بھلا۔'' امی بوکھلا سی گئیں۔

''کوئی ضرورت ہی نہیں، کسی قسم کی تیاری کی۔ ہمیں واقعی کچھ نہیں چاہیے، سوائے اپنی بیٹی کے اور آپ تو بس اپنے دل کو تیار کریں، بیٹی کو رخصت کرنے کے لیے۔'' انہوں نے بڑے سبھاؤ سے سمجھایا۔

پھر تو سارے اگر مگر دھرے ہی رہ گئے۔ فراز بھی آڑ چکے تھے کہ دل والے دلہنیا لے جائیں گے، سو عید کے چاند شادی طے ہو ہی گئی۔

☆......☆......☆

''آپ تو حد کرتے ہیں کوئی ایسے بھی کرتا ہے۔'' تہنیت نے فون پر شکوہ کیا۔

''واقعی یار ایسے کہاں کوئی کرتا ہے، مزا تو جب تھا جب ہم اور تم عید کا چاند ساتھ ساتھ دیکھتے، کوئی رمضان میں شادی کرنا منع تھوڑی ہے، میں بات کرتا ہوں ممی سے۔'' اس نے بات کو دوسرا ہی رنگ دے دیا۔

''نہیں، نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے ممی سے بات کرنے کی۔'' وہ گھبرا کر بولی۔

''اس کا مطلب ہے عید کے فوراً بعد ہی، ٹھیک ہے چلو جس میں تم خوش۔'' وہ بات پکڑ رہا تھا اور مزے لے رہا تھا۔

وہ کیا کہتی یہ تو ہوتا ہی آیا ہے کہ:

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

تیاریاں شروع ہو گئیں۔ وہ امی کو تو اکثر منع کر دیتی تھی۔ آپ خود ہی کر لیں، میرے پاس شاپنگ جیسی فضولیات کے لیے وقت نہیں، مگر جب ممی کا فون آتا کہ میں آ رہی ہوں، تہنیت سے کہیے تیار رہے تو بچاری امی جی جی ہی کہہ پاتیں۔ خود تہنیت بھی اٹھا لیتی تو جی ٹھیک ہے ہی کہتی، مگر ریسور رکھنے کے بعد امی سے دیر تک جھگڑتی۔

''کل میرا گرینڈ ٹیسٹ ہے اور ان کی ذرا سی شاپنگ آپ کو پتا ہے صبح سے شام تک کی چھٹی۔'' وہ چڑ لی۔

''ویسے لنچ زبردست کراتی ہیں۔'' شارب اگر کہیں پاس ہوتا تو بولنے سے نا چوکتا۔

''تو تم چلے جاؤ شاپنگ اور لنچ دونوں کے مزے لینے۔''

''ایسے ہمارے نصیب کہاں، وہ میری ساس ہوتیں تو میں......'' وہ شرمانے کی ایکٹنگ کرتا۔

''جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے، جہاں سیل پر فراز مستقبل کے خوب صورت خواب دہراتا رہتا وہیں، شارب جی بھر کر ستاتا تھا۔ وہ سوچتی میں چلی جاؤں گی تو کیا شارب مجھے ذرا بھی مس نہیں کرے گا۔ اتنا تو ستاتا ہے مگر جب کارڈ چھپ کر آئے تو وہ اس کا کارڈ ہنس ہنس کر پڑھ رہا تھا اور سامنے رکھی سیٹ پر جس میں اعزاء اور اقربا کے ساتھ ساتھ احباب اور دیگر ملنے جلنے والوں کے نام لکھے تھے ان پر ٹک بھی لگا رہا تھا اور ساتھ مسلسل گنگنا بھی رہا تھا، گھر سے ڈولا چلا لاڈلی کا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ یکا یک دل بھر سا آیا، وہ رونے لگی۔ تبھی شارب سب چھوڑ کر بھاگا آیا اور اس کو اپنے کندھے سے لگا کر بہت آہستہ سے بولا جانتی ہو۔

"Why girls are married and to go a stranger's home?"
Because they are blessed angels of almighty.
After filling their own homes with colours of happiness they

"go to colour other home"

(لڑکیاں شادی ہو کر ایک اجنبی کے گھر میں کیوں جاتی ہیں؟ کیونکہ لڑکیاں خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔ اپنے گھروں میں خوشیاں بکھیرنے کے بعد وہ دوسروں کے گھروں کو روشن کرنے چلی جاتی ہیں)

وہ مسکرانے لگی، مگر بھائی کی آنکھیں نم نم ہی رہیں۔ بہن بیٹیاں رخصت کرنا ایسا آسان بھی نہیں، مگر کرنا پڑتا ہے کہ قانون قدرت ہے۔

☆......☆......☆

تہنیت کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی، ہر تقریب شاندار رہی۔ مہندی، مایوں، شادی، ولیمہ حتیٰ کہ چوتھی چالا، ساری رسمیں ہوئیں اور بہت خوب صورتی سے منائی گئیں۔ سب نے بہت تعریف کی۔ فراز اور تہنیت کی جوڑی سب ہی کو اچھی لگی۔

شادی کے بعد میکے سسرال کی دعوتوں میں فراز کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ تہنیت کی پڑھائی کا بھی کافی حرج ہو رہا تھا۔ اسے بھی کالج جانا ہی تھا۔ ہنی مون اگلی ملاقات پر ٹل گیا۔

''کوئی بات نہیں بیوی، اچھا ہے ہم پھر سے نئے نئے ہو جائیں گے۔ جب کچھ عرصے بعد ہنی مون منائیں گے۔'' اس نے بڑی محبت سے اس کے گال چھوتے ہوئے کہا۔

وہ بہت اُداس تھی، اسے تو بات بات پر رونا آ رہا تھا۔ کمبخت دل ان چند ہی دنوں میں کوئی اور راگ الاپ رہا تھا۔ کیسی پڑھائی کہاں کی پڑھائی؟ وہ اب پڑھنے لکھنے سے یکسر منکر ہو چلا تھا، وہ رونے لگی۔

''دیکھو بھئی اگر یوں روؤ گی تو میں تمہیں اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔'' وہ مذاق کر رہا تھا، لندن ساتھ لے جانا اب اتنا آسان بھی نہیں رہا ہے، تہنیت کتنے ہی لوگوں سے واقف تھی جو ویزے کے انتظار میں بیٹھے تھے، مگر فوراً بولی۔

''ٹھیک ہے لے چلیں۔''

''ایں۔'' وہ چونکا ''اور وہ جو تم پڑھنے پڑھانے کی رٹ لگائے ہوئے تھیں۔'' وہ ہنسا۔

''وہ! وہ میرا نادان ماضی تھا۔'' وہ بھی ہنسی۔

''اچھا آؤ ذرا سمجھ دار مستقبل کی باتیں کرتے ہیں۔'' اس نے تہنیت کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو وہ کھنچی چلی آئی، مگر مصنوعی خفگی دکھاتے ہوئے بولی۔

''ذرا آرام سے باتیں کریں۔''

''تمہارا ماضی ہی نہیں تم بھی بالکل نادان ہو، بھلا یہ باتیں کوئی آرام سے کیسے کر سکتا ہے۔'' وہ اب مذاق اڑا رہا تھا۔

مگر اس کا دل جو ذرا ذرا سی باتوں پر روٹھنے کا عادی تھا جیسے سب کچھ بھول کر بس اس کے ساتھ کے لیے اختیار ہی کھوئے جا رہا تھا۔ وہ ہار رہی تھی مگر عجیب ہار تھی جس میں اسے کچھ بھی بُرا نہیں لگ رہا تھا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی مجھے بس آپ کے ساتھ ہی جانا ہے۔''

وہ بھی اسے چھوڑ کر جاتے ہوئے خوش کہاں تھا، مگر جانا تو تھا، سو وہ چلا گیا اور تہنیت کو لگا وہ اندر سے بالکل خالی ہو گئی ہے۔

وہ کالج جانے لگی، گھر میں تین گاڑیاں تھیں، مگر سب کے روٹین سیٹ تھے۔ اس کی ساس نے بالکل درست کہا تھا کہ ان کی دونوں بہوؤں نے اپنی اپنی تعلیم سسرال آ کر ہی مکمل کی تھی، مگر وہ یہ اہم بات فراموش کر گئیں کہ ان دونوں کے شوہر یہیں کراچی میں سیٹل تھے اور دامے درمے سخنے قدمے جب جہاں ضرورت ہو، مدد کے لیے تیار رہتے تھے، جبکہ تہنیت کا معاملہ دوسرا تھا۔ اسے اپنے ہر ہر کام اور ہر مسئلے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنا ہوتا تھا۔ صبح سب ہی جلدی جلدی مچا کر نکلتے تھے۔ ایک گاڑی ابرار کے

پاس ہوتی تھی، دوسری نوشین لے جاتی تھی۔ جواد اپنی گاڑی میں پہلے اپنی بیوی اریبہ کو چھوڑتا تھا، پھر خود جاتا تھا۔ تہنیت کو سب ہی نے پیشکش کی، کچھ دن چھوڑا بھی، مگر مصیبت یہ بھی ہر ایک کو دوسرے سے الگ سمت میں جانا ہوتا تھا۔ شہر میں صبح وشام کیا دن کے کسی بھی وقت تیزی سے دور دور مختلف سمتوں میں سفر آسان نہیں تھا، عموماً گاڑیاں بمپر سے بمپر ملائے چلتی تھیں۔ لازمی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ کسی کو چھوڑتے ہوئے خود اپنا لیٹ ہو جانا معمول بن جاتا تھا۔

تہنیت یہ مسائل سمجھ رہی تھی اور جانتی تھی کہ یہ کوئی ایک دن کی تو بات ہے نہیں، مگر وہ کرے تو کیا کرے، یہ وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

''تم پہلے کیسے آتی جاتی تھیں۔'' نوشین نے پوچھا۔

''پاپا ڈراپ کر دیتے تھے، کبھی وین سے آ جاتی تھی اور کبھی کبھی پوائنٹ سے بھی آتی جاتی تھی۔''

''لو پھر تو مسئلہ حل ہوا، پوائنٹ چلتے ہیں تو یہاں سے بھی ضرور چلتے ہوں گے۔'' نوشین نے کہا۔

''ہاں شاید چلتے تو ہوں گے۔'' وہ اور کیا کہتی۔

''پوچھنا اپنی دوستوں سے کوئی شاید قریب رہتی ہو۔'' اریبہ نے بھی مشورہ دیا۔

مگر اتفاق سے اس کی کوئی دوست اس طرف نہیں آتی تھی۔ پوائنٹ کا بھی پتا نہیں چل سکا، پھر وین کی بات ہوئی اور بالآخر ایک ٹیکسی لگوا دی گئی۔

اس نے فراز سے اپنا دکھ بتایا۔

''ارے جانم یہ بھی کوئی مسئلہ ہے بھلا۔ تم گاڑی لے لو اور خود ڈرائیو کرو۔''

''نہیں مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''کس سے ڈر لگتا ہے جناب کو، گاڑی سے یا......''

فلاپی ڈسک کی ایجاد

1970ء میں امریکہ کے مشہور ادارے بی ایم نے کمپیوٹر کا ڈیٹا محفوظ کرنے کے لیے ایک نئی وضع کی پلاسٹک ڈسک کی ایجاد کا اعلان کیا۔ اس ڈسک کو ''فلاپی ڈسک'' کا نام دیا گیا۔ فلاپی ڈسک دراصل ایک جاپانی موجد ڈاکٹر یوشیرو ناکاماتس کی ایجاد بتائی جاتی ہے ڈاکٹر ناکاماتس نے اس ایجاد کا نظریہ 1950ء کی دہائی میں پیش کیا تھا۔ بعدازاں اس نے اپنی ایجاد کا کاپی رائٹ آئی بی ایم کو فروخت کر دیا تھا۔ آج دنیا کا تمام تر کمپیوٹر نیٹ ورک 1970ء کی اسی ایجاد کے گرد گھوم رہا ہے۔

''گاڑی میں ڈرائیو نہیں کر سکتی۔ کبھی کر ہی نہیں پائی، حالاں کہ شارب نے کتنا سکھانا چاہا وہ نہیں جانتی تھی کہ ہر وقت لڑتے رہنے والے بھائی کے ذکر پر بھی اس کی آنکھیں نم نم سی ہو جائیں گی۔ وہ اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

''کیا ہوا۔''

''کچھ نہیں۔''

''پھر رو کیوں رہی ہو؟''

''ایسے ہی۔''

''ایسے ہی یا میں یاد آ رہا ہوں؟''

وہ چپ رہی، مگر دل ہاں ہاں کی گردان کرتا رہا۔

''یار کبھی تو خوش کر دیا کرو، سچ بول کر۔ چلو تم مت بتاؤ مگر میں بتاؤں میں تمہیں بہت یاد کرتا ہوں۔ ہر پل ہر لمحہ۔

ایک لطیفہ سنو گی، میرے دوست نے سنایا کہ اس کی بیوی آج کل پاکستان گئی ہوئی ہے۔ وہاں سے فون پر بات ہو رہی تھی تو اس نے پوچھا کہ آپ مجھے یاد کرتے ہیں۔ اس پر میرے دوست نے کہا، بہت۔

بیوی نے پوچھا، کب۔ لہجے میں اشتیاق ہی اشتیاق تھا۔

تو میرے دوست نے جواب دیا کہ ''صبح جب موزے نہیں ملتے۔'' وہ ہنس پڑا۔

وہ بھی ہنسنے لگی۔

مگر یار تم نے تو ابھی تک مجھے موزے دینے کی عادت ہی نہیں ڈالی، مگر میں تمہیں یاد کرتا ہوں۔ بہت۔ تم کچھ نہیں کہو گی۔'' وہ اپنے لہجے میں پیار سموئے پوچھ رہا تھا۔ اور اب اس کا موڈ بھی اچھا ہو گیا تھا اس لیے ہنس کر بولی۔

''بالکل یاد نہیں کرتی میں۔''

''اچھا۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''ہماری قسمت یہاں تو صبح ہو یا شام بس ایک ہی نام یاد رہتا ہے۔ سچ بتاؤ کبھی بھی نہیں، میں یاد نہیں آتا۔''

''کبھی بھولوں تو یاد کروں نا۔'' اس نے جلدی سے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ اسے معلوم تھا تھوڑی دیر میں دوبارہ کرے گا اور وہی ہوا۔

☆......☆......☆

اس رات وہ انتظار کرتی رہی، مگر معمول کے مطابق فون نہیں آیا۔ اس کا صبح ٹیسٹ تھا اور سر بخاری سے اس کی نہیں سب کی جان جاتی تھی، مگر دل بے ایمان ہو رہا تھا۔ کتاب سامنے کھلی تھی مگر وہ ایک حرف نہیں پڑھ رہی تھی۔ بس غائب دماغی سے کتاب کے اوراق الٹ پلٹ رہی تھی، پھر اس نے کتاب بند کی اور کھلی آنکھوں سے سپنے دیکھنے کے بجائے آنکھیں بند کر کے فراز کے ساتھ دور نکل گئی۔

اندر کے موسم کی رنگینی نے باہر کی فضا بھی بدل دی تھی کہ ہلکی ہلکی سی ٹپ ٹپ نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچی تو اس نے اپنے کمرے کی لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول لی، مٹی کی سوندھی سوندھی سی خوشبو اس نے زور سے سانس میں اتاری۔ موسم کی دلفریبی نے اسے خوش نہیں کیا تھا، اُداس کر دیا تھا۔

''پتا نہیں وہ اس وقت کیا کر رہا ہو گا؟''

تب ہی اس کے سیل کی مدھم ٹون گنگنانے لگی۔

مجھ میں ہے تو، تو ہی تو بسا۔

یہ فراز نے خود ہی سیٹ کیا تھا۔

''کہاں تھے آپ۔'' وہ فوراً بولی۔

''میں اب کہاں جا سکتا ہوں یار، تم میرا انتظار کر رہی تھیں نا۔'' وہ خوش دلی سے ہنسا۔

''نہیں، وہ بس بارش ہو رہی تھی تو......''

''تو......'' وہ اب ہنس رہا تھا، آخر وہ پکڑی گئی۔

پتا نہیں اس کے ہنسنے پر یا خود ہی اپنے آپ سے لڑ لڑ کر تھکنے پر وہ آج دل کی بات کہنے پر مجبور ہو گئی۔

''یہ ایسا کب تک چلے گا؟''

''کیسا؟''

''رات، ہوا اور بارش ہائے، یہ موسم اور یہ دوری۔'' وہ شوخ ہو رہا تھا۔

''آگے کچھ مت کہیں آپ کی کوئی مجبوری نہیں ہے۔'' وہ روہانسی سی ہو رہی تھی۔

''کیوں میری مجبوری کیوں نہیں ہے، میں آپ کی خاطر یہ جبر مسلسل سہ رہا ہوں۔''

''تو مت کہیں، میں نے کبھی نہیں کہا کہ......''

''بات مکمل کرو بی......وی۔'' وہ جملے کو کھینچ کر بولا۔ ''تم نے نہیں کہا تھا مجھے پڑھنا لکھنا ہے۔ سب سے آگے بڑھنا ہے۔''

''ہوں! میں کیا سب سے آگے بڑھوں گی مجھے

ایسا کوئی شوق نہیں، میں، میں تو سب جیسی بھی نہیں بن سکتی۔'' اس کے مذاق پر وہ دل شکستگی سے بولی۔

''کیا ہوا۔ کیا ہوا ہے بولو؟ کیا کسی نے کچھ کہا ہے۔'' وہ یکدم پریشان ہو گیا۔

''نہیں مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا، یہاں سب بہت اچھے ہیں۔'' وہ جھنجلا رہی تھی۔

• پھر اس کی یہ جھنجلاہٹ دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ جب بھی فون کرتا وہ اُکھڑے اُکھڑے ٹون میں جواب دیتی، وہ بھی الجھنے لگتا اور اب اکثر بات خفگی پر ختم ہوتی۔

''مسئلہ کیا ہے تمہارا؟'' وہ چڑ کر پوچھتا۔

وہ فون رکھ دیتی تو اور بھی افسردہ ہو جاتی۔ یہ مجھے کیا ہو جاتا ہے، میں اس سے بات کیوں نہیں کر پاتی۔ میں واقعی چاہتی کیا ہوں۔ پڑھائی الگ ڈسٹرب ہو رہی تھی، نا میں اِدھر کی رہی نا اُدھر کی۔ بلاوجہ یہ سب اس شادی کی جلدی جلدی کی وجہ سے ہوا ہے۔ سارا قصور ہی اسے فراز کا نظر آتا۔

یوں ہی جلتے کڑھتے اس کے امتحان شروع ہو گئے اور جس دن وہ آخری پیپر دے کر گھر آئی تو ایک نہیں دو دو خوشگوار سرپرائز منتظر تھے۔ نا صرف فراز آیا ہوا تھا بلکہ اس کا ویزا بھی لگ گیا تھا۔ وہ جس کام کو مشکل سمجھ رہی تھی، وہ خود بخود آسان ہو گیا تھا۔

وہ خوش تھی اور اتنی کہ خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی اور وہ اُس کے جگمگاتے چہرے پر خوشی کے سارے رنگ دیکھ رہا تھا اور اس کے قرب سے سرشار تھا۔

''مجھے پتا ہوتا کہ تم اتنی خوش ہو گی تو میں دیر ہونے ہی نہیں دیتا۔'' وہ ہنسا۔

''چھوڑیں یہ سب بہانے ہیں، اب مجھے کیا معلوم کہ وہاں آپ کی دلچسپیاں ہیں کیا کیا۔'' وہ بھی ہنسی۔

''ہیں؟'' وہ چونکا۔

''ایسے سوچتی ہو اپنے مجازی خدا کے بارے میں۔'' اس نے جھوٹ موٹ منہ پھلایا۔ ''اور میں بے وقوف تمہاری محبت میں وہ سب کچھ ہی کرتا رہا جو کبھی زندگی میں نہیں کیا۔''

''مثلاً'' اس نے مزے لیتے ہوئے پوچھا۔

''مثلاً مجھ جیسا شخص جسے کبھی کوئی شعر یاد نہیں ہوا، تمہاری خاطر کتنے ہی اشعار یاد کیے۔''

''یاد کیے۔'' اس نے بڑی ادا سے پوچھا۔

''نہیں پہلے ڈھونڈے پھر یاد کیے۔''

''اچھا پھر کبھی کچھ سنایا کیوں نہیں۔''

''سب سنائیں گے، دھیرج رکھو۔''

''نہیں ابھی سنائیں۔''

''اچھا۔''

اس سے ملنا تو اس سے یہ کہنا
تجھ سے پہلے میری نگاہوں میں
کوئی روپ اس طرح نہ اُترا تھا
تجھ سے آباد ہے خرابہ دل
ورنہ میں کس قدر اکیلا تھا

''واہ واہ کیا بات ہے۔ لگتا ہے سنانے کی اچھی پریکٹس ہے۔''

''ہائے سنو تو

وہ کہے گی کہ ان خطابوں سے اور
کس کس پہ جال ڈالے ہیں
تم یہ کہنا کہ پیش ساغر جم
اور سب مٹیوں کے پیالے ہیں

وہ باقاعدہ ایکٹنگ کر رہا تھا، وہ کھلکھلانے لگی۔

''کمال ہے تسی تو اچھے خاصے شاعر بن گئے ہو، ویسے تجربہ کاری جھلک رہی ہے۔'' وہ چھیڑ رہی تھی۔

''تجربہ کاری؟'' اس نے چونکنے کی ایکٹنگ کی۔

''اچھا ایسا ہے تو آگے بھی سنو۔''

عشق میں اے مبصرین کرام
یہی تکنیک کام آتی ہے
پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے اسے قریب کیا اور کہا۔
اور یہی لے کہ ڈوب جاتی ہے

وہ اب کہاں سن رہی تھی، وہ تو سوچ رہی تھی زندگی کتنی خوب صورت ہے، زندگی بہار کا نغمہ ہے۔ زندگی مست کردینے والا ساز ہے۔ زندگی خوشیوں بھرا گیت ہے اور اس کی آنکھیں سرور میں بند ہونے لگیں۔ کتنے دن کی بے قراری کو قرار سا آرہا تھا۔

☆......☆......☆

وہ لندن آگئی۔ زندگی کا یہ نیا رُخ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے جی لگا کر گھر پیارا گھر سجانا شروع کیا۔ پھر روز ٹی وی دیکھ کر اور امی سے پوچھ کر نئی نئی ریسی پیز ٹرائی کرنی شروع کردی۔

''یار تم تو زبردست ہو، کیا خوشبو آرہی ہے۔''

وہ سراہتا ہوا گھر میں داخل ہوتا تھا، پھر اس نے اپنے دوستوں سے بھی تعریفیں شروع کردیں۔ یوں ان کے بھی فرمائشی پروگرام شروع ہوگئے۔

زیادہ تر گھر سے بچھڑے Home Sickness کا شکار لڑکے تھے، وہ بہت خوش ہوتے تھے اور جی بھر کر تعریفیں کرتے تھے، تو وہ بھی خوش ہوجاتی تھی۔

''مجھے تو یہاں لگتا ہے کہ تمہارے یہ فل کیلوریز کے کھانے اور اتنی تعریفیں یار تم تو پھول کر کُپا ہوجاؤ گی۔''

''خوامخواہ، میں ہمیشہ ایسے ہی اسمارٹ رہوں گی۔'' وہ اترائی۔

''رہنا بھی ورنہ......'' اس نے دانستہ بات اُدھوری چھوڑ دی۔

''ورنہ کیا! آگے بولو۔''

''ورنہ مجھے مجبوراً اِدھر اُدھر دیکھنا پڑے گا۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''یہ مجھے دھمکی دی جارہی ہے تو چلو یوں ہی سہی، آج سے کھانا بنانا بند۔'' اس نے دونوں ہاتھ جھاڑے۔

''ارے نہیں، نہیں بیوی! میں تو بس یونہی کہہ رہا تھا۔ تم کھانے بناؤ، روز مزے مزے کے سب کو کھلاؤ، مگر خود پر رحم کھاؤ، تم مجھے یوں ہی اچھی لگتی ہو نازک، اسمارٹ، خوب صورت، دلربا۔''

''بس، بس، بس کریں۔ میں آپ کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔'' وہ ہنسی

''سمجھتی ہو نہ تو میری مجبوری بھی سمجھتی ہوگی، ایک شریف آدمی ہوں، کیا کروں بیوی کی تعریفیں کرتا رہتا ہوں، آخر گھر میں بھی تو رہنا ہے نا۔''

چہ چہ وہ اس کی چھیڑ چھاڑ سے لطف لیتی، سوچتی واقعی زندگی کے یہ رنگ کتنے خوب صورت ہیں۔

☆......☆......☆

پھر جیسے وہ اس روٹین سے کچھ اُکتانے سی لگی۔ ''ہر ویک اینڈ پر کوئی نہ کوئی موجود، ہماری تو کوئی پرائیویسی ہی نہیں رہی۔''

''اس ہفتے منظر اور حمیرا کا پروگرام ہے، ہماری طرف آنے کا۔'' وہ صبح آفس جاتے ہوئے بتانے لگا۔

''کیوں؟'' وہ بے ساختہ بولی۔

''ارے کیوں کی کیا بات ہے، منظر نے تم سے چکن کڑاہی کی فرمائش نہیں کی تھی، اُس دن۔'' وہ اس کی بات پر حیران تھا۔

''تو حمیرا سے کیوں نہیں کرتا، وہ یہ سب فرمائشیں۔ ہماری اپنی بھی کوئی زندگی ہے، کوئی لمحہ ہمارا اپنا ہی تو ہونا چاہیے کہ نہیں۔''

''کیا ہوگیا جان۔'' وہ واقعی حیران تھا۔ ''منظر

میرا اچھا دوست ہے اور حمیرا اسے بھی تو تمہاری اچھی بن رہی تھی۔ کوئی بات ہو گئی ہے کیا۔''

''یہ صرف منظر، حمیرا کی بات نہیں ہے، کبھی کوئی تو کبھی کوئی اور۔ یار کبھی کبھی تو ٹھیک ہے مگر ہر ویک اینڈ پر یہی بلا گلا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میرا جی چاہتا ہے بس ہم دونوں ہوں اور بس۔''

''ایں۔'' وہ چونکا۔ ''ہم تم ہوں گے یا دل ہوگا، بس۔ یہ بس مجھے اچھا لگا، تم تو کافی رومانٹک ہو رہی ہو، خیریت تو ہے۔'' وہ چڑا رہا تھا اور وہ چڑ گئی۔

اسے دیر ہو رہی تھی۔ وہ چلا گیا، وہ کڑھتی رہی، چڑتی رہی اکیلے، پھر تو یہ اکثر ہونے لگا۔ وہ چڑتی وہ سمجھاتا۔

''دیکھو یہ سب تم نے خود تو شروع کیا تھا۔ وہ سب محبت کرنے والے لوگ ہیں اور اس دیارِ غیر میں اپنائیت و محبت ہی سب کچھ ہے۔ یار یہاں یہی تفریح ہے، پھر سب تمہارا ساتھ دیتے ہیں۔''

''بس مجھے اچھا نہیں لگتا، ہر وقت بلا وجہ مجمع لگائے رکھنا۔''

''بُری بات ہے ایسے نہیں سوچتے۔'' وہ پیار سے سمجھانے لگتا۔

''مجھے لگنے لگا ہے کہ جیسے بس بے مقصد سی زندگی گزار رہی ہوں میں۔'' وہ اپنی سوچ خود نہیں پڑھ پا رہی تھی۔

''کیوں!! تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے۔'' وہ بہت پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

''ایسے ہی بس کوئی مقصد تو پیشِ نظر ہونا ہی چاہیے۔''

''تو ہے نہ مقصد تمہارے پاس، اپنے شوہر کو خوش رکھنا، اپنے گھر کو جنت بنانا۔ بیوی نیک بیبیوں کے یہی طور اطوار ہوتے ہیں۔''

''اچھا بس زیادہ دادا ابا بننے کی ضرورت نہیں ہے، کچھ اچھا سا مصرف بتائیں میرے وقت کا۔''

''ایسا کروں ایم ایس MS کرلوں۔''

وہ چونک سا گیا۔ ''کیوں خود کو مشکل میں پھنسا رہی ہو، اول تو اچھی یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہی مشکل ہے، پھر گھر داری کے ساتھ پڑھائی۔ چھوڑو یار بہت پڑھ لیا۔''

''نہیں میں پڑھنا چاہتی ہوں، میں اپنا ایک مقام بنانا چاہتی ہوں۔ اگر میں معاشرے کا کارآمد پرزہ بننا چاہتی ہوں، اپنی پڑھائی کو کام میں لانا چاہتی ہوں تو.....'' وہ جوش میں دلائل دے رہی تھی۔

''چلو جو تمہاری خوشی۔'' وہ خلاف توقع مان گیا اور اس نے بات ہی ختم کردی۔

پتا نہیں کیوں تہنیت اپنی بات منوانے پر خوش نہیں ہو پا رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا جیسے وہ خود سے ناراض ہو گئی ہو۔

''توبہ ہے یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔'' بلاوجہ وہ اپنے دل کی بدلتی ہوئی کیفیت پر خود حیران تھی۔

☆......☆......☆

پھر ایڈمیشن لینے اور پڑھائی شروع ہونے تک وہ جیسے اور سب کچھ بھول گئی، مگر گھرداری کے جھنجٹ سے نکلنا وہاں آسان نہیں تھا۔ اسے پہلی دفعہ یہ احساس شدت سے ہوا کہ پاکستان میں خواتین واقعی مزے میں ہیں۔ حالاں کہ خواب دیکھتی ہیں باہر جانے کے ہمیشہ، امریکہ، لندن میں دو، دو، چار، چار کیا ایک ماسی کا تصور بھی عبث ہے۔ یہ عیاشی تو پاکستان میں ہی ممکن ہے کہ ہر ہر کام کے لیے ماسیاں موجود ہیں۔ جھاڑو، پونچھا تو خواتین کو کیا یاد ہوں گے، کپڑے بھی واشنگ مشین میں ماسیاں ہی دھوتی ہیں۔ برتن توبہ توبہ ہاتھ خراب ہو جاتے ہیں، مگر ملک سے باہر کی زندگی بہت مختلف ہے، وہاں خود ہی

مالک خود ہی نوکر بنا پڑتا ہے۔
فراز اس کا ساتھ دیتا تھا، مگر زیادہ کام اسی کی ذے داری تھے۔ وہ تھکنے لگی تھی، مگر خود سے بھی اعتراف مشکل تھا۔ سومحنت کرتی رہی۔ سمسٹر ختم ہوا تو مانو جان میں جان آئی۔ تب ہی فراز نے یورپ کی سیر کا پروگرام بنالیا۔ بقول اس کے نماز محبت کی قضا واجب تھی۔ سو وہ نماز محبت ادا کرتا رہا اور وہ تتلی بنی اڑتی رہی۔ کھلکھلاتی رہی۔ اس کے اندر کی جذباتی لڑکی بار بار اسے احساس دلاتی رہی کہ بلاوجہ اس نے ضد کی۔ خوامخواہ خود کو اتنی خوب صورت زندگی سے دور رکھا، وہ ناز کرتی رہی وہ اس کے ناز اٹھاتا رہا۔
''تم مجھے بگاڑ دو گے۔'' وہ اٹھلائی۔
جان من تم نے مجھے سنوار دیا ہے۔'' وہ کہتا۔

☆......☆......☆

چھٹیاں بڑی جلدی ختم ہوگئیں۔ وہ چاہتا تھا واپس ہو جائے، وہ چاہتی تھی کچھ دن اور...... وہ اس کی بات ٹالنا کہاں چاہتا تھا، سو سیر لمبی ہوتی گئی۔
واپسی آکر اسے پہلی خبر، یہی ملی کے فراز کی جاب ختم ہوگئی۔ وہ پریشان ہوگئی۔
''کوئی بات نہیں جانم تو یہ نہیں اور سہی۔'' وہ مسکرا رہا تھا، تہنیت کو اس کی مسکراہٹ کے باوجود اس کے چہرے پر بکھرے افسردگی کے رنگ نظر آرہے تھے۔ یہ جاب اس نے بڑی مشکل سے، سخت مقابلے کے بعد حاصل کی تھی۔ اس کے یوں چلے جانے کا دُکھ تھا اسے۔ تہنیت کو خود پر غصہ آرہا تھا۔
زندگی نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا۔ وہ اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھرداری میں بھی الجھی رہنے لگی۔ فراز کو دوبارہ جاب مل گئی، مگر یہ جاب تھوڑی ٹف تھی۔ ٹائمنگ بھی زیادہ تھی، مگر اس نے تہنیت سے نا اپنی تنگ ودوشیزہ کی نا اپنی نئی جاب سے متعلق زیادہ کچھ کہا۔ وہ گھر اور جاب کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کا عادی تھا۔
تہنیت نے بھی اصرار نہیں کیا، حالاں کہ اس کا جی چاہتا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں کرے اس سے کہ آج کیا ہوا۔ وہ کس سے ملا، کسی نئے پن کا احساس ملا یا نہیں، پھر وہ بھی اس سے شیئر کرے، اپنی یونیورسٹی کی باتیں، نئے دوستوں کا ذکر، اساتذہ کی باتیں۔ مشکل یہ تھی کہ دور تک اور کوئی تھا ہی نہیں جس سے باتیں کی جاتیں۔
لندن کا موسم بھی اسے سوٹ نہیں کر رہا تھا۔ گیلا گیلا، سیلا سیلا۔ وہ تو کراچی کی عادی تھی، جہاں بادل اکثر نظر آتے تھے، جو کہیں اور برسنے کو اِدھر سے گزرتے اور جو بھولے سے بارش ہو جاتی تو کاروبار حیات بھی بند ہو جاتا، مگر وہاں تو جیسے کچھ ہوتا ہی نہیں تھا اور کراچی کی رم جھم کی دعائیں مانگنے والی بہت جلد لندن والوں کی طرح سن ڈے کی آرزومند ہو کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

زندگی جیسے تیز تیز دائرے میں گھوم رہی تھی۔ صبح جلدی جلدی کی رٹ لگا کر تیار ہونا، ساتھ ہی ساتھ فراز اور اپنے لیے ناشتا تیار کرنا۔ فراز اس پر اپنے کاموں کا بوجھ بالکل نہیں ڈالتا تھا، پھر وہ وہ اِدھر اُدھر بکھری چیزوں کو خود ہی سمیٹتی تھی۔ وہ بچپن سے کام کرنے کا عادی نہ ہونے کے باوجود گزارے لائق کام کر ہی لیتا تھا، مگر اس میں سگھڑ بیبیوں کے سے اوصاف ڈھونڈنا تہنیت کو احساس تھا یہ زیادتی ہے...... اس کے ساتھ۔ وہ اپنی یونیورسٹی چل دیتی، وہ اپنے آفس۔ دونوں الگ الگ ڈائریکشن میں سفر کرتے تھے اور تھک ہار کر آگے پیچھے ہی گھر پہنچتے تھے۔ تہنیت کو لگ رہا تھا، وہ آج کل کچھ زیادہ ہی تھکن محسوس کر رہی ہے۔ اسے بھوک بھی شدید لگ رہی ہوتی اور کچھ کھایا بھی نہیں جاتا۔ زندگی عجیب

بے کیف ہوگئی تھی۔

''پتا نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے۔'' وہ جھنجلا رہی تھی۔

''تم تھک گئی ہو اور کوئی بات نہیں۔'' وہ کچن میں اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔

وہ آج اس کی فرمائش پر بریانی بنا رہی تھی۔ ابھی اس نے گوشت پتیلی میں ڈالا ہی تھا کہ اس کا جی متلانے لگا اور وہ باتھ روم کی طرف دوڑی۔

''کیا ہوا'' وہ اس کے پیچھے دوڑا۔

مگر وہ ابکائیاں لے لے کر نڈھال ہو رہی تھی۔

''تمہاری طبیعت تو کچھ زیادہ ہی خراب ہو رہی ہے۔ تم چھوڑ دو، میں سب دیکھ لوں گا۔''

وہ کچھ بھی نا بول پائی، مگر اس کا دل مشکور تھا۔ یہ تو اس کی خوش نصیبی تھی کہ فراز جیسا زندگی کا ساتھی تھا۔

اس کی طبیعت دوسرے دن بھی نا سنبھلی، وہ یونیورسٹی بھی نا جاسکی، پھر فراز کے مشورے سے وہ ڈاکٹر کو دکھانے گئی، وہیں اسپتال میں ایک چھوٹے سے ٹیسٹ کے بعد اس کی زندگی کی سب سے بڑی الوہی خوشی سنائی گئی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ پَر لگ جائیں اور وہ پاکستان چلی جائے۔ امی کو سنائے اور ممی کو بھی جو اس کی خیریت پوچھتی رہتی ہیں۔ وہ تصور ہی تصور میں دُور نکل گئی۔

فراز کو پتا چلا تو وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہوا۔

''تم اب کوئی کام مت کرو بس آرام کرو۔''

''ارے میرے امتحانات سر پر ہیں۔''

''چھوڑو سب امتحان، بس اب اس امتحان کی تیاری کرو۔'' وہ بضد تھا۔

پھر دن یونہی گزرتے رہے، اس کی طبیعت کبھی ٹھیک، کبھی خراب۔ وہ امتحان کی بھی تیاری کرتی رہی۔ البتہ فراز نے اس کی گھر پر مدد کرانی شروع کردی۔ وہ کبھی بازار سے ہی کچھ لے آتا اور اس کو ہر طرح آرام دینے کی کوشش کرتا۔ پڑھائی بہت سخت تھی۔ اب اسے ٹھیک سے اندازہ ہو چلا تھا۔

دونوں امتحانات کڑے تھے، مگر اب وہ پیچھے ہٹنا نہیں چاہتی تھی۔

شروع دنوں کی بے چینی رفتہ رفتہ مستقل بن گئی، پھر اس کی ٹف روٹین نے اسے نڈھال کردیا۔ صبح صبح جانے کی جلدی، پھر کچھ جی نہیں چاہتا کھانے پینے کو۔ دوپہر دوڑتے بھاگتے لیکچرز روم اور لائبریری کے چکر کاٹتے گزر جاتی اور جب وہ تھکی ہاری گھر کی طرف چلتی تو بس جی یہ چاہتا کہ کچھ بھی مل جائے، کہیں سے بھی ملے تو وہ فوراً کھالے۔ ایسے میں اسے اپنی امی بہت یاد آتیں۔ وہ جب اسکول اور پھر کالج اور یونیورسٹی سے آتی تھی تو کتابیں بیگ ایک طرف ڈال کر بھوک بھوک کا شور مچادیتی تھی، پھر آکر امی ڈانٹتیں کہ منہ ہاتھ دھولو، نہالو، کپڑے بدل لو مگر وہ پہلے کھانے کی ہی رٹ لگائے رہتی اور پھر امی بھی اس کے سامنے گرما گرم کھانا لگادیتیں۔ امی کی یاد آتی تو آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں۔ وہ ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی تھی اور اپنی ماں کی قدر و منزلت اس کے دل میں اور بڑھ گئی تھی۔ وہ انہیں بہت یاد کرتی تھی، ہر ہر بات پر امی بھی اس کی طرف سے فکر مند تھیں۔ اسے روز ہی فون کرتیں، چاہے دو منٹ ہی بات ہوسکے۔

☆......☆......☆

اب جو ڈاکٹر کے وزٹ کی تاریخ آئی تو فراز نے بتادیا کہ اس کا آنا مشکل ہے، وہ خود ہی چلی جائے، وہ اس کے مسائل سمجھتی تھی مگر پھر بھی عجیب سا احساس ہوا، وہاں پہنچی تو بی پی بہت ہائی تھا۔ ڈاکٹر نے آگے ریفر کردیا۔ اس نے فوراً فراز کو فون کیا، مگر اس کا سیل بند تھا۔ وہ کچھ گھبراہٹ محسوس کررہی تھی،

پھر اس سے بڑے اسپتال، وہ پہلے گئی بھی نہیں تھی، مگر اسے ہمت پیدا کرنی ہی پڑی۔

زندگی آج کل اسے اصلی اسباق یاد کرارہی تھی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ ہمت ہے جو بڑے بڑے کاموں کو آسان بنادیتی ہے، ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھ چکی تھی کہ ہمت کی مثال ایک پھولے ہوئے غبارے کی سی ہے۔ ذرا نا موافق حالات کی سوئی چبھی تو اس کی شکل ہی نہیں حالت بھی بالکل بدل جاتی ہے۔ اس لیے وہ ہمت پر تکیہ نہیں کیے ہوئے تھی۔ اسے معلوم تھا امی کی دعاؤں کا حصار ہے اس کے گرد، پھر وہ خود بھی ہمہ وقت دعائیں مانگتی رہتی کہ دعا تسلی ہے، دعا اطمینانِ قلب ہے۔ اُدھر سے اس کو مضبوط رکھنا اور اچھے کی اُمید لگائے رکھنا بہت ضروری ہے۔

سارا دن اسپتال میں رہنے کے بعد وہ شام کو فارغ ہوئی۔ فراز تب بھی مصروف تھا۔ وہ خود ہی گھر کی طرف روانہ ہوئی، بھوک سے بُرا حال تھا۔ ڈاکٹر نے بتادیا تھا کہ چکنائی اور نمک بالکل بند ہے، مگر وہ کیا کرتی۔ اس نے سب سے پہلے ملنے والی حلال شاپ سے اپنے لیے ایک بڑا برگر لے لیا اور گھر پہنچ کر جلدی جلدی پہلے اسے ہی ختم کیا، پھر وہ نڈھال سی لیٹ گئی۔

دل پر افسردگی کی گہری چھاپ تھی۔ فراز نے کیا دن بھر میں ایک لمحے کی فرصت بھی نہیں پائی۔ کوئی فون کوئی میسج کچھ بھی نہیں۔ اس کے فون کالز کے جواب میں بھی نہیں۔ اسے لگ رہا تھا اس کی ہمت کے غبارے میں بے اعتنائی کی سوئی چبھ چکی ہے اور اب اس کی ہمت جواب دے رہی ہے۔ وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا لے کر سونا چاہتی تھی، مگر اسے نیند نہیں آرہی تھی، رونا آرہا تھا۔

پتا نہیں وہ کب آیا، مگر اس کی سسکیوں کی آواز پر اسے سیدھا کرتے ہوئے بولا۔

''لائٹ تو جلالیتیں۔''

وہ چپ ہوگئی، یکدم۔

''کیا ہوا، کیا زیادہ طبیعت خراب ہے۔''

''نہیں۔'' وہ بمشکل بولی۔

''پھر رو کیوں رہی ہو؟''

''مجھے امی یاد آرہی ہیں، مجھے پاکستان بھجوا دو۔'' وہ دوبارہ سسک رہی تھی۔

''بالکل ننھی بچی لگ رہی ہو۔'' وہ ہنس رہا تھا۔

''پاکستان بھجوانا اتنا آسان ہے کیا؟'' اور اس کی ہنسی اسے سخت غصہ دلا گئی۔

''کیا مشکل ہے اس میں؟'' وہ چیخی۔

''مشکل ہے، ڈاکٹر تمہیں اب سفر کی اجازت نہیں دیں گے۔''

اس کا دل بجھ گیا، کیا تھا جو وہ کہتا، میں تمہیں ایسے میں اکیلے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ میں ہوں نا یہاں، مجھے چھوڑ کر کیسے جاؤ گی۔

کچھ تو کہتا پہلے کی طرح، مگر وہ کچھ کہے پوچھے بنا شاور لینے جاچکا تھا۔

اس کا جی ہی نہیں چاہا کہ سارے دن کی روداد اسے بتائے، جب کسی کو دلچسپی ہی نہیں تو کیا پوچھنا، کیا بتانا۔ وہ آنکھیں بند کر کے پیاری نندیا کو آوازیں دینے لگی۔

☆......☆......☆

وقت کا کام گزرنا ہے، سو گزر ہی گیا۔ اس کے امتحانات ختم ہوئے۔ پھر رزلٹ نے اسے بہت خوش کیا، پھر وہ زندگی کی اس سخت منزل سے بھی کامیاب و کامران لوٹی جس کی تمنا شادی کے فوراً بعد شروع ہوجاتی ہے، مگر جس سے گزرنا مانو دوبارہ زندگی پانا ہے۔

فراز نے اس کے سارے شکوے مٹا دیے۔ وہ

اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھا رہا اور تہنیت کو لگا وہ دوبارہ قریب آ گئے ہیں یا شاید دوری کبھی درمیان میں آئی ہی نہیں۔ وہ ننھی منی سی گڑیا گود میں آئی تو سارے درد، سب تکلیفیں جیسے یکدم ختم ہو گئیں۔

فراز اپنی بیٹی کو بہت چاہتا تھا۔ اس کے چھوٹے موٹے کام کرنے میں بالکل عار نہیں تھا، اسے دونوں مل کر نہلاتے۔ یہ کام تہنیت کو سب سے زیادہ مشکل لگا تھا۔ اسے ننھے منے بچوں کو سنبھالنے کا ذرا بھی اندازہ نہیں تھا۔ فراز نا ہوتا تو وہ کیا کر پاتی، وہ سوچتی تھی۔

فراز کی چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ آفس چلا گیا۔ شکر یہ تھا کہ تہنیت کی چھٹیاں تھیں، مگر ابھی اس کے دو سمسٹر باقی تھے۔ چھٹیاں ہمیشہ کی طرح پَر لگا کر اڑ گئیں تو تہنیت مشکل میں پڑ گئی۔ اتنی چھوٹی بچی کو کس کے پاس چھوڑے، تبھی ممی نے وہاں آنے کا پروگرام بنالیا۔ وہ ندرت اپنی پوتی کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ یہ ان کی پہلی پوتی تھی جبکہ دونوں بڑے بیٹوں نے انہیں پوتوں کی خوشیاں دکھائی تھیں۔

ممی آ گئیں اور آتے ساتھ ہی دادی پوتی کی دوستی بھی ہو گئی۔ ممی کچن کے کام بالکل نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کو کہاں عادت تھی، ہاں اپنی پوتی کے ساتھ وہ مگن رہتیں۔ تہنیت چاہتی تھی ممی کی خاطر مدارت اچھی طرح کرے۔ وہ روز اہتمام کرنا چاہتی تھی، مگر پڑھائی اور رات کے رت جگوں (جو کہ چھوٹے بچوں کے معمولات میں شامل ہیں) نے اسے تھکا دیا تھا۔ شکر یہ تھا کہ ممی روایتی ساس نہیں تھیں۔

☆......☆......☆

وہ امتحانات سے فراغت پا کر پاکستان آئی تو اسے یہاں سب بدلا بدلا لگا۔ وہ بھی سب باہر سے آنے والوں کی طرح ہر وقت شاکی رہتی۔

''اللہ آپ لوگ اس گرمی میں بغیر لائٹ کے کیسے رہتے ہیں۔''

''توبہ اس جنریٹر کے شور نے تو کان کے پردے ہی پھاڑ دیے ہیں۔''

''پانی کے مسائل تو یہاں کبھی حل ہوں گے ہی نہیں۔''

''ٹریفک کا نظام کب سدھرے گا، یہاں کا۔''

''یہ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر توبہ ہے اس تک کا نظام نہیں تو اور کیا ہو سکے گا یہاں۔''

وہ سب سے ملی، خوش بھی ہوئی، مگر اسے واپس جانے کی جلدی بھی بہت تھی۔ کتنے ہی رُکے ہوئے کام یاد آ رہے تھے۔ امی کا دل نہیں بھرا تھا۔

''کیا تھا تہنیت جو چھٹیاں گزار کر فراز چلا جاتا اور تم کچھ رکتیں، میرے پاس۔''

''ارے نہیں امی میں نے وہاں اپلائی کیا ہوا ہے، جو کال آ گئی تو مشکل ہو جائے گی۔ پھر ندرت بھی یہاں آ کر مسلسل بیمار ہے۔ یہاں تو بہت ڈراؤنی خبریں سنائی دیتی رہتی ہیں، اب دیکھیے خسرہ سے ہی کتنے بچے مر گئے۔''

امی کچھ نہ کہہ پائیں، چپ چاپ اسے دیکھتی رہیں۔

☆......☆......☆

رزلٹ کے ساتھ ہی اسے جاب مل گئی۔ جاب اچھی تھی، سب کہہ رہے تھے، فراز نے بھی یہی کہا۔

''جاب تو اچھی ہے۔''

پتا نہیں کیوں تہنیت کو فراز کے کمنٹس سے خوشی نہیں ہوئی۔ وہ جاب کرنا چاہتی تھی۔ فراز نے کرنے دی تو پھر وہ خوش کیوں نہیں ہو پا رہی۔ وہ بار بار اپنے دل کو ٹٹول رہی تھی۔

جاب، گھر اور بیٹی کی ذمے داریاں، وہ گھن چکر بنی ہوئی تھی۔ البتہ پونڈز میں کما رہی تھی، پاکستانی

کرنسی میں کہیں زیادہ، مگر امی خوش نہیں تھیں۔

''تہنیت خود کو اتنا نہ تھکاؤ بیٹا۔''

''ارے امی، یہاں تو سب ہی جاب کرتے ہیں۔''

''کرتے ہیں بیٹا، یہاں بھی کرتے ہیں۔ میں جاب کے خلاف نہیں ہوں، مگر تم وہاں تنہا ہو۔ کوئی مدد نہیں حاصل ہے تمہیں، یہاں بہت سی سہولتیں مل جاتی ہیں۔''

''سہولتیں اور وہاں پاکستان میں۔'' وہ ہنسی۔

''کیا بات کرتی ہیں امی آپ۔''

''ہاں سہولتیں ہیں یہاں، یہاں سب اپنے ہیں۔ میں ہوں، ساس ہیں اور یہاں ماسی سسٹم ہے۔'' امی کو اس کی بات پر غصہ آ رہا تھا۔

''وہ تو ہے امی، مگر میں نے اتنا وقت صرف اتنی محنت سے پڑھا، تو سب بھلانے پر لگ جاؤں۔ پھر امی آج کی عورت اپنے آپ کو منوانا چاہتی ہے۔''

''تمہیں کون سی ضرورت ہے۔ نا یہاں، نا وہاں، ماشاء اللہ کھاتے پیتے لوگ ہیں اور تم لگی ہو خود کو مٹانے۔''

''نہیں امی جاب خود اعتمادی سکھاتی ہے اور عورت اپنے مقام سے آگاہ ہوتی ہے۔ آپ کو پتا ہے میری سیلری فراز کے برابر ہے۔''

''ہوں۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ کوئی فائدہ بھی ہے، یوں لاکھوں کمانے کا۔''

''فائدہ ہے امی، بھلا پیسے کا بھی مصرف ڈھونڈنا پڑتا ہے کیا۔ پاکستان کے چکر آسانی سے لگ سکتے ہیں اور پھر ہم لوگ ورلڈ ٹور کا پروگرام بنا رہے ہیں۔'' وہ انہیں بہلا رہی تھی۔

انہیں تو کچھ نا کچھ سمجھا ہی دیا، مگر اپنے اندر کی بے چینی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اسے اب اپنے اور فراز کے درمیان ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا۔

قرب بھی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن
آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا

وہ کبھی کبھی اُس سے کچھ کہنا چاہتی، مگر وہ بھی جیسے یکدم مصروف ہو گیا تھا۔ گھر آتا تو یا لیپ ٹاپ ہوتا یا بیٹی۔ بس اس کے علاوہ وہ اور کسی پر توجہ دیتا ہی کہاں تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ:

آج بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں
دل وہی کارگہہ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

☆......☆......☆

وقت آگے بڑھ رہا تھا۔ ورلڈ ٹور کا پروگرام ذیشان صاحب کی آمد نے مؤخر کر دیا۔ فراز نے بیٹے کو بھی بیٹی ہی کی طرح چاہت سے لیا اور اب اس کی واپسی کے بعد وہ اپنے بیٹے اور بیٹی میں دیر تک مگن رہتا۔ خوشی اس کے چہرے سے جھلکتی۔ کبھی کبھی بچوں کی کسی معصوم سی شرارت پر وہ تہنیت کو بھی آواز دیتا۔ دونوں کے درمیان گفتگو کا محور بھی بس بچے تھے۔ دونوں میاں بیوی کما رہے تھے۔ وہاں بھی مہنگائی، مہنگائی کا شور تھا، مگر وہ خوب دل کھول کر اپنے بچوں کی شاپنگ کرتے۔ اخراجات زیادہ تھے اور کبھی بچوں کا مستقبل بھی زیر بحث آتا تو دونوں ''اللہ مالک ہے'' کہہ کر چپ ہو جاتے۔

پاکستان سے رابطہ دن بدن کمزور پڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود اپنی جٹھانیوں سے اور اب شارب کی شادی کے بعد اس کی بیوی سے باتیں کر کے تہنیت کو لگتا کہ پاکستانی عورت کی زندگی میں ابھی رنگ اور خوشبو سے دوستی زیادہ ہے۔ جیولری اور ڈریسز کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ پاکستان میں عورتیں خود کو خوش کرنے کے لیے وقت نکال ہی لیتی تھیں، شاید۔

وہ البتہ گھڑی کی سوئی کے ساتھ تیز تیز دوڑتے ہوئے تھک رہی تھی۔ اسے معلوم تھا تھکن سود کی طرح ہوتی ہے۔ ادائیگی نا ہو تو بے حساب بڑھتی چلی

جاتی ہے، مگر رکنے، سانس لینے، دم لینے کا لمحہ ہی کہاں تھا۔ وہ تو ہفتے کے پانچ دنوں کا بقایا کام دونوں چھٹیوں میں نمٹاتے نمٹاتے اور بھی تھک جاتی تھی۔

حالاں کہ فراز چاہتا تھا کہ وہ چھٹیوں کو چھٹیوں کی طرح ہی گزارے۔ وہ سمجھاتا تھا۔ 'جیسا دیس ویسا بھیس' اختیار کرو۔ پانچ دن کام اور پھر گھومنا پھرنا، تفریح کا کم از کم ایک دن اور ایک دن فُل آرام، مکمل کوئی کام نہیں۔

''دیکھو پاکستان میں لوگ پیر کے دن دفتر آتے ہیں تو اور تھکے ہوئے لگتے ہیں، جبکہ یہاں سب فریش فریش ہوتے ہیں۔''

مگر وہ کیا کرتی، چھوٹے بچوں کا ساتھ کچھ نہیں تو کپڑوں کا ڈھیر جمع ہو جاتا، پھر وہاں حرام حلال کا ایسا چکر تھا کہ لمبی لمبی ڈرائیو کے بعد حلال فوڈ کا بندوبست ہو پاتا اور پھر وہ بھی جینک فوڈز۔ دونوں میاں بیوی وزن بڑھا رہے تھے۔ جاگنگ تو کیا واکنگ تک کا وقت نہیں ملتا تھا۔ تہنیت شوق شوق میں ایک اچھا جم جوائن کر آئی، مگر دو ایک روز سے زیادہ جا ہی نہیں پائی۔

وقت سب سے بڑا استاد ہے اور زندگی استاد سے زیادہ سخت۔ استاد سبق پڑھا کر امتحان لیتا ہے اور زندگی امتحانات سے گزار کر وہ سبق پڑھاتی ہے جو کبھی کوئی نہیں بھولتا۔ وہ بھی اب جان چکی تھی کہ:

لمحات ٹھہرتے نہیں غم کے نا خوشی کے
حالات کا موسم کبھی یکساں نہیں رہتا

یہ ٹھیک تھا کہ اب وہ خود سے بھی بس ایک رسم نبھانے کے لیے ہی مل پاتی تھی۔ دھنک کے وہ ساتوں رنگ جو پہلے اس کے اردگرد دمکتے تھے، اب کچھ مدھم سے ہو چلے تھے۔ سب کو سب چیزیں زندگی میں نہیں مل سکتیں۔ وہ زندگی سے جو Maximum Camfort لے رہی تھی وہ کچھ اور تھا۔ یورپ کی سیر تو کبھی امریکہ اور کینیڈا کا سفر۔ وہ میاں کی بات مان کر اب کم از کم سالانہ چھٹیاں ضرور لیتی تھی۔ کام، کام اور بس کام زندگی نہیں۔ زندگی سے لطف کشید کرنا ہے کہ زندگی نعمت ہے۔

وہ کبھی کبھی الجھتی تو سوچتی آج کی عورت بہرحال قطبین کے درمیان کھڑی ہے۔ وہ اپنی ذہانت، صلاحیت اور قابلیت سے مشکل امتحانات، مشکل حالات میں پاس کر لیتی ہے، مگر خود کو سمجھنا اس کے لیے آج بھی مشکل ہے۔ کبھی وہ اپنا تقابل مسز فلاں اور مسز فلاں سے کرنے لگتی ہے۔ کیا آرام کی زندگی ہے۔ عیش ہی عیش ہیں۔ کبھی تو عمر جیسے آگے بڑھنا بھول گئی ہے، مگر گلی گھرانے کی تربیت سے اس کے اندر کی مشرقی عورت جاگ جاتی ہے۔ گھر کی نوک پلک سنوارنا ہے۔ چہرہ پھیکا پڑتا جا رہا ہے تو پڑنے دو۔ آج کیوں نا کچھ اچھا پکا کر میاں کو خوش کردوں، بچے بڑے ہوتے جائیں تو ان کی فرمائشیں سر آنکھوں پر، پھر اس کے اندر سے اس کی صلاحیتیں، اس کی محنت سے حاصل کی ہوئی ڈگریاں اس سے انصاف مانگتی ہیں اور وہ پھر راستے نکال ہی لیتی ہے۔

وقت تہنیت کی شخصیت میں ٹھہراؤ لے آیا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی تھی کہ کیا شعور و آگاہی کی سیڑھیاں چڑھتے رہنا اور اپنے آرام کو تج دینا، سجنے سنورنے کی خواہش کو تھپک تھپک کر سلا دینا۔ یہ سب عمل ٹھیک تھے، تو کہیں اندر سے یقین کی روشنی ملتی تھی۔ نئی نسل کو زمانے کے ساتھ چلنے کا ہنر سکھانا ضروری تھا اور اگر عقل و خرد کو جلا نا ملتی تو راستہ مشکل ہو جاتا۔ وہ سر جھٹک کر مسکرانے لگتی۔

ہر سنگ و خشت ہے صدف گوہر شکیب
نقصاں نہیں جنوں کا جو سودا کرے کوئی

☆☆......☆☆

ناولٹ

جب کافی دیر تک اشعر کا کوئی میسج نہیں آیا تو اُسے الجھن سی ہونے لگی، عموماً اتنی دیر وہ اس سے ناراض نہیں ہوا تھا۔ ''کیا ابھی تک ناراض ہو؟'' آنچل نے پھر اس کے نمبر پر میسج سینڈ......

آگہی کے دَر وا کرتا، ایک خوب صورت ناولٹ

''کوئی بدتمیز میسج نہیں کررہا۔'' آنچل نے غصے سے موبائل پرے پٹخا، ''جب بھی میں بزی ہوں عین اُسی وقت سب کو یاد آتی ہے مجھے میسج کرنے کی اور اب جب میں فری ہوں تو ایسا لگ رہا ہے جیسے سب دوسری دنیا کو سدھار گئے ہیں۔ اب کرنے دو اس علیشبہ کو میسج، میں بھی رپلائی نہیں کروں گی، بلکہ علیشبہ تو کیا کسی کو بھی رپلائی نہیں کروں گی۔'' اُس نے دل میں پکا تہیہ کرلیا۔ موبائل کو بیڈ پر پھینک کر وہ خود کچن میں آ گئی۔ اپنے لیے ناشتا بنانے، ناشتا بنانے اور کرنے کے دوران بھی وہ مسلسل اپنی سب دوستوں کی بے مروتی پر کڑھ رہی تھی۔ اور تب اس وقت اچانک اُس کے موبائل کی مخصوص رِنگ ٹون گونجی۔

'یقیناً علیشبہ کی کال ہوگی۔' وہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب پلٹی، 'خوب کھری کھری سناؤں گی میں اسے۔' وہ دل ہی دل میں اُس سے لڑنے کے منصوبے بنارہی تھی اور وہ جب موبائل کے قریب پہنچی تو کال ڈسکنکٹ ہوگئی۔

وہ موبائل اُٹھا کر نمبر چیک کرنے لگی، کال علیشبہ کی نہیں تھی کسی نیو نمبر سے آئی تھی، اس کے غصے کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔ اب تو میں زندگی بھر اس علیشبہ سے بات نہیں کروں گی، موبائل ابھی اُس کے ہاتھ میں ہی تھا جب دوبارہ اُسی نمبر سے کال آ گئی۔

''ہیلو؟ کون ہے......؟'' وہ غصے میں تھی اور اس پر قابو پانے کی اس نے قطعی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

''آپ کون بات کررہی ہیں؟'' ایک پُراثر اور دِل کش آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

وہ ایک لمحے میں ہی اس آواز سے مرعوب ہوگئی۔

''آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟''

''مجھے چھوڑیں، آپ بتائیں آپ کون بات کررہی ہیں؟''

''واٹ؟ نان سینس، یہ کیا بدتمیزی ہے۔ سیدھی طرح سے بتاؤ کون ہو اور بات کس سے کرنی ہے؟''

''محترمہ! یہ سینس کہاں سے آ گئے بیچ میں؟ کہیں آپ کا نام ''نان سینس'' یا ''بدتمیز'' تو نہیں ہے؟'' وہ شائستگی سے گویا ہوا۔

''رانگ نمبر'' کہہ کر اس نے کال ڈسکنکٹ کردی۔

''عجیب ڈفر انسان ہے۔ ویسے آواز تو پیاری ہے، پر خود ڈفر لگتا ہے۔'' وہ تو موبائل کو واپس رکھنے ہی والی تھی کہ پھر سے اسی نمبر سے کال آ گئی۔

آنچل کو اپنی فرینڈز پر خاصا غصہ آ رہا تھا اور باقی کسر اس رانگ نمبر والے نے پوری کر دی۔ اس نے بھی سارا غصہ اسی رانگ نمبر والے پر نکالنے کا فیصلہ کیا۔

''دیکھیے مسٹر! اگر آپ کے پاس بہت فالتو وقت ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ باقی سب کے پاس بھی فالتو وقت ہے۔ ہاں! کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں گے جو پاگل اور آپ کی طرح فارغ ہوں گے۔ آپ وہاں ٹرائی کریں۔ اچھا وقت کٹ جائے گا اُن کا بھی اور آپ کا بھی۔'' موبائل آن کرتے ہی آنچل نے اسے بے نقط سنائیں۔

''ارے، ارے، اتنا غصہ......؟ محترمہ میں نے تو بس یہی پوچھا تھا کہ آپ کون ہیں؟ کیا نام ہے آپ کا اور آپ نے تو اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ اس میں اتنا غصہ کرنے والی کون سی بات ہے؟'' وہ اتنی معصومیت سے بولا کہ آنچل کو تاؤ ہی آ گیا۔

''میرے خیال میں آپ جیسے لوگوں کو، آپ کی بدتمیزی کی وجہ سے اگر کوئی چوک پر کھڑا کر کے ہزار جوتے بھی مارے نا تو بھی آپ کو کوئی فرق نہ پڑے۔''

وہ اس وقت سخت غصے میں تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا اگر وہ اس کے سامنے ہوتا تو اس کا سر ہی پھاڑ دیتی۔

''چلیں مان لیا، ویسے کیا نام ہے آپ کا؟'' وہ بھی شاید مستقل مزاج یا پھر ڈھیٹ تھا۔

''کیوں؟ نام سُن کر مار کھانی ہے؟'' اُس نے بڑی روانی سے سلمان خان کی فلم کا ڈائیلاگ بولا۔

''آ آ آرام سے...... لگتا ہے آپ اس وقت غصے میں ہیں خیر، نام بتانے میں تو کوئی ہرج نہیں ہے، کیوں اس بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟''

شرارت اس کی آواز میں نمایاں تھی۔

''میں جو بھی ہوں، آپ کو اس چیز سے کیا مطلب ہے؟'' وہ غصے سے چیختے ہوئے بولی۔

''آپ آہستہ بات نہیں کر سکتیں؟''

''یو، ڈفر، ایڈیٹ اب اگر تم نے مجھے فون کرنے کی غلطی کی تو مجھ سے بُرا کوئی بھی نہیں ہوگا۔''

وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولی، تاکہ اُسے اچھی طرح سے ذہن نشین ہو جائے۔

''آپ کی آواز سننا اگر غلطی ہے تو یہ غلطی میں ساری زندگی کرنے کو تیار ہوں۔'' بڑے ہی رومانٹک انداز میں اس نے ڈائیلاگ مارا۔

''ایڈیٹ'' اس نے غصے سے موبائل آف کر کے بیڈ پر پٹخا۔

☆......☆

''احمر! ادھر آؤ، بات سنو میری۔'' تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ کر چھت کی جانب جاتے ہوئے احمر کو آنچل نے روکا۔

''کیا ہے یار! تم اپنے بڑے بھائی کو ایسے بلا رہی ہو جیسے چھوٹے بچے کو بلاتے ہیں۔'' وہ وہیں کھڑے کھڑے بولا۔

''ادھر آؤ۔'' اب کی بار اس نے ہاتھ کا اشارہ بھی ساتھ کیا۔

''پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں آتا۔''

''آ رہے ہو، یا نہیں؟'' وہ آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی۔

''بڑوں کو آنکھیں دکھاتے ہیں، بدتمیز لڑکی۔'' احمر نے اپنے بڑے ہونے کا رعب جھاڑا۔

''ادھر آؤ نا بات کرنی ہے تم سے۔'' اپنی دال گلتی نہ دیکھ کر وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

''ہاں، اب ٹھیک ہے۔ کیا ہے نا، تم منتیں اور

التجائیں کرتے ہوئے بے حد اچھی لگتی ہو۔ یہ رعب وعب ڈالنا تمہارے بس کا کام نہیں ہے۔'' وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اُس کے پاس آ کر بولا۔

''ہاں، اب بتاؤ کیا کام ہے، دیکھو پلیز مجھ سے پیسے نہ مانگ لینا، ملکی معیشت کو ویسے بھی بہت سے خطرات لاحق ہیں اور پلیز ناولز یا کوئی ڈائجسٹ منگوانے نہ بھیج دینا، کیا ہے نا کہ تھکاوٹ سے میرا بدن چور چور ہو رہا ہے۔ ہاں اب جو کہنا ہے کہو۔''

''فکر نہیں کرو، پیسے نہیں مانگوں گی تم سے اور نہ ہی کوئی ناول منگواؤں گی۔''

''تو پھر؟'' احمر نے اپنی آنکھیں پھیلائیں، کیوں کہ وہ بس یہ دو کام ہی اس سے لیتی تھی۔

''یہ نمبر نوٹ کر لو، اس کا دماغ درست کرنا ہے۔'' آنچل نے موبائل اس کے سامنے لہرایا۔

''یہ کون ہے؟''

''ہے ایک پاگل۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''تو کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھاتی نا، میں سائیکاٹرسٹ تو نہیں ہوں، پھر؟''

''یہ رانگ نمبر ہے۔ ایڈیٹ مجھے تنگ کر رہا ہے۔'' اس کے لہجے میں بے زاری عروج پر تھی۔

احمر نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ ''واقعی ایڈیٹ ہی ہے، جو تمہیں تنگ کر رہا ہے۔''

''بالکل ٹھیک کہا تم نے، وہ ایڈیٹ ہے اسی لیے مجھے تنگ کر رہا ہے۔ تم بھی تو مجھے تنگ کرتے ہو، اس لیے تم بھی ایڈیٹ ہو۔'' آنچل نے مسکراتے ہوئے بدلہ چکایا۔

احمر بھی مسکرا دیا۔ اسے اپنی بہن سے اسی طرح کے جواب کی توقع تھی۔

نمبر اپنے موبائل میں سیو کرنے کے بعد وہ پھر سے سیڑھیاں پھلانگتا چھت پہ چلا گیا اور وہ خود کچن میں آ گئی، اپنی امی کو ہیلپ کرانے کے لیے۔

''امی! گیسٹ روم کی صفائی تو میں کر چکی ہوں، آپ جا کے آرام کریں میں روٹی بھی پکا لوں گی۔'' اُس نے اپنی عنایات پیش کیں، آنچل کا ایسا موڈ کم کم ہی بنتا تھا۔ اس لیے اس کی امی نے اس بات سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔

''نہیں روٹی تو میں پکا لوں گی۔ تم ایسا کرو اسٹور میں جو دو سنگل بیڈ پڑے ہوئے ہیں، احمر اور احمد کے ساتھ مل کر یہ ایک تو میرے کمرے میں سیٹ کر دو اور دوسرا احمر لوگوں کے۔'' انہوں نے آنچل کو وہ کام بتایا جو اس نے کبھی بھی نہیں کیا تھا۔

''ہیں ایں ں...... ؟ امی آپ کے کمرے میں کیوں؟'' وہ حیرانگی سے بولی۔

''وہ اس لیے کہ نیناں ابھی تک صفیہ کے ساتھ سوتی ہے، اس لیے اس کا بستر بھی میرے کمرے میں ہی رکھوا دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اُس نے ایک طرح سے شکر ادا کیا، کیوں کہ وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ نیناں کا قیام اس کے کمرے میں ہوگا اور وہ اپنی چیزوں اور کمرے کی شراکت بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔

''پر، احمر لوگوں کو آپ خود ہی بلائیں، میرے کہنے سے تو وہ آئیں گے نہیں، میں اسٹور روم میں جا رہی ہوں، انہیں بھی بھیج دیجیے گا وہاں۔'' آنچل کے یہ دونوں بھائی احمر اور احمد ٹوئنز تھے۔ شاید اس لیے ان کی عادت میں یکسانیت تھی۔ ایک وصف جو ان دونوں میں پایا جاتا تھا، وہ تھا اپنی اکلوتی بہن آنچل کو تنگ کرنا تھا۔ وہ دونوں جب تک آنچل کو تنگ نہ کر لیتے تھے تب تک انہیں سکون نہیں ملتا تھا اور دونوں اسے تنگ کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

وہ اسٹور روم میں پہنچ کر وہاں رکھی ہوئی تمام چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ وہاں پہ ایک بھی ایسی چیز نہ

تھی جو ناکارہ ہو۔ تمام چیزیں استعمال کی اور ضرورت کی ہی تھیں۔ ایک لکڑی کی الماری میں اس کے پرانے ڈائجسٹ اور کچھ بکس پڑی ہوئی تھیں، وہ انہیں اُٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

''پھوپھی بھی نا جب بھی آتی ہیں ہمیں متحرک کر دیتی ہیں۔''

احمد جلا بھنا اسٹور روم میں داخل ہوا۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' آنچل نے اس کی آواز پر پلٹ کر دیکھا، اور پھر مسکرا کر بولی۔

''اچھا بھلا میں کرکٹ دیکھ رہا تھا۔ امی کے دل میں نہ جانے کون سا جذبہ بیدار ہوا جو مجھے وہاں سے اُٹھا کر یہاں بھیج دیا کہ تمہاری ہیلپ کرواؤں۔'' وہ بہت ہی جھلایا ہوا لگ رہا تھا۔

''اینڈ بائے دا وے آنچل بیٹا! آپ کے کیوں اتنے دانت نکل رہے ہیں۔'' اسے ہنستا دیکھ کر احمد کا مزید پارہ ہائی ہوا۔

''کیوں میرے ہنسنے پہ کوئی پابندی ہے کیا؟'' وہ پھر سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''نہیں جی، میں کون ہوتا ہوں پابندی لگانے والا، جب اپنے ارمانوں کا خون کرنے پر امی پہ کوئی پابندی نہیں لگا سکتا تو تمہارے ہنسنے پہ کیسے لگا سکتا ہوں؟'' وہ بڑے ہی دُکھی انداز میں بولا۔

''کون سے ارمانوں کا خون کیا ہے امی نے؟'' وہ اب کافی حد تک اپنی ہنسی پہ قابو پا چکی تھی۔

''ہائیں...... ابھی سے چند لمحات قبل جو اپنے ارمانوں کا تازہ تازہ خون کروا کے آ رہا ہوں؟ تمہیں اپنے ارمانوں کے قتل کی واردات بتائی جو تھی، پھر بھی پوچھ رہی ہو کہ کون سے ارمانوں کا خون......؟'' وہ انتہائی صدمائی انداز میں بولا۔

''جلدی سے بیڈ اٹھواؤ یہاں سے اور ڈائیلاگ مارنا بھی بند کرو کیوں کہ اگر امی آ گئیں تو تمہارے ساتھ ساتھ میرا بھی سچ مچ کا قتل کر دیں گی۔'' آنچل نے اُسے دھمکایا۔

''پتا نہیں...... امی نے ابھی تک احمر کو کیوں نہیں بھیجا۔'' وہ بڑبڑائی۔

''امی نے تو اسے بھی کہا تھا لیکن مجھے پتا ہے وہ نہیں آئے گا۔''

''وہ کیوں؟''

''کسی حسینہ کی زلفوں کے جال میں پھنس گیا ہے بے چارہ۔''

آنچل نے اس کی بات پہ ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

''یہ جناتی قہقہے لگانا بند کرو اور بیڈ اٹھواؤ یہاں سے، مجھے ابھی کرکٹ دیکھنا ہے۔'' احمد نے ایک دم سنجیدگی کا لبادہ اوڑھا۔

''ٹھیک ہے چلو۔'' آنچل نے بھی خلافِ معمول برا منائے بغیر فوراً تائید کی۔

☆......☆

''امی آپ کی صفیہ پھوپو کے ساتھ محبت اور انڈراسٹینڈنگ کے مظاہرے دیکھ کر کہیں سے بھی نہیں لگتا کہ وہ آپ کی نند اور آپ ان کی بھاوج ہیں۔'' آنچل صبح سے کام کر کے تھک چکی تھی، اب اپنی امی کے کمرے کے پردے چینج کرنے آئی تو ان کی ایکسائٹمنٹ کو دیکھ کر دل میں آئی ہوئی بات کہے بغیر رہ نہ سکی۔

''اُسے میں نے اپنی نند سمجھا ہی کب ہے اور نہ ہی اُس نے مجھے کبھی صرف بھاوج سمجھا ہے۔ وہ میری سگی خالہ زاد ہے اور اُس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ میری بچپن کی دوست ہے۔ ہم اکٹھے، پڑھتے، کھیلتے، کودتے جوان ہوئے ہیں، شاید اسی لیے نند اور بھاوج کا روایتی رشتہ ہم لوگوں کے بیچ کبھی بھی نہیں آیا۔'' عالیہ بیگم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

بہت عرصہ قبل آنچل کی پھوپو صفیہ کی شادی مستقیم صاحب سے ہوئی تھی۔ مستقیم صاحب کی پوری فیملی سعودیہ میں سیٹل تھی۔ صفیہ بیگم سال میں ایک آدھ بار پاکستان کا چکر ضرور لگاتی تھیں۔ مستقیم کا گارمنٹس کا بزنس تھا جس کی ایک برانچ وہ پاکستان میں بھی کھولنا چاہ رہے تھے، جسے ان کے بیٹوں زین، عباد اور زوہیب نے دیکھنا تھا۔ جب تک ان کے گھر اور بزنس کا سیٹ اپ نہیں ہو جاتا تھا تب تک انہوں نے ان کے گھر ہی رکنا تھا۔ یہ سن کر آنچل کی کوفت مزید دو چند ہو گئی۔ 'خواہ مخواہ کا سر درد' اس نے اپنا سر جھٹکا۔

''امی یہ بیڈ شیٹ بھی چینج کر دوں؟''

''نہیں، یہ ٹھیک ہے۔ تم جاؤ احمر لوگوں کے کمرے کی حالت درست کر دو، ہر وقت بکھیر کر رکھتے ہیں یہ دونوں۔ کوئی پتا نہیں ہے صفیہ کا کہ کب آ جائے، پتا نہیں، عباد بیٹے کو کیا شوق ہے سرپرائز دینے کا، کبھی بھی یہ آنے سے پہلے اطلاع نہیں دیتا اور نہ ہی کبھی کسی اور کو کرنے دیتا ہے۔'' انہیں عباد کی یہ عادت کچھ خاص پسند نہیں تھی۔

''عباد بھائی بھی احمر کی ہی کاپی ہیں۔'' اُس نے کمرے سے نکلتے نکلتے اطلاع دی۔

☆......☆

وہ شاور لے کر نکلی تو اُس کے سیل کی میسج ٹون رنگ کر رہی تھی۔ وہ موبائل کو دیکھنے کے بجائے آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔ بلیک ڈریس میں ہم رنگ دوپٹا لیے وہ عام دنوں سے زیادہ نکھری نکھری اور خوب صورت لگ رہی تھی۔ بلیک کپڑوں میں اس کی گوری رنگت مزید دمکنے لگی تھی۔ میسج ٹون کے دوبارہ رنگ کرنے پر اُس نے چونک کر موبائل کو دیکھا۔

''یہ تو وہی نمبر ہے، جو میں نے احمر کو دیا تھا۔''

موبائل کو وہیں رکھ کر وہ پھر سے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوگی۔

ایک بار پھر میسج ٹون نے اس کی توجہ حاصل کرنی چاہی، مسلسل ریسیو ہونے والی میسجز سے بالآخر وہ چڑ سی گئی۔

''کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے یہ الفاظ لکھ کر اس نمبر پر سینڈ کر دیے۔

''مسئلہ تو ابھی بھی وہی ہے۔'' اُس ڈھیٹ نے بھی فوراً رپلائے کیا، جیسے اس کے میسج کا انتظار کر رہا ہو۔

''تم میرے بھائیوں کو جانتے نہیں ہو۔ تمہارا منہ اور سر توڑ کے عجائب گھر میں بھجوا دیں گے وہ تمہیں۔'' آنچل نے اُسے دھمکانے کی اپنی سی سعی کی۔

''ہا ہا ہا...... میں فی الحال آپ کو جاننے کا خواہش مند ہوں۔ نہ کہ آپ کے بھائیوں کو۔'' لگتا ہے ڈائجسٹ کچھ زیادہ ہی پڑھتے ہیں موصوف۔

''تمہیں قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے جاننے کی۔''

''وہ کیوں جی۔'' بڑی بے تابی سے پوچھا گیا۔

''کیوں کہ جی اگر آپ نے ایسا کچھ کرنے کی کوشش کی تو میں آپ کو وہ، وہ سناؤں گی کہ ساری زندگی یاد رکھو گے۔''

''اچھا آ آ آ...... ویسے......ہم تو خوب صورت لڑکیوں کی گالیاں بھی بہت شوق سے سنتے ہیں۔'' اسمائل والے آئی کون کے ساتھ میسج آیا۔

''ریئلی؟'' اس نے تصدیق کرنی چاہی۔

''جی، جی، بالکل۔''

''واؤ! پھر تو بہت بے غیرت ہو۔'' اب کی بار اُس نے اسمائل آئیکون کے ساتھ میسج بھیجا۔

''ہاں جی اور اتنی انسلٹ کروانے کے باوجود آپ سے بات کر کے اپنے بے غیرت ہونے کا ثبوت بھی دے رہے ہیں۔ ویسے آپ نے مجھے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا، اُس نے یاد دہانی کرانا چاہی۔

''میں اپنا نام کیوں بتاؤں؟''

''اور کچھ نہیں تو مجھے اپنی دوست کا نام تو معلوم

ہونا ہی چاہیے نا۔''

''دوست کسے کہا ہے تم نے؟'' اس کا دماغ گھوما۔

''آپ کو...... اگر دوست نہ ہوتیں تو اتنی دیر سے باتیں بھی نہ کر رہی ہوتیں۔'' آنچل کو اب یہ سب کچھ دلچسپ سا لگ رہا تھا۔

''میرا نام اُمید ہے۔'' اُس نے جان بوجھ کر اپنا غلط نام بتایا۔

''اوہ گریٹ، نائس نیم، میرا نام اشعر ہے اس مین دوستی پکی؟''

''ہاں...... ٹھیک ہے، مگر اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ جب تک میں تمہیں خود میسج نہ کروں، تب تک نہ تم مجھے میسج کرو گے اور نہ کال، کیوں میرا موبائل سب ہی اُٹھاتے رہتے ہیں۔''

''چلو اتنا بھی بہت ہے۔''

''میں تم سے اب رات کو بات کروں گی، اب بزی ہوں۔''

''اوکے۔'' اس نے سیڈ آئی کون کے ساتھ میسج سینڈ کیا۔ آنچل مسکرا دی۔

''بے چارہ فری میں بے وقوف بنتے جا رہا ہے۔''

☆......☆

پھوپو کو آئے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی، امی اُن سب کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں اور وہ کچن میں مصروف تھی۔ سب کو چائے وغیرہ سرو کرنے کے بعد وہ خود اپنے کمرے میں آ گئی۔ کل اُس کا پیپر تھا۔ کچھ دیر بعد احمر اور احمد بھی آ گئے۔ اس کے بعد قہقہوں اور خوش گپیوں کا وہ طوفان شروع ہوا جو کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس کا کمرہ ڈرائنگ روم سے خاصا فاصلے پر تھا۔ اس کے باوجود اُن کی آوازیں اسے بالکل صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''ایک تو سبجیکٹ اتنا بور اور دوسرا ان لوگوں کا شور۔'' وہ جھنجلا کر بولی۔ اس کے کان اور دماغ سائیں سائیں کر رہے تھے، تنگ آ کر وہ چھت پر آ گئی۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔

ہر طرف شام کے ہلکے ہلکے دھند لکے پھیل گئے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر چھت کی چار دیواری پہ ہاتھ ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ پوری دلجمعی سے سورج غروب ہونے کا نظارہ کر رہی تھی، اُسے ہمیشہ سے سورج طلوع اور غروب ہونے کا منظر دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔

طلوعِ آفتاب کا منظر جہاں اُسے ہمیشہ ہر شے کو اپنی تازگی و مسرت کی لپیٹ میں لے لیتا تھا، وہیں غروب ہونے کا منظر ایک الگ طرح کی اُداسی اس پہ طاری کر دیتا تھا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہ سر پہ دوپٹا اوڑھتے ہوئے نیچے اُتری اور ان لوگوں کی طرف آ گئی۔ وہاں سب ہی موجود تھے، ماسوائے امی کے، ابو بھی اپنے آفس سے آ چکے تھے، ابو کو سلام کرنے کے بعد وہ کچن میں آ گئی۔

آج وہ کافی حد تک خوش تھی۔ سب نے ہی اُس کے بنائے ہوئے کھانوں کی بے حد تعریف کی تھی اور تو اور احمر کو بھی اس کی بنائی ہوئی ڈشز میں سے کیڑے نکالنے یا ٹوکنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

برتن دھونے کے بعد اس نے سنک کو اچھی طرح سے صاف کیا، پھر ابو کے لیے چائے بنانے لگی، رات کا کھانا کھانے کے بعد اس کے ابو چائے لازمی پیتے تھے۔ انہیں چائے دے کر وہ احمر اور احمد کے مشترکہ کمرے میں آ گئی۔

اس کے اچانک دروازہ کھولنے پر سب نے ہی چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

''احمر! مجھے ایک، دو ایکسرسائز سمجھ نہیں آ رہی

ہیں، سمجھا دو پلیز۔'' وہ وہیں دروازے میں کھڑے کھڑے اس سے مخاطب ہوئی۔

وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا نہ جانے کون سی سائٹ سرچ کر رہا تھا۔

''میں بزی ہوں۔ نظر نہیں آ رہا کیا۔''

''لیکن میرا کل پیپر ہے۔''

''تو کیا ہوا؟'' وہ اسی مصروف سے انداز میں بولا۔

''تو ہوا یہ کہ تم مجھے وہ ایکسر سائز سمجھا دو۔'' اسے اپنے پیپر کی بہت فکر ہو رہی تھی۔

''زین یار! آج اپنی سروسز ہمیں سرو کرو۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چوکنا ہو گیا۔

''مطلب یہ کہ تمہارے ایم سی ایس کرنے کا کچھ تو فائدہ ہونا چاہیے نا یار! اس نالائق کو سوالات سمجھا دو۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

اس کارروائی کے دوران آنچل خاموش تماشائی بنی جز بز ہوتی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ احمر کے نالائق کہنے پر اس نے اسے بھرپور انداز سے گھورا، ان سب کی موجودگی میں وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

''کیوں تمہارا ٹائم کدھر چلا گیا ہے؟'' وہ بھی یقیناً جان ہی چھڑا رہا تھا۔

''میرا اگلا ایک گھنٹہ اسی سائٹ کی نذر ہونے جا رہا ہے۔''

''اوکے، بیٹا جی، آپ لے آؤ بکس'' وہ آنچل سے مخاطب ہوا۔

بندروں کی قلقاریاں لگاتا زوہیب اور فل والیوم میں گانا گاتے احمر کو دیکھ کر وہ یہ سوچ رہی تھی کہ یہاں وہ پڑھے گی تو کیسے......؟

زین اس کے ہراساں چہرے کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ مسئلہ کیا ہے؟

وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''آ جاؤ عباد تم بھی۔''

''میں کیا کروں گا؟'' وہ حیران ہوا۔

''یہاں پر کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''تو وہاں بھی کچھ نہ کرنا۔''

''عباد نے کچھ دیر زین کی طرف دیکھا، پھر خلاف توقع خاموشی سے اُٹھ گیا۔

''کون سا ایئر ہے؟''

''سیکنڈ ایئر۔''

''واؤ، فرسٹ ایئر کلیئر ہے؟''

''جی کلیئر ہے۔'' اُسے ہنستا دیکھ کر آنچل کو تپ چڑھ گئی۔

''کون سی ایکسر سائز ہے؟'' بیڈ پہ آلتی پالتی مار کے وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''عباد تم خاموشی سے بیٹھنا۔ بیچ میں اپنی طوطی نہ ہلانا۔''

''تو پھر، تمہیں مجھے گھسیٹنے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ فوراً سے پہلے برا مان گیا۔

''سمجھا کرو نا یار! زین نے فلسفیانہ انداز اختیار کیا۔

آنچل خاموشی سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ ایسی فضول گفتگو تو دن میں کئی بار اس کے سامنے ہوئی تھی اور جب بھی ان لوگوں کا چکر لگتا تھا تو اس گفتگو کا دورانیہ زیادہ طویل ہو جاتا تھا۔

وہ اسے مختلف ایکسر سائز سمجھاتا رہا اور عباد اس دوران فل ٹائم اپنے کانوں میں ہیڈ فون لگائے گانے سننے میں مصروف رہا تھا۔

''بہت ایزی تھے یہ تو، اگر کچھ اور سمجھ نہیں آ رہا تو بتاؤ مجھے، میں سمجھا دیتا ہوں۔''

''نہیں، بہت شکریہ۔'' وہ بکس سمیٹنے لگی۔

''اب اجازت ہے مجھے بولنے کی؟'' عباد اُسے کتابیں سمیٹتے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''جی بالکل ہے، آپ بولیں۔''

''ارے تم کہاں جا رہی ہو؟'' آنچل کو دروازے

کی جانب بڑھتا دیکھ کر عباد بے ساختہ چلایا۔

''سونے جارہی ہوں۔'' اس نے بہ مشکل تمام اپنی جمائی روکی۔

''بیٹھو باتیں کریں گے۔''

''نہیں، کل۔ ابھی مجھے نیند آرہی ہے گڈ نائٹ۔'' وہ فوراً دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور پیچھے عباد اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔

☆......☆

حسب توقع اس کے سارے پیپرز ہی بہت اچھے ہوگئے تھے۔ اس لیے وہ حد سے زیادہ خوش تھی، چوں کہ ان دنوں گھر میں گیسٹ آئے ہوئے تھے۔ اس لیے اب اس کا زیادہ تر وقت کچن میں ہی گزرتا تھا۔ سب کے اپنے مزاج، اپنی پسند تھی، وہ اپنی امی کے ساتھ مل کے کچن چکر بن کر رہ گئی تھی۔

ڈنر کے بعد کافی دیر تک وہ سب کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہی۔ جب وال کلاک نے رات کے بارہ بجائے تو اس کی امی نے زبردستی سب کو کمروں میں بھیج دیا۔

اپنے کمرے میں آنے کے بعد سب سے پہلا خیال جو اُس کے ذہن میں آیا وہ اشعر سے بات کرنے کا ہی تھا۔

آنچل کی اشعر کے ساتھ دو، تین دفعہ بات ہوئی تھی، مگر مختصر گفتگو ہونے کی وجہ سے وہ اس کے بارے میں درست رائے قائم نہ کرسکی تھی۔

''ہوسکتا ہے۔ وہ سو رہا ہو۔'' میسج سینڈ کرنے سے پہلے اُس نے سوچا، اگر جاگ رہا ہوا تو ریپلائی تو ضرور کرے گا اور اگر نہ کیا تو سمجھوں گی کہ سو رہا ہے۔''

خود سے سوال جواب کرتے ہوئے آنچل نے اشعر کے نمبر پر ایک رومانٹک سی غزل سینڈ کردی۔

ایک ساعت بھی نہیں گزری تھی، جب اس کی کال آگئی۔

''تم سوئے نہیں ابھی تک؟'' وہ کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔

''تم جاگ رہی ہو تو پھر میں کیسے سو سکتا ہوں؟''

اس رات ان دونوں نے جی بھر کے باتیں کیں، اتنی کہ اجنبیت کی جو دیوار ان دونوں کے بیچ میں حائل تھی اب وہ گر کر پاش پاش ہوچکی تھی۔

اشعر نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتایا تھا۔ وہ دو بہن بھائی تھے، وہ اپنی بہن سے تین سال بڑا تھا اور ایم بی اے کر رہا تھا، جبکہ اس کی بہن ہانیہ سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔

آنچل نے اسے اپنے بارے میں کچھ بھی سچ نہیں بتایا تھا، حتیٰ کہ اپنا نام بھی وہ اسے اپنی دانست میں بے وقوف بنا رہی تھی، لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اسے بے وقوف بناتے بناتے وہ خود ہی بہت بڑی بے وقوف بننے جارہی ہے۔

☆......☆

آنچل اشعر کو پچھلے کچھ عرصے سے مسلسل ٹال رہی تھی۔ وہ اسے ملاقات کے لیے کہہ رہا تھا، مگر وہ اس بات سے سخت انکاری تھی۔ وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی، مگر دل تھا کہ مسلسل اس کے مثبت خیالات کی نفی کر رہا تھا۔ وہ خود بھی اس سے ملنا چاہتی تھی، وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اشعر جتنی خوب صورت باتیں کرتا ہے کیا وہ صرف باتوں کا ہی خوب صورت ہے، یا خوب صورت چہرہ بھی رکھتا ہے۔

وہ اسے کوئی ساحر لگ رہا تھا، جس نے اسے اپنی باتوں اور خوب صورت آواز کے سحر میں جکڑ کر اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

اس کو نہ دیکھنے کے باوجود اس کی آواز اور الفاظ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کتنا اٹریکٹو ہوگا۔

آنچل فیس بک یوز نہیں کرتی تھی، ورنہ اُسے فیس بک پہ ہی دیکھ لیتی اور موبائل بھی اس کا سمپل سا

تھا۔ ورنہ ایم ایم ایس سینڈ کرنے کا ہی کہہ دیتی کہ موبائل کمپنیز کی اس سہولت سے نوجوان لڑکے لڑکیاں بھرپور مستفید ہو رہے ہیں۔

آنچل کو ایسی لڑکیاں زہر لگتی تھیں جو رانگ نمبرز پر گھنٹوں گفتگو کرتی تھیں اور مختلف ڈیٹنگ پوائنٹس، پارکوں میں اپنے بوائے فرینڈز کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے گھومتے ہوئے یہ بھول جاتی ہیں کہ وہ کس تباہی کس دلدل کی طرف جا رہی ہیں۔

اس نے آج تک کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں کی تھی، سوائے اشعر کے ساتھ بات کرنے کے۔

اس دن بھی وہ اسی وجہ سے ناراض ہو گیا تھا۔

''تمہیں کیا مجھ پر ذرا بھی اعتبار نہیں ہے؟''

''بات اعتبار کی نہیں ہے۔ بات پسند، ناپسند کی ہے، جو چیز مجھے دوسروں کے لیے پسند نہیں ہے، اُسے میں خود کے لیے بھی پسند نہیں کر سکتی۔'' وہ دو ٹوک انداز میں بولی۔

''او کے بائے'' اتنا کہہ کر اُس نے بات ہی ختم کر دی۔

''اس میں ناراض ہونے والی کون سی بات ہے؟'' اس طرح کے کئی میسج اس نے اشعر کے نمبر پر سینڈ کر دیے، مگر جواب ندارد۔ تنگ آ کر آنچل نے بھی میسج کرنے بند کر دیے۔ کل شام ہی اُس نے احمر سے ایک نیا ناول منگوایا تھا۔ وہ اسے پڑھنے میں محو ہو گئی۔

جب کافی دیر تک اشعر کا کوئی میسج نہیں آیا تو اُسے الجھن سی ہونے لگی، عموماً اتنی دیر وہ اس سے ناراض نہیں ہوتا تھا۔

''کیا ابھی تک ناراض ہو؟'' آنچل نے پھر اس کے نمبر پر میسج سینڈ کر دیا۔ جب اس بار بھی اُس نے ریپلائی نہیں کیا تو آنچل کو واقعی غصہ آ گیا۔

''او کے اب آئندہ میسج مت کرنا، گو ٹو ہیل یو۔'' اپنی دانست میں اُسے لاسٹ میسج کرنے کے بعد وہ پھر سے ناول پڑھنے لگی۔

''کچھ ہی دیر گزری تھی، جب موبائل کی مخصوص میسج ٹون بجنے لگی۔ اُس نے جھٹ سے موبائل اٹھایا اور پٹ سے میسج اوپن کیا۔

''بھائی باہر گئے ہوئے ہیں، موبائل چارجنگ پہ ہے۔''

''ہیں...... یہ کیا تھا'' وہ حیران رہ گئی۔ ''یہ میسج کس نے بھیجا ہے؟''

''آپ کون؟'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''میں ہانیہ ہوں۔ آپ اُمید ہیں؟'' کچھ دیر بعد اُس نمبر سے میسج آیا۔

''جی، مگر آپ کو کیسے پتا؟''

''بھائی آپ کے بارے میں اکثر بات کرتے رہتے ہیں۔''

''کیا بات؟''

''یہی کہ وہ آپ کو بہت جلد میری بھابی بنانے والے ہیں۔''

''واٹ؟'' وہ سرتاپا غصے سے سلگ گئی۔

''مجھے امی بلا رہی ہیں، میں آپ سے بعد میں بات کروں گی، بھابی۔ بائے۔''

''یہ کیا بدتمیزی تھی۔'' کتنی ہی دیر وہ غصے سے کھولتی رہی۔ دو تین گھنٹے گزرنے کے بعد بھی جب، اس کے مسلسل میسجز کے باوجود بھی ریپلائے نہیں آیا تو اس کا غصہ سوا نیزے تک پہنچ گیا۔

☆......☆

زین بھرپور نیند لے کر صبح صبح اُٹھا تو بہت فریش تھا۔ اپنے گھر میں ان لوگوں کا معمول ڈیلی مارننگ واک اور ایکسر سائز کا تھا۔

عباد کو گہری نیند میں دیکھ کر اس کا دل پھر مچلا، کافی عرصے کے بعد عباد کو اٹھانے کا ایک آزمودہ اور کارآمد نسخہ آزمانے کا سوچا۔ اس نے ایک

جھٹکے سے اس کے اوپر پڑا کمبل اتارا اور دوسری جانب اُچھال دیا۔

''ارے کیا تکلیف ہے تمہیں، غصے اور نیند کے بوجھل پن سے اُس کی آواز عجیب سی ہو رہی تھی۔

''میں نے ایسی کوئی نازیبا حرکت نہیں کی جو تم یوں خفا ہو رہے ہو۔ میں نے تو تمہیں اُٹھانے کا وہی طریقہ استعمال کیا ہے، جو برسوں سے ہمارے گھر میں رائج ہے۔''

''اس کی وجہ؟'' عباد اسے مسلسل خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''ہاں اب تم نے کوئی قابل توجہ بات کی ہے۔ وہ ایسا ہے نا کہ میرا ایکسر سائز کا موڈ ہو رہا ہے۔ تو میں نے سوچا کیوں نہ تمہارا بھی موڈ بنا لیا جائے۔'' وہ اس کے کندھوں پر اپنا بازو پھیلائے ہوئے بولا۔

''میں نہیں جا رہا، تم خود چلے جاؤ، مجھے نیند آ رہی ہے۔'' وہ پھر سے سونے کے لیے لیٹ گیا۔

زین نے دوسرا تکیہ اٹھا کے اسے کھینچ کے مارا۔

''میں اب واش روم میں جا رہا ہوں اور جب میں واپس آؤں تو تم مجھے یہاں نحوست ٹپکاتے ہوئے نہ ملو۔ جلدی سے اُٹھ جاؤ، ہری اپ۔''

عباد نے غصے سے زین کی پشت کو گھورا، جو اس کی نیند خراب کرنے کے بعد خود فریش ہونے چلا گیا تھا۔ مجبوراً اسے بھی اٹھنا ہی پڑا، کیوں کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ زین نے اسے سونے نہیں دینا تھا یہ تو طے تھا۔ چار و نا چار اسے اپنی نیند کی قربانی دینی ہی پڑی۔

☆......☆

اشعر اس کی چاہے ہزار منتیں کرتا، لاکھ جتن بھی کرتا تو بھی شاید وہ اس سے ملنے نہ آتی۔ اگر وہ اس سے ملنے پر راضی ہوئی تو صرف اس کی بہن ہانیہ کی وجہ سے، اشعر تو اس سے ناراض ہو گیا تھا۔

اشعر کے ناراض ہونے سے آنچل کو ایک فائدہ ضرور ہو گیا تھا۔ اس کی ہانیہ کے ساتھ بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔

ہانیہ نے ہی اسے بتایا تھا کہ اشعر اسے کتنا پسند کرتا ہے۔ سارا دن آپ کی باتیں کر کر کے بھائی کی زبان نہیں تھکتی۔ آنچل خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ زندگی میں پہلی دفعہ کسی نے اسے اس طرح سے سراہا تھا۔ اتنی محبت کی تھی۔ اتنی اپنائیت، اتنی محبت، اتنی پسندیدگی، وہ خوش نہ ہوتی تو اور کیا کرتی۔

ہانیہ اس کے ساتھ گھنٹوں فون پر باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس کی باتیں زیادہ تر اشعر سے متعلق ہوتی تھیں۔ اس کے بچپن کی، اس کی شرارتوں کی، ہانیہ کے باتیں کرنے کا انداز بھی بالکل اشعر کی طرح ہی تھا۔ وہ بھی بہت خوب صورت باتیں کرتی تھیں۔ اتنی کہ باتیں کرتے کرتے وہ خود تھک جائے یا بور ہو جائے مگر سننے والا نہ تو تھکتا تھا اور نہ ہی بور ہوتا تھا۔ وہ اپنے بھائی سے یقیناً بہت محبت کرتی تھی، جبھی تو اس کی تعریفیں کر کر کے نہ تھکتی تھی۔

آنچل نے اشعر کو ایک فلرٹ لڑکا سمجھا تھا، جو اس کے ساتھ ساتھ نہ جانے اور کتنی لڑکیوں کو اُلو بنا رہا تھا۔ اسی لیے وہ بھی اسے بے وقوف بنانا چاہ رہی تھی، مگر اب ہانیہ کی باتیں سن کر اسے اپنی سوچ پر افسوس سا ہوا۔ اتنا اچھا لڑکا ہے۔ اور میں نے اسے کیا سمجھا، تف ہے مجھ پر، وہ اتنا شریف، اتنا معصوم......لڑکیوں سے کوسوں دور بھاگنے والا۔

اس دن وہ اپنی بھابی (اپنے تایا زاد کی منگیتر) کو نمبر ملا رہا تھا جو کہ غلطی سے آنچل کو مل گیا۔ وہ سمجھا آنچل اس کی بھابی کی کوئی کزن وغیرہ ہے، اسی لیے تنگ کر رہا تھا، مگر کال بند ہونے کے بعد جب اس نے نمبر دیکھا تو پتا چلا کہ غلطی سے مل گیا ہے، مگر آنچل

کی آواز اسے اتنی پیاری، اتنی معصوم لگی کہ دوبارہ کال کیے بنا رہ ہی نہیں سکا۔ یہ تمام باتیں اسے اشعر پہلے بتا چکا تھا، لیکن اس نے یقین نہیں کیا تھا۔ آج جب ہانیہ نے یہ سب کہا تو اسے یقین کرتے ہی بنی، کیوں کہ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ سچ بول رہی ہے۔

ہانیہ کے کہنے پر ہی وہ اشعر سے ملنے پر راضی ہوئی تھی، جو اس سے ناراض تھا۔

''جب یہ مجھ سے ملنے آئے گی تو میں تب ہی اس سے بات کروں گا۔'' ہمیشہ وہ یہی جواب دیتا، پھر آنچل کو اس سے ملنے پر راضی ہونا ہی پڑا۔

☆......☆

گاڑی اس نے احمر سے ڈرائیو کرنا سیکھی تھی۔ قریبی مارکیٹ یا فرینڈز وغیرہ کے گھر آنے جانے کے لیے اجازت نہ ملنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ جب سے اس نے ڈرائیونگ سیکھی تھی تب سے وہ کئی بار اکیلی مارکیٹ، ایمن (اپنی بیسٹ فرینڈ) کے گھر جا چکی تھی۔

وہ بلیک اینڈ بلیو کنٹراسٹ میں لائٹ سا میک اپ کر کے اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئی تھی۔ وہ نسبتاً ایک الگ تھلگ نیم تاریک گوشے میں بیٹھ گئی۔ ارد گرد بہت سارے لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان میں لڑکے اور لڑکیاں شامل تھے۔ سرگوشیوں میں باتیں، بلند و بانگ قہقہے ماحول کو ایک الگ طرح کی ہی لک دے رہے تھے، اس نے اپنے آدھے چہرے کو دوپٹے کی اوٹ میں کرلیا، وہ دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھی کہ ''اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟ یہاں تک آ گئی ہوں تو کچھ دیر اور دیکھتی ہوں، کوئی نہیں دیکھتا۔'' وہ خود کو تسلی دینے لگی۔

''کہاں ہو؟'' اس نے اشعر کے نمبر پر میسج بھیجا۔

''وہ پہنچ گیا ہوں یار! بس دو منٹ''

اشعر کا میسج پڑھ کر اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ بس پانچ

منٹ بیٹھوں گی یہاں، پھر چلی جاؤں گی۔ اس نے اپنے دھڑکتے دل کو تسلی دی۔

''ایکسکیوز می!'' ایک جانی پہچانی سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''جی'' آنچل نے چونک کر سر اٹھایا، مگر دوسرے ہی لمحے میں ڈر کے مارے اپنی آنکھیں نیچے کرلیں۔

''اُف یہ کیا مصیبت آ گئی ہے؟'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

''آپ نے مجھے مصیبت کہا؟'' بڑی اپنائیت سے پوچھا گیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' آنچل کو اس کے اپنائیت بھرے انداز پہ تاؤ ہی آ گیا۔

''آپ امید ہی ہیں نا؟'' اب کی بار مخاطب بھی چونک گیا۔

آنچل نے جواب کیا دینا تھا۔ گھبراہٹ کے مارے یہاں سے اٹھنے کی سوچنے لگی۔''

''میں اشعر ہوں۔'' یہ الفاظ کسی پگھلے ہوئے سیسے کی طرح آنچل کے کان سے ٹکرائے، اگر اس کے سر پر بم بھی پھوڑ دیا جاتا تو بھی اس کی یہ حالت نہ ہوتی، جتنی کہ یہ جملہ سن کر ہوئی تھی۔

''آپ امید ہیں؟'' وہ شش و پنج میں لگ رہا تھا۔

''ہاں'' بڑی ہی مشکل سے اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

''تھینک گاڈ! تم آ گئیں، میں تو سمجھا تھا کہ تم اپنی جگہ اپنے کسی بھائی کو بھیج دو گی۔'' اپنی بات پہ وہ خود ہی قہقہہ لگا کر ہنسا۔

وہ اسے دیکھ کر بالکل شاکڈ رہ گئی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

''تم تو میرے وہم و گمان سے بڑھ کر خوب صورت ہو۔'' اپنا ہاتھ اس کے سفید مخملی ہاتھ کی طرف بڑھایا۔

آنچل نے کرنٹ کھانے کے سے انداز میں اس سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچا۔

''واٹ ربش؟'' وہ غصے سے بولی۔

''اوہ، سوری۔'' وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا، اپنی عزت افزائی پہ۔

آنچل کو اب اپنی پوزیشن کا خیال آیا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے سر اور چہرے کو دوپٹے کی اوٹ میں کیا۔

''اوکے..... کیا کھاؤ گی تم؟'' وہ ویٹر کو آواز دیتے ہوئے بولا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' آنچل کو اس کے وجود سے سخت گھن آ رہی تھی۔

''میں چلتی ہوں کچھ دیر کا کہہ کر آئی تھی۔'' وہ اپنا بیگ اُٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

''مگر.....؟ اتنی جلدی؟'' اسے اس کے رویے کی بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ فون پہ تو ٹھیک طرح سے بات کرتی تھی، مگر اب اچانک......؟

''بائے'' وہ جواب دیے بغیر کھٹ کھٹ جلدی سے بھاگی، باہر آ کر اسے کچھ سکون سا ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے قید سے اچانک رہائی مل گئی ہو۔

☆......☆

گھر واپس آنے کے کتنی ہی دیر بعد اس کے حواس درست ہوئے تھے۔

''اف! یہ کیا چیز تھا؟ اُس کا گہرا سانولا رنگ، بھدے نقوش، چہرے سے ٹپکتی عجب طرح کی وحشت، اُف.....'' سب یاد آتے ہی اُسے پھر سے جھرجھری آ گئی۔

اسی وقت ایمن کی کال آ گئی۔

''ہائے یار! کیا کر رہی ہو؟''

''کچھ نہیں یار!'' آنچل نے گم صم لہجے میں جواب دیا۔

''کیا ہوا ہے یار! اتنی بدحواس کیوں لگ رہی ہو؟'' وہ اس کی آواز سے ہی پہچان گئی کہ کوئی گڑبڑ

ہے۔ ان دونوں کی بچپن کی دوستی تھی۔ جب تک معمولی سے معمولی بات بھی ایک دوسرے کو بتا نہ دیتیں، تب تک دونوں میں سے کسی کو بھی چین نہیں آتا تھا۔ آنچل بھی جیسے اُس کے پوچھنے کے انتظار میں تھی۔ آدھی بات وہ اسے پہلے ہی بتا چکی تھی، آدھی اب اس کے پوچھنے کے بعد بتادی۔

پوری بات سننے کے بعد اس کے قہقہے ہی تھمنے میں نہ آرہے تھے۔

''میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا، بنا دیکھے اس سے دوستی مت کرو۔ مگر تم پر تو اس کی آواز کا جادو چل گیا تھا نا۔'' وہ ایک دفعہ پھر ہنسی۔

''ہاں، بس ہوگئی غلطی۔''

''چلو، اچھی بات ہے۔''

''غلطی کرنا اچھی بات ہے؟'' اسے اچنبھا ہوا۔

''نہیں یار......! اس کا احساس ہوجانا اچھی بات ہے۔''

''اچھا میں نے تمہیں بتانا تھا کہ سنڈے کو میرا شاپنگ کا پروگرام ہے۔ تم چل رہی ہونا میرے ساتھ؟''

''ہاں چلوں گی، مجھے بھی کچھ شاپنگ کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں تم سے رات میں بات کروں گی، ابھی بزی ہوں اوکے بائے۔''

''ٹھیک ہے بائے'' کال بند کرنے کے بعد اُس نے اپنا سر بیڈ کراؤن سے لگالیا۔

☆......☆

ساری رات وہ سو نہیں سکی تھی۔ مختلف طرح کی سوچیں اُسے گھیرے رہیں، سونے کی بے پناہ کوشش کرنے کے باوجود بھی سو نہیں سکی تھی، نہ جانے کون سی چیز اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔ اس کے سر میں شدید درد ہونے لگا تھا۔

سورج طلوع ہوچکا تھا، کمرے میں اسے گھٹن سی ہو رہی تھی، وہ چہل قدمی کرتے ہوئے ٹیرس پہ آ گئی، کافی دیر تک وہ خاموش نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیتی رہی۔

کچھ ہی دیر بعد اس خاموش ماحول میں عجیب طرح کی ہلچل سی ہوئی، اس نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ عباد اور زین یقیناً ایکسرسائز کر رہے تھے۔ وہ بھی ان لوگوں کے پاس آ گئی۔

''کیا ہو رہا ہے گائز؟'' ان دونوں کی اس کی طرف کمر تھی۔ اس لیے اس کی آواز پر چونک پڑے۔

''تم اتنی صبح کیسے جاگ گئی ہو؟'' زین کو اسے دیکھ کر انجانی سی خوشی ہوئی، ساری رات ہی آنچل کا عکس اس کی آنکھوں میں جھلملاتا رہا تھا۔

''بس ایسے ہی رات کو سو نہیں سکی، اس وقت بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ آپ لوگوں کو لان میں دیکھا تو سوچا کہ میں بھی آجاؤں۔ آپ کے ساتھ گپ شپ ہی ہوجائے گی۔''

''کیوں، سو کیوں نہیں سکی، موویز دیکھتی رہی ہو؟'' عباد شرارت سے بولا۔

''نہیں، طبیعت خراب تھی'' وہ کچھ تپ سی گئی۔

''کیا ہوا طبیعت کو؟'' عباد کو آنکھیں دکھانے کے بعد وہ اس سے تشویش سے پوچھنے لگا۔

''بس ایسے ہی سر میں درد تھا'' وہ لان میں پڑی ہوئی چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''تو آرام کرو، یہ نہ ہو زیادہ طبیعت خراب ہوجائے۔'' زین کو پھر تشویش نے گھیرا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔

''تمہارے لیے نہیں ہے، مگر اس کے لیے ہے۔'' عباد نے پھر سے اپنی طوطی ہلائی۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔

''کوئی مطلب وطلب نہیں ہے۔ اس کی باتوں کا عموماً کوئی مطلب نہیں ہوتا، بس ایسے ہی بے تکی ہانکتا ہے۔'' زین اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''آنچل اس کی بات پہ ہنس پڑی، کیوں کہ زین نے اس کے دل کی بات کی تھی، اب اس کی طبیعت کافی حد تک بہتر ہوگئی تھی اور دل کا بوجھل پن بھی قدرے کم ہوگیا تھا۔

☆......☆

اس نے تین، چار، دن موبائل آف رکھنے کے بعد اب آن کیا تھا۔ اشعر اور ہانیہ کے بہت سارے میسجز آئے ہوئے تھے۔ اس نے تمام میسجز پڑھے بغیر ڈیلیٹ کر دیے اور موبائل کو ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔ اس کا اس وقت کسی بھی چیز کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ ایک عجیب طرح کی بےزاری اس پر طاری تھی، دل کا بوجھل پن کسی طرح سے بھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

اشعر کی شبیہہ اس کے مائنڈ میں کچھ اور تھی اور اس کو دیکھنے کے بعد اس کی جو ذہنی حالت ہوئی، وہ یقیناً بیان سے باہر تھی۔

''اگر گھر والوں میں سے کوئی دیکھ لیتا تو......؟'' یہ سوال الگ اسے سوئی کی نوک کی طرح چبھتا تھا۔ موبائل کی چیختی ہوئی ٹون اسے خیالات کی دنیا سے باہر لے آئی۔

کال ہانیہ کے نمبر سے تھی۔ آخری دفعہ بات کرنے کا سوچ کر اس نے کال ریسیو کرلی۔

''کیسی ہیں آپ امید؟'' وہ شاید رو رہی تھی۔ اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں، کہیے کیسے فون کیا؟'' اجنبی لہجہ، بے مروت انداز، ہانیہ تو ہانیہ آنچل خود بھی اپنے رویے سے شرمندہ ہوگئی۔

''آپ نے اشعر بھائی سے کیا کہا ہے؟''

''میں نے کیا کہنا تھا؟'' وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگی۔

''اشعر بھائی نے سوسائیڈ کرلی ہے اور اس کی ذمے دار آپ ہیں۔'' وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ آنچل بالکل گم سم سی ہوگئی۔

''یہ کیا ہوگیا؟'' وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اشعر اس کی محبت میں اس حد تک بھی جا سکتا ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ خود پہ رشک کر رہی ہوتی، مگر اب بات دوسری تھی۔

''آپ نے بھی باقی لوگوں کی طرح ان کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھا ہے، میرا بھائی دل کا کتنا اچھا ہے یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ آپ کو ان کا سانولا رنگ تو دکھائی دے گیا، مگر شیشے جیسا شفاف دل نہیں، آپ کو اُن کی صورت تو دکھائی دے گئی، مگر اچھا کردار نہیں۔'' اس نے روتے روتے فون بند کر دیا۔ اور آنچل جہاں کی تہاں رہ گئی۔

☆......☆

وہ ابھی ایک شاکڈ سے سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ دوسرا اُس سے بھی زیادہ شدید شاکڈ اسے تب لگا جب اس کی پھوپو نے زین کے نام کی رنگ اس کی انگلی میں ڈال دی۔ وہ بالکل شاکڈ رہ گئی، اس کے تو وہم و گمان میں بالکل بھی یہ بات نہیں تھی۔

زیادہ غصہ اسے اپنے امی ابو پر آ رہا تھا، جنہوں نے اس سے پوچھنا تو درکنار بتانا بھی گوارا نہ کیا تھا۔ انہوں نے تو مجھے بالکل ہی بچی سمجھ لیا ہے۔ جو میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ میری مرضی جانے بغیر طے کر دیا۔ اگر مجھ سے پوچھ لیتے تو کون سا گناہ ہو جانا تھا۔ وہ سوچتی رہی اور کڑھتی رہی۔

اس کی پھوپو نے نیا گھر بھی خرید لیا تھا اور وہ جلد ہی اس میں شفٹ ہونے والے تھے اور بزنس کا سیٹ اپ بھی آخری مراحل میں تھا۔ زین اسی سلسلے میں بزی رہتا تھا، اس لیے گھر بھی اب کم کم دکھتا تھا۔

اس دن کے بعد نہ تو اشعر نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی، نہ ہانیہ نے، وہ دل ہی دل

میں ڈر رہی تھی۔ خود کو اشعر کا مجرم سمجھتے ہوئے اس نے ہزاروں بار خود کو لعن طعن کی تھی۔ جب سے ہانیہ نے اسے اشعر کی سوسائیڈ کا بتایا تھا، تب سے وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔

''پتا نہیں زندہ ہے بھی یا نہیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے ہمدردی کرنے پر مجبور تھی، میری ہی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔'' وہ دن میں کتنی ہی بار یہ بات سوچتی۔

مگر جب اس کی شکل اور اس کے ہاتھ کی جانب ہاتھ بڑھانے کا انداز یاد آتا تو اسے جھرجھری سی آجاتی۔

''بس لاسٹ ٹائم اس سے بات کروں گی۔ اگر وہ زندہ ہوا تو، اُسے سمجھاؤں گی، بتاؤں گی کہ میری منگنی ہو چکی ہے، پھر ہم چینج کرلوں گی، مجھے کون سا اُس کی شکل نظر آئے گی جو ڈر لگے گا۔'' وہ خود کو خود ہی سمجھاتی رہی۔ تسلیاں دیتی رہی۔

آنچل کو اس سے ہمدردی بھی ہو رہی تھی اور اُس سے بات کرنے سے ڈر بھی لگ رہا تھا، پھر کچھ دیر بعد ہمدردی کے جذبے نے ڈر کو مات دے دی۔

''کیسے ہو؟'' اُس نے جھجکتے جھجکتے میسج کیا۔ وہ خود کو ہر طرح کی بات سننے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی۔ کافی دیر تک ریپلائی نہ آیا، اُس نے دوبارہ میسج کرنے کی کوشش کی، مگر پھر ہمت کر کے کال ہی کر دی۔

بیلز جاتی رہیں، مگر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا۔ چوتھی پانچویں بیل پہ کسی نے کال اٹینڈ کرلی۔

''ہیلو۔'' بھاری گمبھیر سی آواز گونجی، جو یقیناً اشعر کی تھی۔

''اشعر! کیسے ہو؟'' آنچل کو اس کی آواز سن کر انجانی سی خوشی ہوئی۔ وہ زندہ ہے یہ احساس سکون کی طرح اس کی روح میں سرایت کر گیا۔

''زندہ ہوں؟'' اکھڑا اکھڑا سا لہجہ۔

''سارا قصور میرا ہے۔ میری وجہ سے ایسا ہوا ہے۔'' یہ اشعر اُس اشعر سے قطعاً مختلف تھا، جسے وہ جانتی تھی۔ شریر لہجہ، شوخ الفاظ، اس کے انداز میں زندگی کی رمق پائی جاتی تھی، مگر اب وہ زندگی سے ہارا، مایوس اور غموں سے چور انسان لگ رہا تھا۔

''مجھے ہانیہ نے تمہاری سوسائیڈ کا بتایا تھا، اب کیسے ہو تم؟''

''میرا حال پوچھنے کی بجائے اگر تم یہ پوچھتیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا تو تم یہ بات پوچھتے ہوئے اچھی بھی لگتیں۔''

وہ چپ کی چپ رہ گئی، کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کہے تو کیا کہے۔

''ویسے میں اتنا بُرا ہوں نہیں، جتنا نظر آتا ہوں۔'' وہ کٹ کر رہ گئی۔

''شکل و صورت بنانا انسان کے اپنے اختیار میں کہاں ہوتا ہے۔ ہم کسی کی بدصورتی کی وجہ سے اس سے نفرت کیسے کر سکتے ہیں؟ کسی کی اچھائی یا بُرائی کا معیار اس کی خوب صورت یا بدصورتی کی بنا پر تو قائم نہیں کیا جا سکتا۔''

''ہانیہ کیسی ہے؟'' وہ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

''ٹھیک ہے۔'' پہلی دفعہ اس سے اتنی مختصر اور لیے دیے انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

''اس نے بھی مجھ سے بات نہیں کی۔''

''تم نے کب اس سے بات کرنی چاہی تھی؟''

وہ ایک دفعہ پھر لاجواب ہو گئی، واقعی اس نے بھی تو ہانیہ سے بات نہیں کی تھی۔ یہ خود اُس سے جان چھڑانا چاہتی تھی، مگر اس کے باوجود لاشعوری طور پر اس کے کال اور میسجز کا انتظار بھی کرتی رہتی تھی اور ہانیہ وہ تو اس سے ناراض تھی اور اس کے پاس ناراض

ہونے کا اچھا خاصا جواز تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ خود ہی بول پڑا۔

''ایکچولی، وہ تم سے ناراض ہے، مجھ سے محبت جو بہت کرتی ہے۔ اس لیے کوئی مجھے دُکھ دے وہ برداشت نہیں کرسکتی۔ میں چاہے لاکھ بدصورت سہی مگر اس کی نظر میں دنیا کا خوب صورت ترین انسان ہوں، آخر کو اس کا بھائی جو ہوں۔ ویسے ایک بات بتاؤ تو اُمید؟ کیا محبت بھی شکل وصورت دیکھ کر کی جاتی ہے؟''

آنچل کو لگا جیسے وہ اسی پر طنز کر رہا ہے، وہ اپنی جگہ شرمندہ سی ہوگئی۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

''میرے پاس آپ کی بات کا جواب نہیں ہے۔''

فون بند کرنے کے کتنی ہی دیر بعد تک بھی وہ گم صم سی بیٹھی رہی۔ اشعر سے بات کر کے دل کا بوجھ کم کیا ہونا تھا، مزید بڑھ گیا تھا، اس کی افسردگی اور مایوسی دیکھ کر۔

''ایک کپ کافی مل سکتی ہے؟'' وہ رات کے برتن دھونے کے بعد اپنے کمرے میں جانے ہی والی تھی۔ جب زین کی آواز پہ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''جی بنا دیتی ہوں۔''

''اگر زحمت نہ ہو تو۔''

''نہیں زحمت کی کیا بات ہے اس میں۔''

''ہاں! اب تو ساری عمر یہ ہی کرنا ہے۔''

آنچل نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ کہہ کر جا چکا تھا۔ وہ پھر سے سوچوں کے سمندر میں غرق ہوگئی۔

اس نے آج تک کسی کا دل نہیں توڑا تھا۔ کسی کو دُکھی نہیں کیا تھا، ناراض نہیں کیا تھا۔ وہ اشعر کا دل توڑنے سے ڈرتی تھی، مبادا کہیں وہ بددعا نہ دے دے۔ وہ اس سے نہ چاہتے ہوئے بھی بات کرنے پر مجبور تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ذات کسی کے لیے دکھ کا باعث بنے۔

ابھی تک اسے اپنی منگنی کے بارے میں بھی نہیں بتا سکی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بات سننے کے بعد اس کا خودکشی کا پھر سے موڈ بن جائے۔

''کیا کروں، اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' اس نے خود سے پوچھا۔

''خواب بھی تو میں نے ہی دکھائے تھے نا اُسے، اب غلطی کی ہے تو سدھارنا تو پڑے گا ہی مگر کیسے؟''

یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اسے مل کر نہ دے رہا تھا۔

☆......☆

ایمن کی بہن کی شادی تھی، اس لیے آئے دن اس کے بازار کے چکر لگتے اور ساتھ میں وہ آنچل کو بھی گھسیٹ لیتی تھی۔

آج بھی معمول کی طرح سارا دن شاپنگ کے نام پر خوار ہونے کے بعد انہیں اب پیٹ پوجا کی سوجھ رہی تھی۔ ایک ریسٹورنٹ کے پاس گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ نیچے اتریں۔ ایمن اس سے آگے تھی اور وہ ایمن کے پیچھے تھی، جب اس نے ایمن کی حیرت بھری آواز اور پھر ہنسی سنی، مگر اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، آنچل کے دوبارہ استفسار پر وہ بولی۔

''کچھ خاص نہیں کہہ رہی تھی، بس اس لنگور کے بارے میں بات کر رہی تھی، مجھے سمجھ نہیں آتا اسے اتنی حسین لڑکیاں کیسے مل جاتی ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''کیا کہہ رہی ہو؟'' آنچل کو کچھ سمجھ نہ آئی۔

''وہ سامنے دیکھو، تمہیں وہ لڑکا نظر آرہا ہے بلیک شرٹ والا؟''

آنچل نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا، وہاں بلیک شرٹ میں دو لڑکے تھے۔

''ہاں، ایک نہیں بلکہ دو، دو کیوں؟''

''وہ جس نے ہاتھ میں موبائل اٹھایا ہوا ہے۔''

''چھوڑو، دفع کرو، تمہیں کیا ہے۔ آنچل

سخت جھنجلائی۔

''ہاں، مجھے کیا چلو۔'' وہ پھر سے اپنے مخصوص اسٹائل میں ہنسی۔

وہ لوگ پارکنگ ایریا سے باہر نکل رہی تھیں۔ آنچل نے ابھی دو، چار قدم ہی اٹھائے تھے کہ ٹھٹک کر رک گئی۔

''تم اس لڑکے کے بارے میں بات کررہی ہو۔ جس نے موبائل ہاتھ میں اُٹھا رکھا ہے؟'' وہ کچھ تذبذب کا شکار لگ رہی تھی۔

''ہیں...... ہاں وہی، مگر اب تمہیں کیا ہوا؟'' اس نے بھی اس کے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

آنچل نے کوئی جواب نہ دیا بس حیرت کا بت بنی کھڑی رہی۔ عین اسی لمحے اس لڑکے نے بھی اس کی جانب دیکھا۔

اور پھر جیسے پتھر کا ہوگیا۔

''اب چلو بھی، بھوک بھوک کا شور مچا کے میرا دماغ خراب کردیا تھا تم نے۔ ایمن اسے کھینچتے ہوئے اندر لے گئی۔

''اف! کتنا تھک گئے ہیں نا اور تمہیں کیا ہوا ہے۔'' اس کے دھواں دھواں ہوئے چہرے کو دیکھ کر وہ چونک گئی۔

''ابھی کچھ دیر قبل تم مجھے وہ لڑکا کیوں دکھا رہی تھی؟'' اس کی سوئی ابھی تک کسی غیر مرئی نقطے پر ٹکی ہوئی تھی۔

''میری آنٹی کے نئے کرائے دار آئے ہیں یہ۔ اُف......! ابھی تم نے دیکھا تھا نا وہ نمونہ، کیا بتاؤں تمہیں، ایک نمبر کا لوفر ہے یہ، کتنی ہی لڑکیوں کے ساتھ اس کا افیئر ہے اور لڑکیاں بھی وہ جو ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اتنی خوب صورت لڑکیاں اس سے دوستی کرکیسے لیتی ہیں؟ یا شاید وہ بھی اس کی ہی طرح ٹائم پاس کررہی ہوتی ہیں۔ اس کی اپنی بہن نہیں ہے کیا؟'' وہ ایک خیال آنے پہ پوچھ بیٹھی۔

''بہن تو نہیں، ہاں اس کی ایک کزن ساتھ رہتی ہے، جو اس کی ہی طرح فلرٹی ہے اور ان حرکتوں میں اس کا ساتھ دیتی ہے۔''

''اوہ مائی گاڈ'' اس کا سر بہت بری طرح سے دکھنے لگا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام کر رہ گئی۔

''تمہیں آخر ہوا کیا ہے۔'' ایمن اسے تشویش سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں نے تمہیں اشعر کے بارے میں بتایا تھا نا۔''

وہ روہانسی انداز میں بولی۔

''ہاں، مگر، کیوں؟''

''وہ یہی ہے۔'' آنچل ایسے انداز میں بولی جیسے اعتراف جرم کررہی ہو۔

''کیا؟'' ایمن اسے چند لمحے حیرت سے دیکھتی رہی، پھر اس کے فلک شگاف قہقہے چھت کو پھاڑنے لگے۔ اسے اردگرد بیٹھے لوگوں کا بھی ہوش نہیں رہا تھا، جو حیرت اور دلچسپی سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگی۔

''اُف یار! تم اتنی بے وقوف ہو۔'' بے تحاشا ہنسنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

آنچل اس کی طرف خاموش نظروں سے دیکھتی رہی۔ واقعی میں بہت بے وقوف ہوں اور بہت بری طرح سے بے وقوف بنائی گئی ہوں، اس نے دل میں سوچا اور اپنی اس بے وقوفی پر ایمن کی طرف دیکھ کر مسکرادی۔

اس کے دل و دماغ، ذہن پر جو بوجھ تھا وہ چھٹ گیا تھا۔ قریب ہی سے میوزک کی آواز اب تیز ہوگئی تھی۔

یہ دنیا پتّل دی
یہ دنیا پتّل دی
بے بی ڈول میں سونے دی

وہ بے ساختہ مسکرائی اور پھر ایمن کے ساتھ اُس کے بھی فلک شگاف قہقہے چھت پھاڑنے لگے۔

☆......☆

اس کی تینوں بیٹیاں آج ایک اچھے مقام پر تھیں۔ مینا نے ایم ایس سی کی تھی اور ایک ہائیر سیکنڈری اسکول میں سائنس ٹیچر تھی۔ رطابہ ایم بی بی ایس کر رہی تھی اور وہ تھرڈ ایئر میں تھی۔ پرانے پورشن کا پہلا کمرہ اب اسٹڈی روم میں تبدیل ہو چکا تھا جو کہ زیادہ تر رطابہ کے ہی......

زندگی کی کٹھنائیوں کو عیاں کرتے، ایک خوبصورت ناولٹ کا دوسرا حصہ

سلطانہ کا ہاتھ ابھی تک بڑھا ہوا تھا۔ کچھ تذبذب سے شاہین نے وہ چوڑیاں تھام لیں۔

''ایک منٹ......'' سلطانہ نے کہا تھا اور پھر وہ تخت سے اٹھی تھی اور شاہین کے ہاتھ سے چوڑیاں لے کر اس کی دائیں کلائی میں چڑھا دیں۔ چوڑیاں شاہین کے ہاتھ میں بھی اسی طرح فٹ تھیں، جس طرح سلطانہ کے ہاتھ میں۔

'میرا شوہر...... میری چوڑیاں......' یہ سوچ سلطانہ کے ذہن میں آئی تھی اور تخت پر بیٹھتے ہوئے سلطانہ نے خود کو سرزنش کی تھی اور مزید کچھ ایسا سوچنے سے باز رکھا تھا۔

سیف نے سلطانہ کو چوڑیاں پہناتے ہوئے حیرت سے دیکھا تھا اور اسے ایک سرشاری سی محسوس ہوئی تھی۔ اسے کافی اچھا لگا تھا یہ سب کچھ...... اور ایک بار پھر سے خاموشی چھا گئی تھی۔

نینا کو بھی صورتِ حال کی تھوڑی سی سمجھ بوجھ تھی اور وہ سمجھ بھی رہی تھی۔

سلطانہ تخت پر بیٹھی شاہین کی گود میں موجود بچے کو دیکھ رہی تھی۔

اب شاہین کی باری تھی۔

چوڑیاں دینے کا فیصلہ سلطانہ نے یہیں بیٹھے بیٹھے کیا تھا، لیکن شاہین جو کچھ دینا چاہتی تھی، اس کے بارے میں گھر سے سوچ کر آئی تھی اور اس کے بارے میں اس نے سیف کو بھی نہیں بتایا تھا۔

شاہین ہچکچاتے ہوئے اٹھی اور تخت کے پاس پہنچ کر سارہان کو سلطانہ کی گود میں دے دیا۔

''یہ آپ کا بیٹا ہے اور اپنے بیٹے کی تمام پرورش اور تربیت آپ خود کریں گی۔'' یہ کہہ کر شاہین واپس چارپائی پر بیٹھ گئی۔

سیف کے ساتھ ساتھ حیران ہونے کی باری اب سلطانہ کی تھی۔

''میرا بیٹا......'' سلطانہ نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا تھا۔

اس نے بے یقینی سے شاہین اور سیف کو باری باری دیکھا تھا اور پھر گود میں موجود تین مہینے کے بچے

کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''میرا بیٹا......'' سلطانہ نے ایک بار پھر بے یقینی سے کہا تھا اور فرطِ مسرت سے بچے کا ماتھا چوم لیا تھا

اور اس کی آنکھوں میں بھی نمی آ گئی تھی۔

'شاہین واقعی چاہے جانے کے قابل ہے۔' سلطانہ نے سوچا تھا۔

☆……☆……☆

بچپن میں شاہین پڑوسن تھی سیف کی، سامنے والا گھر شاہین کا ہوا کرتا تھا۔ وہ لوگ کرائے کے مکان میں رہتے تھے، لیکن بعد میں انہوں نے شہر کے دوسرے کونے میں گھر خرید لیا تھا۔

بچپن میں سیف ہر وقت ''چھائیں چھائیں'' کرتا رہتا اور اسی چھائیں اور شاہین کے درمیان کہیں اِس پر وہ مر مٹا تھا۔

وہ شاہین کو ہر وقت اپنا سمجھتا تھا۔ کبھی خیال بھی نہ گزرا تھا کہ...... سیف کی ماں بھی بیٹے کے حال سے واقف تھی اسی لیے شہر کے دوسرے کونے میں ان کا گھر ہونے کے باوجود بھی انہوں نے آنا جانا رکھا تھا۔ جب سیف نے معاش ڈھونڈ لیا تو انہوں نے رشتہ بھی ڈال دیا۔

نہ ملاقات، نہ راز و نیاز، نہ کچھ اور ایسی باتیں، مگر سیف کو یقین تھا کہ شاہین بھی اسے پسند کرتی ہے۔

لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے سیف کا رشتہ ٹھکرا کر دو ماہ بعد ایک بہت بڑے گھر میں شاہین کی شادی طے کر دی۔

سیف نے دو ماہ، رو رو کر...... خدا سے گڑگڑاتے ہوئے دعائیں مانگ کر، شاہین کی رفاقت مانگتے ہوئے اور اپنے تمام نیک کاموں کے واسطے دے کر یہ دعا مانگتے ہوئے کہ اسے اس کی محبت مل جائے گزارے تھے۔

لیکن......شاہین کی اس بڑے گھر میں شادی ہوگئی۔

وہ بڑے گھر والے چھوٹے دل کے لوگ تھے، خصوصاً شاہین کا شوہر، جو انتہا کا اذیت پسند تھا، اسے مارتا، پیٹتا اور ذہنی ایذا پہنچاتا تھا۔ شاہین کی بھی غلطی تھی کہ اس نے بھی کبھی اپنے والدین کو نہ بتایا تھا۔

وہ ہون لے کر بیٹھا رہتا اور دو دو، تین تین گھنٹے اسے شاہین کے سر پر مارتا رہتا۔ چار سالوں میں اس جانور نما انسان نے شاہین کو اس قدر اذیت دی کہ وہ ایک نفسیاتی مریضہ بن گئی۔

شاہین کے والدین ان باتوں سے اس لیے بے خبر رہے کہ شاہین بیاہ کر لاہور چلی گئی تھی۔ اس کے شوہر کے کاروبار کا بڑا حصہ لاہور میں تھا۔ چار سال بعد جب وہ مکمل طور پر نفسیاتی مریضہ بن گئی اور اسے کسی چیز کا ہوش نہ رہا تھا تو اسے میکے میں طلاق دے کر چھوڑ آئے اور سوغات میں نینا بھی دی تھی کہ انہیں نینا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

شاہین کی حالت کے ذمے دار اس کے ساس، سسر اور شوہر تینوں تھے، لیکن شاہین کے والدین...... بے چارے غریب اور متوسط طبقے کے لوگ کیا کر سکتے تھے۔ دوسری طرف سیف کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ اس وقت اس نے مذہب میں پناہ لی، جہاں اسے سکون اور صبر ملا۔

لیکن شاہین تو شاید اس کے دل میں پیوست ہوگئی تھی۔ اسی لیے وہ اس کا خیال دل سے نہ نکال سکا تھا۔ یہاں تک کہ سیف کو اس کی ماں سلطانہ سے منسلک کر کے خود ملکِ عدم سدھار گئی تھی۔

سلطانہ کے آنے سے بھی شاہین کے مقام میں تبدیلی نہ آئی تھی اور سلطانہ اتنی سیدھی سادی تھی کہ کبھی اس نے محبت کے موضوع پر سوچا ہی نہ تھا، کجا سیف کو یا اپنے آپ کو ٹٹولتی۔ اور پھر اوپر تلے ہونے والی دو بیٹیاں۔ وہ تو مصروف سے مصروف تر ہوتی گئی۔ انہی دنوں شاہین واپس میکے آئی تھی اور کسی نہ کسی طرح سیف کو پتا چل گیا تھا۔ اور پھر وہ وہاں شاہین سے ملنے گیا تھا۔

سیف کو دیکھ کر شاہین کتنا روئی تھی اور سیف بھی اسے دیکھ کر کس قدر رویا تھا۔ اور ان کے آنسوؤں نے ہی تمام چیزیں واضح کر دی تھیں۔

شاہین دماغی اور جسمانی طور پر تندرست نہیں تھی۔ کبھی کبھی اسے کچھ یاد نہ رہتا، تو کبھی اسے ہر چیز

سے خوف آنے لگتا تھا۔
سیف نے اپنے دماغ کو کچھ بودی دلیلوں سے راضی کیا تھا۔ اور کچھ پس و پیش کے بعد شاہین اور اس کے والدین بھی راضی ہو گئے تھے۔ اب سیف کا ارادہ تھا کہ نکاح کے بعد ہی وہ سلطانہ کو اس بات سے مطلع کرے گا۔
سادگی سے نکاح ہوا اور نکاح کے اگلے دن شاہین سیڑھیوں سے گر پڑی تھی۔
اکیس سیڑھیاں...... وہ لڑھکتی ہی چلی گئی تھی۔
اس کے سر پر شدید چوٹ لگی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنا دماغی توازن بالکل کھو بیٹھی تھی اور پھر چھ سال لگ گئے اسے ٹھیک ہوتے ہوتے۔ سیف نے بہت اچھے نیورو سرجن اور سائیکاٹرسٹ سے رجوع کیا تھا۔ کبھی گھر اور کبھی اسپتال میں......
سیف کی دکان میں بڑی برکت تھی لیکن کافی حصہ تو شاہین کے علاج معالجے پر خرچ ہو جاتا تھا، سو سلطانہ کو دینے کے لیے اس کے پاس کم پیسے بچتے تھے۔ سیف نے سلطانہ سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ کسی دوست کے پاس جاتا ہے اور دس پندرہ دن بعد اس کے پاس رات ٹھہرتا ہے۔ پتا نہیں کیوں وہ اس وقت تک شاہین کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتی۔
چھ سال بعد وہ ٹھیک ہوئی تھی اور سلطانہ کو بتاتے ہوئے اسے دس مہینے لگ گئے تھے جب تک ساربان بھی اس دنیا میں آ گیا تھا۔
تین مہینوں تک شاہین گھر بھی آ گئی تھی اور ساربان کو سلطانہ کے حوالے بھی کر دیا تھا۔
صرف چند مہینے لگے تھے۔ سلطانہ کو شاہین کو سمجھنے میں اور پھر زندگی ایک خوشگوار تاثر لیے ایک ڈگر پر آ گئی تھی۔
سیف، سلطانہ اور شاہین یا پھر سیف، شاہین اور سلطانہ ترتیب سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ سیف اپنے آپ کو سلطانہ کا مقروض سمجھتا تھا۔ جس طرح سلطانہ نے شاہین کا خیر مقدم کیا تھا۔ سیف سلطانہ کا احسان مند ہو گیا تھا، لیکن سلطانہ نے ٹوک دیا تھا۔
''ممنونیت ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''
تب سیف کو اندازہ ہوا تھا کہ سلطانہ بھی اس سے بہت پیار کرتی ہے شاید اتنی ہی جتنی وہ شاہین سے کرتا ہے۔ یہی وجہ تھی سلطانہ سب کچھ سمجھ گئی تھی اور شاہین کا استقبال اس نے کھلے دل سے کیا تھا۔
سیف نے سلطانہ سے ایک بار معافی بھی مانگی تھی۔
''دوسری شادی کا حق تو مجھے اسلام نے بھی دیا ہے۔'' یہ الفاظ نکلتے ہی سیف کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ کس قدر سخت بات کہہ گیا ہے۔ ویسے ان الفاظ نے واقعی سلطانہ کو کاٹ کر رکھ دیا تھا اور جب سیف نے معذرت کی تھی تو سلطانہ نے اسے شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا تھا۔ سیف کو دکھ کے ساتھ بہت شرمندگی بھی ہوئی تھی۔
چند لمحے سلطانہ سیف کو شکایت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی اور پھر اس نے سیف کے چوڑے سینے میں سر چھپا دیا تھا۔
''آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔'' سلطانہ نے آنکھوں میں موجود شکایت کو الفاظ کی صورت دے دی تھی۔
''سوری۔'' سیف بس اتنا کہہ سکا تھا۔
نینا کا استقبال رطابہ نے خوش دلی سے کیا تھا۔ اسے اپنی نئی بہن اچھی لگی تھی۔ جبکہ بینا...... وہ ناک بھوں چڑھاتی رہی اور مختلف طریقوں سے اسے ہلکا پھلکا زچ بھی کرتی رہی۔ لیکن پھر خود ہی اس کے دل میں نینا کی جگہ بنتی گئی۔
گھر کے معاشی حالات بھی کافی اچھے ہو گئے تھے اور دسترخوان پر اب دو قسم کے کھانے ضرور ہوتے تھے۔
زندگی اپنا سفر کرتی رہی...... کرتی رہی۔ دن مہینوں

میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

☆......☆......☆

''ارے چھڑے چھانٹ لڑکے کو اپنی بیٹی کیسے تھما دیں...... نہ ماں، نہ باپ، نہ بھائی بہن...... ایسے ہی اکیلا لڑکا؟'' سلطانہ نے اعتراض کیا تھا۔

''ہاں...... سلطانہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس طرح بالکل اکیلا لڑکا...... کچھ عجیب لگتا ہے۔ میرے خیال میں مینا کے لیے بھی نینا جیسا ہی کوئی رشتہ ڈھونڈیں۔'' شاہین نے مٹر کی پھلی سے مٹر نکالتے ہوئے ایک ٹوکری میں رکھے تھے، جبکہ خالی پھلی دوسری ٹوکری میں ڈالی تھی۔

اس وقت وہ تینوں ہال کمرے میں بیٹھے تھے۔ سلطانہ اور شاہین مٹر نکال رہی تھیں، جبکہ سیف پاس ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔

پندرہ سالوں میں گھر میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔ آنٹی عشرت اور مرزا صاحب کی یکے بعد دیگرے وفات کے بعد نعیم نے اپنا گھر بیچ دیا تھا، سیف نے ہی اسے خریدا تھا۔ مہمان خانے اور شاہین کے کمرے کو گرانا پڑا تھا اور دیوار بھی ختم کرنا پڑی تھی۔ اس طرح آنٹی عشرت کا گھر بھی ان کے گھر کا حصہ بن گیا تھا۔ چار کمروں کا نچلا پورشن اور دو کمرے اوپر...... اسی پورشن میں موجود مہمان خانہ (جسے اب سب ڈرائنگ روم کہتے تھے) کافی کشادہ تھا۔ کچن بھی موجود تھا وہاں، اب وہی کچن استعمال ہوتا تھا۔

گھر کا پرانا حصہ اب بھی استعمال ہوتا تھا لیکن کم......

مرزا صاحب اسی گھر میں پیدا ہوئے تھے، بلاشبہ اس وقت گھر اتنا فرنشڈ نہیں تھا۔ آنٹی عشرت بھی اسی گھر میں بیاہ کر آئی تھیں۔ اس وقت اینٹوں والے دو کمرے تھے وہ بھی بغیر پلستر، تبدیلیاں تو وقت کے ساتھ ہوئی تھیں۔ چار کمرے، ڈرائنگ روم، کشادہ کچن، اور دو کمرے اوپر۔ دونوں میاں بیوی تو زندگی گزار کر چلے گئے تھے اور اب نئے مکین تھے۔

'عمارتیں رہ جاتی ہیں اور انسان چلے جاتے ہیں۔' یہ بات اکثر سلطانہ سوچتی تھی۔ اس پرانے پورشن میں موجود ہال کمرے میں اس وقت زیر بحث مینا کے لیے آنے والا رشتہ تھا۔

مینا اب خیر سے تیسری دہائی بھی آدھی پار کر چکی تھی۔ اس کے لیے جو رشتہ آیا تھا۔ وہ ایک لڑکا تھا بس اکیلا لڑکا۔ بچپن میں اس کے ماں باپ کسی حادثے میں فوت ہوگئے تھے۔

والد کافی امیر تھے اپنی ایک فیکٹری تھی ان کی...... اس لڑکے کے گھر کے پڑوس میں ہی اس کی کوئی رشتے کی آپا رہتی تھیں۔ نیک بخت کافی اچھی خاتون تھیں۔ شوہر بھی ان جیسا نیک تھا کافی خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے وہ طٰہٰ کو وہ اس کے والدین کی وفات کے بعد اپنے گھر لے آئے تھے۔ فرزانہ آپا نے بلاشبہ اس دس سالہ لڑکے کا کافی خیال رکھا تھا۔ فیکٹری بھی فرزانہ آپا کے شوہر اسلم بھائی نے سنبھال لی تھی اور طٰہٰ کا گھر بھی کرائے پر چڑھا دیا تھا۔

اسلم بھائی کافی اچھے آدمی تھے۔ وہ طٰہٰ کے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرواتے رہے تھے، یہاں تک کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ خود فیکٹری سنبھالنے کے قابل ہوگیا تھا۔ طٰہٰ کا رشتہ بھی فرزانہ آپا لے کر آئی تھیں۔

سلطانہ اور شاہین کو لڑکے کے اکیلے ہونے پر اعتراض تھا۔

''لیکن وہ ہماری بیٹی کو خوش رکھے گا......'' سیف نے کہا تھا۔ ''کچھ چھان بین کروائی ہے میں نے، اس کے علاوہ لڑکے سے بھی ملا ہوں اور تسلی تو

مجھے لڑکے سے مل کر ہوئی ہے۔'' اتنا کہہ کر سیف رُک گیا۔

سیف کی بات سنتے ہوئے سلطانہ کے مٹر چھیلتے ہاتھ رُک گئے تھے، البتہ شاہین آہستہ آہستہ مٹر چھیل رہی تھی۔

''میں لکھ کر دے سکتا ہوں کہ ہماری بیٹی وہاں بہت زیادہ خوش اور مطمئن رہے گی۔''

سیف کی بات سن کر سلطانہ نے شاہین کو دیکھا تھا۔ شاہین پہلے ہی سلطانہ کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں کو سیف کی بات سن کر حیرت ہو رہی تھی۔

''لیکن آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟'' آخر کار شاہین نے ہی سوال پوچھا تھا۔

''ملا ہوں میں اس لڑکے سے، بڑا نیک لڑکا ہے۔ دراصل وہ مینا کا کلاس فیلو بھی ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے۔''

''اوہ......'' سلطانہ اور شاہین کے منہ سے بیک وقت نکلا تھا۔

''اچھا تو پھر آپ ایسا کریں اس لڑکے کو گھر بلا لیں۔ ہم اس لڑکے سے ملنے کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کریں گے۔'' سلطانہ نے کہا تھا۔ اس بات سے شاہین کو بھی پورا اتفاق تھا۔

☆......☆......☆

''نینا! تمہیں پتا ہے کہ کسی طوطے کا مینا پر دل آ گیا ہے۔'' رطابہ نے بھرپور سنجیدگی سے کہا تھا۔

''اچھا! کون سا ایسا طوطا ہے، اس کی تفصیلات تو بتاؤ۔'' نینا نے کن اکھیوں سے مینا کو دیکھتے ہوئے اسی سنجیدگی کے ساتھ کہا تھا۔ ساتھ بیٹھی مینا نے جھینپے جھینپے انداز میں اپنا اندازِ نشست تبدیل کیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس وقت ڈائجسٹ تھا جس کا صفحہ دیکھتے ہوئے وہ رطابہ اور نینا کی گفتگو سن رہی تھی، لیکن ظاہر اس طرح کر رہی تھی جیسے وہ ان کی گفتگو سن ہی نہیں رہی اور بالکل ڈائجسٹ میں گم ہے۔ لیکن رطابہ بھی پکی تھی۔ بچپن سے تو لڑتے اور اسے چڑاتے ہوئے آ رہی تھی تو پھر یہ خاص الخاص موقع کس طرح مِس کرتی۔

وہ تینوں اس وقت نئے پورشن کے اس کمرے میں بیٹھی تھیں، جو ان تینوں کا مشترکہ کمرہ تھا۔ کمرے میں تین بیڈ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر متوازی پڑے ہوئے تھے۔ اور ان کے سامنے ایک عدد صوفہ سیٹ موجود تھا، جبکہ کمرے کے بائیں کونے میں ایک ڈریسنگ ٹیبل پڑی تھی۔

بلاشبہ سیف کے کاروبار میں کافی برکت تھی۔ لگ بھگ چھ سال پہلے سیف نے ایک بوتیک بھی کھولی تھی، اسی وجہ سے تو گھر اب بہترین حالت میں تھا، لیکن ان لڑکیوں کے کمرے کا سامان شاہین نے ڈلوایا تھا۔ اسے اپنے والد کی وراثت میں جو رقم ملی تھی، وہ اُس نے اس گھر کا فرنیچر خریدنے میں صرف کی تھی۔

رطابہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پڑی چھوٹی سی گول ٹیبل پر بیٹھی تھی، جب کہ نینا تھری سیٹڈ صوفے پر پاؤں پسارے بیٹھی تھی۔ گود میں کشن رکھا ہوا تھا۔ مینا بیڈ پر نیم دراز تھی اس کے ہاتھ میں ڈائجسٹ تھا۔

رطابہ نے مینا کی طرف دیکھا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مینا بالکل ڈائجسٹ میں غرق ہے، لیکن رطابہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ مینا یقیناً ان کی گفتگو سن رہی ہے۔

رطابہ نے مصنوعی طور پر گلا کھنکارا تھا اور پھر بولی تھی۔

''سنا ہے کل وہ طوطا ہمارے گھر آ رہا ہے۔ امیوں سے ملنے اور پھر یہ امیاں ہی اسے مینا کے لیے اوکے کریں گی۔ ویسے میں نے سنا ہے طوطے میاں کی ناک بالکل طوطے جیسی ہے۔''

''لو بھلا......طوطے کی بھی ناک ہوتی ہے، اس

کی تو چونچ ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے طوطے کی چونچ طوطے کی طرح کی ہوگی، کوے کی طرح ہونے سے تو رہی...... کیسے مینا!'' نینا نے پوری سنجیدگی سے مینا سے استفسار کیا تھا، لیکن مینا نے اپنے سامنے سے ڈائجسٹ نہیں ہٹایا۔ نینا اور رطابہ نے ایک دوسرے کو آنکھوں میں ہی اشارہ کیا اور پھر نینا اُٹھ کر مینا کے پاس گئی اور اس کے ہاتھ سے ڈائجسٹ کھینچنے کے انداز میں لے لیا اور اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی

کیا ہے؟'' مینا کے لیے چہرے کو سنجیدہ رکھنا دشوار تھا۔ لہجے میں مصنوعی پن بھی واضح تھا۔

''کیا تم ڈائجسٹ میں سر کھپا رہی ہو۔ تم بتاؤ کہ تم اس طوطے سے ملی ہو۔''

''کون سا طوطا......'' مینا نے حیرت ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کی۔

''اوہو...... اب تم یہ بھی کہو گی...... تم ہماری گفتگو بھی نہیں سن رہی تھی۔'' نینا نے کچھ چباتے ہوئے کہا تھا۔

بکواس بند کرو...... اور مجھے ڈائجسٹ دو۔'' مینا نے نینا کے ہاتھ سے ڈائجسٹ لینے کی کوشش کی جسے نینا نے ناکام بنادیا۔

''اتنی دلچسپی ہو رہی ہے ڈائجسٹ میں...... طوطے صاحب کے بارے میں گفتگو کرنا پسند ہی نہیں آرہا، رطابہ بھی اُٹھ کر ان کے پاس آگئی تھی۔

''تم لوگ اپنی بکواس بند کرتی ہو یا جا کر امی سے کہوں؟'' مینا نے ایک بار پھر اپنی جھینپ چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

''کیا کہو گی امی کو...... ہمیں بھی بتاؤ۔'' رطابہ نے اسے مزید چڑانے کی کوشش کی تھی۔

''بڑی بدمعاش ہو تم لوگ۔'' مینا نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن نینا نے اسے پھر سے کھینچ کر بٹھادیا۔

''اچھا مذاق چھوڑو، یہ بتاؤ وہ دیکھنے میں کیسا ہے؟'' نینا نے کچھ سنجیدہ ہو کر پوچھا تھا۔

''مجھے نہیں پتا۔'' مینا نے کورا جواب دیا۔

''اسمارٹ ہوگا، ہینڈسم ہوگا، ویل ڈریسڈ ہوگا۔'' رطابہ نے خیالی طور پر اس کا خاکہ کھینچا تھا۔

''اچھا تم چھوڑو اس بات کو...... یہ بتاؤ نینا کے فیانسی سے زیادہ ہینڈسم ہے کیا؟'' رطابہ نے جان بوجھ کر توپوں کا رُخ اِن ڈائریکٹ نینا کی طرف کیا تھا۔ مینا کو بھی سنہری موقع مل گیا تھا تو وہ کیوں اس موقع کو گنواتی۔

''ہاں اس چوزے سے تو بہت اچھا ہے، بلکہ لاکھ درجے اچھا ہے۔ چوزے جتنی تو شکل ہے نینا کے فیانسی کی......''

''مینا میرے ہاتھوں پٹو گی۔'' نینا نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔ رطابہ کے ساتھ مینا کے قہقہوں کی آواز کمرے میں گونجنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

ایک مکمل ہنستا مسکراتا گھر......

ماشاءاللہ! میرے گھر کی خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے یہ الفاظ دن میں جانے کتنی بار شاہین، سلطانہ اور سیف اپنی اپنی جگہ دھراتے تھے۔

ساربان کی اب مسیں بھیگ رہی تھیں، پندرہ سال کا تو وہ ہوگیا تھا۔ دودھ پلانے کے علاوہ ساربان کے سارے کام سلطانہ نے کیے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اب لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھ رہا تھا۔ قد بھی سیف کے برابر ہو چکا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر ہی سلطانہ کو کتنی خوشی ہوتی تھی۔ اور اس کی تین بیٹیاں مینا، رطابہ اور نینا۔

مینا اور رطابہ تو خیر اس کا اپنا خون تھا، لیکن نینا بھی اب اسے کچھ کم عزیز نہ تھی، بالکل بیٹی بن کر تو رہی تھی وہ......

اور شاہین...... ان پندرہ سالوں میں ان کا کبھی جھگڑا نہ ہوا تھا۔ ہلکی پھلکی تلخ کلامی یا اختلاف رائے

تو ہوتے ہی رہے تھے، لیکن یہ تو ہر جگہ ہوتا ہے بلکہ زندگی کا حصہ ہے۔ ویسے بھی سلطانہ کو معلوم تھا جہاں برتن ہوتے ہیں وہاں تھوڑا بہت برتنوں کا شور بھی ضرور ہوتا ہے اور اگر یہ سب نہ ہو تو زندگی کا پتا کس طرح چلے گا۔

اور پھر سیف...... اس کا شوہر...... سر کا سائباں

کس طرح اس نے عمر بھر اس کا خیال رکھا تھا۔

واقعی اس نے تمام حق ادا کیے تھے۔ سلطانہ کو سیف سے بھی کوئی شکوہ نہیں تھا۔ شاہین وہ بھی اپنی جگہ خوش تھی۔

جب وہ اس گھر میں آئی تھی تو کتنے وسوسے تھے دل میں......

کیا پتا سیف کی بیوی کیسی ہوگی؟'' کس طرح برتاؤ کرے گی؟ زندگی میں اس نے بہت دکھ جھیلے تھے۔ پہلے شوہر نے اسے جو اذیتیں دی تھیں اور پھر چھ سال...... جب وہ ہوش وخرد سے بیگانہ رہی۔

سیف نے اسے بتایا تھا کہ سلطانہ بیٹے کے لیے کتنی تمنا دل میں رکھتی ہے، لیکن خدا کی مرضی کے سامنے کیا ہو سکتا ہے۔ اس وقت ہی شاہین نے سوچ لیا تھا کہ اپنا یہ بچہ وہ سلطانہ کی گود میں ڈالے گی اور وہ آج تک اپنے اس فیصلے پر مطمئن تھی۔ شاہین تو سوچتی تھی کہ سلطانہ نے اس سے بہتر پرورش کی ہے۔ شاہین اتنا نہ کر سکتی۔ ویسے بھی ساربان ہر وقت اپنی دونوں امیوں کے ساتھ ہوتا تھا۔

اور شاہین یہ بات کھلے دل سے جانتی تھی کہ سلطانہ اس سے زیادہ اچھی عورت ہے نرم اور پُرخلوص دل والی......

جب وہ اس گھر میں آئی تھی تو نینا کے متعلق بھی کتنے خدشات دل میں تھے۔ اس وقت نینا کا مستقبل کافی غیر محفوظ تھا اور انہی خدشات کے ساتھ اُس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ لیکن سیف تو سیف، سلطانہ نے بھی اسے اپنی بیٹی کی طرح سمجھا تھا، گھر میں کبھی بھی کسی بھی معاملے میں تینوں لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا تھا۔ حالانکہ وہ لگتی کیا تھی سیف اور سلطانہ کی اور یہی بات اس نے شکریے کے ساتھ سلطانہ کو کہی تھی۔

چار دن پورے سلطانہ اس سے نہیں بولی تھی۔

''تمہاری کچھ نہیں لگتی ہوگی، میری تو بیٹی ہے۔''

چوتھے دن جب شاہین نے سلطانہ کو منانے کی کوشش کی تھی تو سلطانہ نے خفگی سے کہا تھا۔

''ویسے مجھے اس بات پر بھی افسوس ہے کہ تم نے میرے خلوص پر شک کیا۔'' سلطانہ کی بات پر شاہین کو شرمندگی نے آ گھیرا تھا وہ معذرت بھی نہیں کر سکی تھی اور پھر سیف نے بھی تو اسے کتنا خوش رکھا تھا۔

واقعی وہ ایک مثالی ہم سفر تھا۔ سیف کا دلی جھکاؤ شاہین کی طرف زیادہ تھا۔ نوجوانی میں ہی شاہین کے پیار نے اس پر گھیرا تنگ کیا تھا۔ بلاشبہ سلطانہ سے بھی اسے محبت تھی، لیکن شاہین اس کی پہلی محبت تھی۔ سیف نے کبھی بھی کسی کی حق تلفی نہیں کی تھی۔

حقوق برابر دیے تھے اپنی دونوں بیویوں کے......

سیف بھی اپنی جگہ خوش تھا۔ سات سال اس نے اپنی دوسری شادی سلطانہ سے چھپائی تھی چاہے کسی وجہ سے بھی...... لیکن چھپائی تو تھی۔ لیکن سلطانہ سمجھتی تھی کہ شاہین سیف کی محبت ہے۔ اس لیے اسے دل سے معاف کر دیا تھا۔ سیف کو اپنی دونوں بیویاں عزیز تھیں۔

اس کے علاوہ اس کا لاڈلا بیٹا ساربان، جواب دسویں جماعت میں تھا اس کا اپنا خون، ساربان کو تو صرف دیکھ کر ہی وہ اپنے آپ کو کس طرح توانا اور طاقت ور محسوس کرتا تھا۔

اور پھر اس کی بیٹیاں...... رطابہ، مینا اور نینا۔

بلاشبہ نینا اس کی بیٹی نہیں تھی لیکن وہ شاہین کی

بیٹی تھی اور شاہین اس کی محبت تھی تو وہ کیوں کر اسے عزیز نہ ہوتی۔

اس نے کبھی نینا کو رطابہ اور مینا سے علیحدہ نہیں سمجھا تھا۔ یہاں تک پہلے گھر میں نینا کا رشتہ آیا تھا۔ ان کے پڑوس سے، لڑکا اچھا تھا۔ ایک فرم میں ٹھیک ٹھاک آمدنی پر ملازم تھا۔ شکل وصورت میں بھی اچھا تھا وہ کیوں کر انکار کرتے، سو اس نے سلطانہ اور شاہین سے مشورہ کر کے نینا کی رضا مندی سے رشتہ پکا کر دیا تھا۔

اس کی تینوں بیٹیاں آج ایک اچھے مقام پر تھیں۔ مینا نے ایم ایس سی کی تھی اور ایک ہائیر سیکنڈری اسکول میں سائنس ٹیچر تھی۔ رطابہ ایم بی بی ایس کر رہی تھی اور وہ تھرڈ ایئر میں تھی۔ پرانے پورشن کا پہلا کمرہ اب اسٹڈی روم میں تبدیل ہو چکا تھا جو کہ زیادہ تر رطابہ کے ہی کام آتا تھا جبکہ نینا نے ڈیزائننگ میں چند ایک کورس کر رکھے تھے اور وہ سیف کی بوتیک کے لیے باقاعدگی سے کام کرتی تھی۔ اسی لیے سیف اپنے گھر کو جنت سے تعبیر دیتا تھا کہ اس میں ہر طرح کی نعمتیں موجود تھیں۔

☆......☆......☆

طٰہٰ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ کافی نفاست سے ڈرائنگ روم کو سجایا گیا تھا، بلاشبہ بہت زیادہ رقم خرچ نہیں کی گئی تھی، لیکن پھر بھی رہنے والوں کی سلیقہ مندی ہر طرف سے ٹپک رہی تھی۔

سیف اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر گئے تھے اور وہ پچھلے پانچ منٹ سے اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ چھٹے منٹ میں سیف کے ساتھ دو خواتین کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

فرزانہ آپا نے اسے بتا دیا تھا کہ مینا کی دو والدہ ہیں، تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اندر داخل ہونے والی خواتین مینا کی مائیں ہیں۔ انہوں نے طٰہٰ کو یہ بھی بتایا تھا کہ جب انہوں نے پوچھا تھا کہ مینا کی سگی ماں کون سی ہے تو کہا گیا تھا کہ ''دونوں'' ہم لوگوں میں کوئی سگا سوتیلا نہیں ہوتا۔ ان میں سے ایک نے جواب دیا تھا۔ اور اس وقت ان خواتین کو دیکھ کر طٰہٰ کے ذہن میں یہی بات آئی تھی۔

''السلام وعلیکم!'' طٰہٰ کھڑا ہو گیا۔ وہ بلاشبہ ایک پُراعتماد لڑکا تھا، لیکن پھر بھی اسے تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی تھی۔

دونوں خواتین نے قدرے دھیمی آواز میں اسے جواب دیا تھا۔

طٰہٰ سنگل صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور خواتین طٰہٰ کے سامنے تھری سیٹڈ صوفے پر بیٹھ گئی تھیں، جبکہ سیف آ کر طٰہٰ کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

سلطانہ نے طٰہٰ کا اوپر سے نیچے جائزہ لیا تھا اور دھیمی آواز میں شاہین سے کچھ کہا تھا۔ بات سُن کر شاہین نے سر ہلا دیا اور تھوڑی دیر بعد طٰہٰ سے پوچھا تھا۔

''کیا نام ہے آپ کا۔'' بات شروع کرنے سے پہلے رسمی طور پر یہ سوال ضروری تھا، ورنہ نام تو انہیں معلوم تھا۔

''طٰہٰ ملک'' اس نے خود اعتمادی سے جواب دیا تھا، ساتھ میں سامنے بیٹھی خواتین کا جائزہ بھی لیا تھا۔

دونوں خواتین بڑے پُروقار انداز میں بیٹھی ہوئی تھیں اور سب سے زیادہ جو بات اسے اچھی لگی تھی، وہ یہ کہ ان کے سر پر سلیقے سے رکھا ہوا دوپٹا تھا، جو کہ حجاب کے تقاضے پورے کر رہا تھا اور اسے مینا میں بھی یہی بات پسند آئی تھی، وہ مکمل طور پر حجاب کرتی تھی، البتہ کلاس روم کے باہر نقاب بھی کرتی تھی۔

خواتین ایسے رسمی سے سوال کرتی رہیں اور طٰہٰ جواب دیتا رہا، البتہ سیف اس دوران خاموش بیٹھ کر طٰہٰ کا جائزہ لیتا رہا۔ جس بات کی وجہ سے سیف نے

اس رشتے کے لیے ہاں کی تھی، اس کے علاوہ بھی طٰہٰ میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں۔
''ہاں تو تم ہماری بیٹی کو خوش رکھو گے؟'' شاہین نے پہلے سے معلوم معلومات پوچھنے کے بعد یہ سوال کیا تھا۔ طٰہٰ کے بارے میں معلوم تو انہیں سب کچھ تھا، بس وہ اس کا اندازِ گفتگو اور شخصیت کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے۔
اس بات کا کیا جواب دے، طٰہٰ کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ دل تھا کہ مینا کی طرف مکمل طور پر مقناطیس کی طرح کھنچ گیا تھا، بالآخر اس نے دو لفظی جواب دیا۔ ''جی! انشاء اللہ۔'' اتنے میں ساربان چائے اور دوسرے لوازمات کی ٹرالی کے ساتھ آ گیا۔ اور طٰہٰ کو سلام کرنے کے بعد اس نے چائے سرو کرنی شروع کر دی۔
سیف نے اپنی بیویوں سے کہا تھا کہ ڈھونڈنے سے بھی تمہیں طٰہٰ میں کوئی خامی نہ ملے گی۔ واقعی شاہین اور سلطانہ اس بات سے متفق ہو گئی تھیں۔
چائے پینے تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ سیف نے سلطانہ اور شاہین کے چہرے پر اطمینان دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے چائے پینے کے بعد اس نے طٰہٰ سے کہا تھا۔
''ایک دو دن تک اسلم صاحب اور ان کی بیگم کو لے کر آنا۔'' سیف نے اِن ڈائریکٹ ہاں کر دی تھی۔ طٰہٰ کا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔
''شاہین آپ جا کر مینا کو لے آئیے۔'' سیف نے تھوڑی دیر بعد کہا تھا شاہین اُٹھ کھڑی ہوئی اور خوشی طٰہٰ کے چہرے سے پھوٹنے لگی تھی۔
اور سیف نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ خیر سے دو بیٹیوں کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ اور وہ دونوں رشتوں پر بہت زیادہ مطمئن تھا۔
نینا کو تو اکرم صاحب نے خود پسند کیا تھا اپنے بیٹے عاشر کے لیے اور انہیں یقین تھا کہ ان کی بیٹی خدا کے فضل و کرم سے بہت خوش رہے گی، البتہ طٰہٰ کے بارے میں وہ ضرورت سے زیادہ مطمئن تھے۔ طٰہٰ سے پہلی ملاقات میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ طٰہٰ نہ صرف مینا کو پسند کرتا ہے بلکہ اس سے محبت کرتا ہے اور سیف کو یقین تھا کہ یہی محبت مینا کی زندگی کو سنوارے گی البتہ سیف کو اس بات کا بھی قدرے اندازہ ہو گیا تھا کہ طٰہٰ قدرے لاپرواطبیعت کا مالک ہے۔ اور یہ بات درست بھی تھی۔

☆......☆......☆

وہ قدرے کوفت کا شکار ہوا بیٹھا تھا۔
''اف......'' اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ اسٹیج سے لے کر آخری کونے تک مرد ہی مرد تھے۔ اسے ایک بار پھر بے زاری نے آ گھیرا تھا۔ وہ اس شادی میں آنا بھی نہیں چاہتا تھا، لیکن امی کے بار بار کے اصرار پر وہ اس سوچ کے تحت آ گیا تھا کہ شاید کسی پری وش سے ہیلو ہائے ہو جائے، لیکن یہاں تو مردوں اور عورتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ انتظام تھا۔ اب وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟
مردوں کا انتظام گھر سے کچھ فاصلے پر میرج ہال میں تھا، البتہ عورتوں کا فنکشن گھر میں ہی ارینج کیا گیا تھا۔
نکاح کے بعد کھانے کا دور شروع ہوا۔ کھانا کھاتے ہی اس نے امی کو فون کیا تھا کہ بس اب گھر چلیں۔ وہ مان تو نہیں رہی تھیں لیکن جب اس نے زور دیا تو انہوں نے کہا کہ آ کر لے جائے۔ اس نے اپنی نئے ماڈل کی کار نکالی اور اس شادی والے گھر کی طرف چل دیا تھا۔
''کیسی بے رونق شادی ہے۔'' میرج ہال سے اس گھر کی طرف جاتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

☆......☆......☆

رطابہ اورنج کلر کے پشواز سوٹ میں ہلکی سی

میوکری کے ساتھ ادھر اُدھر گھوم رہی تھی۔
آج نکاح اور رخصتی تھی۔ صبح سے اب تک وہ کئی بار اپنی آنکھیں پونچھ چکی تھی۔ آج اس کی دونوں بہنیں بیاہ کر جارہی تھیں۔ اکیلے رہنے کا دُکھ اور ان سے دور ہوجانے کا دکھ...... لیکن ساتھ ساتھ وہ شادی انجوائے بھی کررہی تھی۔ آخراس کی بہنوں کی شادی تھی۔
اِدھر سے اُدھر گھومتے ہوئے جب وہ تھک گئی تو آخر کار لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھ گئی۔ اس کی سہیلیاں اور کزنز بھی موجود تھیں۔ ان سے ہنسی مذاق کرتے ہوئے اچانک اسے احساس ہوا کہ سامنے بیٹھی آنٹی اسے مسلسل تکے جارہی ہیں۔ شاید وہ اس کے سوٹ کی طرف متوجہ ہیں۔ رطابہ کو پہلا خیال یہی آیا، لیکن بعد میں اسے یہ خیال مسترد کرنا پڑا۔ وہ رطابہ کی شکل وصورت اوراس کی شخصیت کا بڑی گہری نظروں سے جائزہ لے رہی تھیں۔
رطابہ کو کچھ عجیب سا لگ رہا تھا اور وہ آنٹی بھی مسلسل دیکھے جارہی تھیں، آخران کی نظروں سے بچنے کے لیے رطابہ وہاں سے اُٹھ گئی، لیکن جب وہ ان کے پاس سے گزر رہی تھی تو انہوں نے اسے اپنے پاس بلالیا۔
''بیٹی! ذرا یہاں بیٹھو۔'' عارفہ نے رطابہ کو بیٹھنے کے لیے کہا تھا اور مجبوراً رطابہ کو رُکنا پڑا تھا۔
''کس کی بیٹی ہو تم؟'' عارفہ نے مشفق لہجے میں پوچھا تھا۔ رطابہ کو تھوڑی اُلجھن ہوئی کہ وہ اس میں اتنی انٹرسٹڈ کیوں ہیں۔ اس کے علاوہ دور کہیں خطرے کی گھنٹی بھی بج رہی تھی۔ ممکن ہے 'وہ' وجہ ہو۔
''جی میں دلہن کی بہن ہوں۔'' رطابہ نے کچھ اُلجھتے ہوئے کہا۔
''اوہ...... اصل میں، میں دولہا والوں کی طرف سے ہوں اس لیے معلوم نہیں تھا۔
''کیا کرتی ہو؟'' ان کے اگلے سوال پر خطرے کی گھنٹی زور سے بجی تھی۔
رطابہ نے ناچاہتے ہوئے انہیں بتادیا کہ ایم بی بی ایس کررہی ہوں۔ اب وہ مزید کوئی سوال کررہی تھیں۔ رطابہ کو سمجھ نہ آرہا تھا کہ وہاں سے کیسے اُٹھے۔ رطابہ نے ان کے سوال کا جواب دیا۔ اتنے میں شاہین پاس سے گزری، وہ کچھ جلدی میں تھی۔
''امی......'' رطابہ نے جلدی سے پکارا تھا۔ اُس کی آواز سُن کر شاہین رک گئی۔
''آپ میری امی سے بات کریں میں ذرا......'' اتنا کہہ کر رطابہ وہاں سے جلدی جلدی ہٹ گئی۔ مبادا کہیں وہ آنٹی اس کا ہاتھ پکڑ کر نہ بٹھالیں۔ ویسے ان آنٹی کے تاثرات سے یہی لگ رہا تھا۔
مینا اور نینا کے میک اپ کے لیے بیوٹیشن آئی ہوئی تھی۔ اس بیوٹیشن نے میک اپ مکمل ہونے سے پہلے کسی کو اندر نہ آنے دیا تھا۔ آخر کار بیوٹیشن نے ان کا میک اپ ختم کیا اور انہیں باہر لایا گیا۔
نکاح نامے پر دستخط کروائے گئے۔ اب کھانا سروکیا جارہا تھا۔
رطابہ دلہنوں کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ اتنے میں شاہین وہاں آئی۔
''رطابہ تمہیں وہ آنٹی بلا رہی ہیں۔'' شاہین نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
رطابہ کو کچھ خفت ہوئی تھی۔ اس کا جانے کا ارادہ بھی نہیں تھا، لیکن شاہین نے اسے زبردستی بھیجا تھا۔
''تم انہیں اچھی لگی ہو۔'' شاہین کے فقرے نے اسے مزید اُلجھا دیا تھا۔ لیکن وہ ان کے پاس چلی گئی۔ وہ آنٹی کھانا کھا کر تقریباً فارغ تھیں۔
''کیا دولہے یہاں نہیں آئیں گے۔'' عارفہ نے پوچھا تھا۔
''نہیں آنٹی! اس طرح تو بے پردگی ہوگی۔ اسی

لیے بس اب دولہا دلہن کی ملاقات کار میں ہی ہوگی۔'' عارفہ کو کچھ حیرت ہوئی، لیکن انہوں نے اظہار نہ کیا۔
تھوڑی دیر بعد عارفہ نے پھر کہا تھا۔ ''تمہیں کسی سے ملوانا تھا۔''
''جی کس سے؟''
''اپنے بیٹے سے۔'' رطابہ کا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ اسے بھی یہی لگ رہا تھا کہ وہ خاتون اپنے بیٹے سے ملاقات کا کہیں گی۔
میرا بیٹا بہت اچھا ہے، نیک اور فرمانبردار، نام بھی بڑا بھلا سا ہے، غالب ہے نام اُس کا۔'' عارفہ نے بیٹے کی تعریف کرتے ہوئے اس کا نام بتایا۔
''لیکن آنٹی میں ان سے مل کر کیا کروں گی۔ ویسے بھی میں حجاب کرتی ہوں۔'' رطابہ نے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔
عارفہ کو حیرت ہوئی تھی لیکن انہیں اچھا بھی لگا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر اصرار کیا تھا۔
رطابہ کو کچھ کوفت ہوئی۔ اس لیے اس نے ''نہیں پلیز'' کہہ کر پھر منع کر دیا، تو عارفہ چپ ہوگئی۔
اتنے میں عارفہ کے موبائل کی بیپ بجی۔ غالب کا نام دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ رطابہ بھی ان کی تقلید میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔
''اچھا غالب باہر آچکا ہے، میں چلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر عارفہ نے پُر جوش انداز میں رطابہ کو گلے لگایا اور ان کی یہ گرم جوشی رطابہ کو پھر حیرانی میں مبتلا کر گئی۔

☆......☆......☆

مینا نے اردگرد نظریں دوڑائیں۔ کمرہ کافی بڑا تھا۔ بیڈ ڈریسنگ ٹیبل اور ایک خوبصورت سی الماری ہونے کے باوجود بھی کمرہ کافی کھلا تھا۔
تھوڑی دیر پہلے ہی فرزانہ آپا اسے اس کمرے میں چھوڑ گئی تھیں۔ گھر کو حال میں پینٹ کروایا گیا تھا اور ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے تو یہ مکان کرائے پر تھا، لیکن کرائے دار بھی کافی اچھے تھے، اسی لیے مکان کافی اچھی حالت میں تھا۔ مینا نے اپنا سر دوبارہ جھکا لیا۔ شادی قدرے سادگی سے ہوئی تھی۔ اسی لیے اسے کسی قسم کی تھکن نہیں ہو رہی تھی۔ عام طور پر شادی کی رسومات اور ہنگامے ہی اس قدر ہوتے ہیں کہ سیج تک پہنچتے پہنچتے دلہن تھکن سے چور ہو جاتی ہے۔ لیکن مینا کافی ہشاش بشاش بیٹھی ہوئی تھی۔ سیف نے اپنی بیٹیوں کی بھی اسلامی خطوط پر پرورش کی تھی۔ سو خود مینا کی بھی خواہش تھی کہ شادی بالکل سادگی سے ہو۔
طٰہٰ اس کا کلاس فیلو تھا، یہ بات مینا کو بالکل یاد نہیں تھی، یہاں تک کہ طٰہٰ کو دیکھنے پر بھی اسے احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کا کلاس فیلو تھا، چلو خیر......
''میرا کوئی بھائی نہیں تھا۔ طٰہٰ کو میں نے بالکل بھائی سمجھا ہے۔ میرا بھائی کافی لاپرواطبیعت کا ہے، اس کا خیال رکھنا۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔''
فرزانہ آپی نے وقفہ وقفہ سے اس طرح کی گفتگو کی تھی، باقی سب کچھ تو ٹھیک تھا لیکن مینا کو وہ تم سے محبت کرتا ہے پر کافی حیرت ہوئی تھی۔
''طٰہٰ کو مجھ سے کب محبت ہوگئی بھلا؟'' مینا نے سوچا۔
''ایسے کیسے محبت ہو جاتی ہے؟'' مینا نے سوچا لیکن جب کچھ سمجھ نہ آیا تو اُس اُلجھے ہوئے موضوع کو چھوڑ کر وہ اردگرد کا معائنہ کرنے میں مصروف ہوگئی۔
طٰہٰ نے جہیز لینے سے انکار کر دیا تھا۔
''اللہ کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس، بلکہ ضرورت سے زیادہ ہے، میں جہیز کسی صورت نہیں لوں گا۔'' ویسے بھی جب شادی ہو رہی ہے تو اس کی ہر ذمے داری میں خود اٹھاؤں گا۔ اس لیے آپ جہیز

نہ دیجیے گا۔'' طٰہٰ نے قطعی لہجے میں سیف سے کہا تھا اور سیف نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ اس نے اسے بھی محبت بلکہ ذمے دارانہ محبت سے تعبیر کیا تھا۔

''واقعی مینا بہت خوش رہے گی۔'' سیف کو یقین سا ہونے لگا تھا۔ کمرے میں موجود ہر چیز طٰہٰ نے خود خریدی تھی، گھر کا تمام سامان نیا تھا۔

مینا کو یہاں بیٹھے ہوئے لگ بھگ پندرہ منٹ ہو گئے تھے۔ وہ طٰہٰ کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا۔ مینا کے دل کی دھڑکن بھی ایک خوشگوار احساس کے ساتھ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

بارات دلہن سمیت پہنچ چکی تھی۔ بارات صرف چھ کاروں پر مشتمل تھی۔ جن میں صرف طٰہٰ کے دوست اور فرزانہ آپا کی فیملی شامل تھی۔

گھر پہنچنے کے آدھے گھنٹے بعد صرف فرزانہ آپا، اسلم بھائی اور ان کے بچے گھر پر موجود تھے اور تھوڑی دیر تک وہ لوگ بھی چلے گئے تھے۔

انٹر میں مینا کلاس فیلو تھی طٰہٰ کی...... طٰہٰ کو اچھی طرح یاد تھا کہ انٹر کے دنوں سے لے کر آج تک کس طرح اس نے ایک ایک دن مینا کو یاد کرتے گزارا تھا۔

مینا ویسے تو نقاب کرتی تھی لیکن کلاس روم میں نقاب اُتار دیتی تھی۔ مینا کی صورت، اس کا ٹیچر سے کوئی سوال پوچھنے کا انداز اور اس کی کلاس روم کی ہر بات...... طٰہٰ کو آج تک یاد تھی، اس وقت طٰہٰ نے تیسری دہائی میں بھی قدم نہیں رکھا تھا اور جب انٹر کے بعد ان کی فیلڈز علیحدہ ہوئی تھیں۔ اس وقت طٰہٰ نے اعتراف کیا تھا کہ اسے مینا سے محبت ہے، لیکن یہ بات وہ مینا کو کسی صورت نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کی بہت سی وجوہ تھیں۔

ایک مینا کی واضح اخلاقی اقدار، دوسرا ان لوگوں کی کم عمری اور تیسرا وہ اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے ابھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونا تھا۔ سو اسے کچھ انتظار کرنا پڑا، لیکن اس انتظار کی وجہ سے ایک فرق یہ ہوا کہ اس کی محبت، عشق کی حدوں میں شامل ہو گئی تھی۔ اور جوش کی بجائے اس نے ہوش کا مظاہرہ کیا تھا، سو آج مینا اس کی دلہن بنی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

ماسی کو بھی اس نے آرام کرنے کی ہدایت کی اور خود اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ قدم بیڈ روم کی طرف بڑھا دیے۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔

مینا سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا عروسی لباس خریدنے کے لیے مینا سلطانہ اور طٰہٰ گئے تھے۔ طٰہٰ نے اپنی مرضی سے سرخ رنگ کا عروسی لباس لیا تھا اور اسی عروسی لباس میں وہ واقعی بہت خوب صورت لگ رہی تھی اور دلہناپے کا روپ بھی بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔

طٰہٰ بیڈ پر مینا کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔

''السلام وعلیکم'' طٰہٰ نے کھنکھارنے کے بعد کہا تھا۔

''وعلیکم السلام!'' مینا نے جواب دیا تھا۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ مینا کا چہرہ قدرے جھکا ہوا تھا، البتہ اس نے گھونگھٹ نہیں نکالا ہوا تھا۔ طٰہٰ نے اس کی تھوڑی کو دائیں ہاتھ سے اونچا کیا۔ مینا کی دھڑکن تیز ہو گئی اب مینا کی صرف نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

مینا نے پلکیں اُٹھا کر طٰہٰ کو دیکھا۔ طٰہٰ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ لمحہ بھر نظروں کا تصادم ہوا تھا۔ مینا نے شرم سے نظریں دوبارہ جھکا لیں۔

کچھ لمحے یوں ہی دھڑکتے دل کے ساتھ گزر گئے۔ پھر طٰہٰ نے اسے بتانا شروع کر دیا کہ کس طرح انٹر میں مینا اسے اچھی لگتی تھی، پھر اسے مینا سے محبت ہو گئی۔ لیکن اس نے مناسب وقت کا انتظار کیا اور آج مینا اس کی تھی۔

یہ سُن کر مینا کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی اور اسے یہ سب سننا کافی اچھا بھی لگ رہا تھا۔ اس طرح یا اس سے ملتے جلتے واقعات وہ مختلف ڈائجسٹوں میں پڑھ چکی تھی اور اب یہ سب خود اس کی زندگی میں ہو رہا تھا۔

''تمہیں یاد تو ہے نا کہ ہم انٹر میں کلاس فیلو تھے؟'' طٰہٰ نے بات کرتے ہوئے پوچھ لیا۔

''آں...... ہاں......'' مینا نے گڑبڑا کر کہا، حالانکہ اسے انٹر میں اپنا کوئی طٰہٰ نام کا کلاس فیلو یاد نہیں تھا۔ مینا کو جھوٹ بولنے پر شرمندگی ہوئی تھی۔ طٰہٰ ابھی تک مینا کو اسی طرح کے واقعات بتا رہا تھا، درمیان میں اس نے ویسے تم آج لگ خوبصورت رہی ہو'' بھی کہا۔ جس پر مینا نے سر شرم سے کچھ جھکا لیا تھا، جسے طٰہٰ نے ایک بار پھر سے اوپر کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مینا کے خوبصورت چہرے کے نقش و نگار بھی بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ باتوں کے درمیان ہی اس نے مینا کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

☆......☆......☆

نینا دلہن بنی سیج پر بیٹھی تھی۔ جبکہ عاشر کی بہنیں اور کزنز پاس پڑے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک صوفے کے سامنے پڑی ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جبکہ چند ایک کھڑی تھیں۔ ان کے قہقہے کی آوازیں اور گفتگو کی آوازیں شاید باہر آنگن میں بیٹھے لوگ بھی آسانی سے سن رہے تھے۔ آپس میں گفتگو کے علاوہ وہ نینا کو بھی عاشر کے نام سے مسلسل چھیڑ رہی تھیں اور ہلکے پھلکے فقرے کس رہی تھیں۔ کچھ فقروں سے تو اسے کافی شرم بھی آ رہی تھی۔ لیکن بہرحال اسے یہ سب بہت اچھا لگا تھا۔

ان میں سے ایک کا موقف یہ بھی تھا کہ نینا اور عاشر کی شکلیں بہت زیادہ ملتی ہیں اور اسے پورا پورا یقین تھا کہ نینا اور عاشر بچپن میں کسی میلے میں گم ہونے والے بہن بھائی تھے۔ باقی لڑکیاں بھی اس کی بات سے متفق تھیں اور اس پر تبصرے بھی کر رہی تھیں۔ نینا کو بھی اس بات پر اور پھر اس کی تائید پر ہنسی آ گئی۔ اب ان میں سے ایک بڑھ کر بڑے سنجیدہ انداز میں دلہن ہونے کے آداب بتا رہی تھی۔ آداب بتانے سے پہلے اس نے اپنا بمشکل ایک گز کا دوپٹا بوڑھی بیبیوں کے اسٹائل میں سر پر ٹکایا تھا۔ نینا اس ہنسی مذاق سے کافی لطف اندوز ہو رہی تھی۔

نینا کا لہنگا لائٹ گرین شیڈ کا تھا۔ جسے عاشر نے خود پسند کیا تھا۔

عام دلہنوں کے برعکس نینا کی خواہش پر بیوٹیشن نے اس کا میک اپ لائٹ رکھا تھا۔ لائٹ گرین لہنگے کے ساتھ اس نے دولہے والوں کی طرف سے دیا گیا وائٹ گولڈ اور زمرد کا سیٹ پہنا ہوا تھا اور وہ واقعی بے حد خوبصورت نظر آ رہی تھی۔

ساتھ بیٹھی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی اب اعلانیہ وہ چیزیں گنوا رہی تھی، جن سے کہا جا سکتا ہے کہ نینا اور عاشر کا چہرہ ملتا جلتا ہے۔

''ایک تو دونوں خوش شکل ہیں، دوسرا دونوں کے چہرے پر ایک ناک ہے، دونوں کے چہرے پر دو آنکھیں بھی ہیں۔ اور تو اور دونوں کے کانوں کی لو بھی ہیں......'' باقی لڑکیاں ہوں ہاں کر کے اس کی تائید کر رہی تھیں اور نینا اپنی مسکراہٹ بھی ضبط کیے بیٹھی تھی۔

''دونوں کے چہرے پر بس ایک چیز کا فرق ہے بس مونچھیں نہیں ہیں نینا کی اگر وہ بھی ہوتیں تو......'' کمرے میں ایک بار پھر قہقہے گونجنے لگے۔

''اُف یہ لڑکیاں بھی......'' نینا گڑبڑا سی گئی۔

''لیکن پھر بھی دونوں کو ایک نظر دیکھنے سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ دونوں بہن بھائی ہیں۔''

''اگر آج میں دلہن نہ بنی ہوتی تو......'' نینا نے خیالی طور پر دانت پیسے اب لڑکیاں کوئی اور مذاق،

کوئی اور فقرہ کسنے کی تیاریاں کر ہی رہی تھیں کہ نینا کی ساس اندر کمرے میں آ گئی۔

"چلو لڑکیو! بس اب باہر آؤ...... دلہن کو کچھ دیر آرام کرنے دو۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے، ابھی تو دلہن منہ پر ایلفی لگائے بیٹھی ہے، کم از کم تھوڑی دیر تو ہم بیٹھ جائیں، تاکہ ان کے ہونٹ بھی ایلفی کے اثر سے نکل آئیں اور ویسے بھی ہمیں کچھ دیر بیٹھنے دیں شاید ان کی برکت سے ہماری بھی باری آ جائے۔" ایک لڑکی نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بس اب چلو دلہن کو اکیلا چھوڑ دو۔" زاہدہ نے زور دیا تھا۔

"اوہ...... ہوہو......" ملی جلی ذومعنی آوازیں سنائی دیں اور لڑکیاں ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئیں۔ اب کمرے میں بس نینا اور زاہدہ رہ گئی تھیں۔

"بیٹی یہ تمہارا اپنا گھر ہے، کوئی تکلف مت کرو، ان لڑکیوں نے بڑا تنگ کیا ہوگا، شریر ہیں پوری، کمر تھک گئی ہو تو ٹیک لگا لو اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔" زاہدہ نے مشفق لہجے میں کہا تھا۔

زاہدہ کے پوچھنے پر اسے یاد آیا کہ اسے تو کافی دیر سے پیاس لگی ہوئی ہے۔

"جی پانی دے دیں۔" نینا نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ نینا کی ساس کمرے میں موجود واٹر ڈسپنسر سے پانی لے آئیں۔

کمرے میں موجود تمام سامان نینا کے جہیز کا تھا۔ اکرم صاحب نے اصرار کیا تھا کہ وہ کوئی بھی غیر ضروری چیز نہ دیں اور جہیز کو بوجھ کی صورت میں بھی نہ ادا کریں، بس جو دل چاہے۔ اپنی چادر کو دیکھ کر ہی دیں اور عاشر کی بھی لگ بھگ یہی رائے تھی۔

پھر بھی سیف نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ طٰہ کا جہیز لینے سے قطعی طور پر انکار کرنے سے ان کو نینا کو بہتر سے بہترین دینے میں اور بھی سہولت ہو گئی تھی۔

خیر سے نینا کے سسرال والے بھی کھاتے پیتے لوگ تھے، لیکن ان کا جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔

زاہدہ نے نینا سے مزید ایک دو باتیں کیں اور ٹیک لگانے کے بارے میں ایک بار مزید پوچھا جس پر نینا نے انکار کر دیا، اسے کوئی خاص تھکن نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ زاہدہ نینا کو ایک بار پھر آرام سے بیٹھنے کی تاکید کر کے چلی گئی۔

زاہدہ کے جانے کے بعد نینا نے ایک گہری سانس خارج کی اور چہرہ گھٹنے پر ٹکا دیا۔

باہر عاشر بھی اپنی ان بیش بہا کزنز اور بہنوں کے درمیان یرغمال بنا ہوا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ وہ عاشر کو کمرے میں اسی وقت جانے کی اجازت دیں گی جب وہ انہیں دس ہزار روپے دے گا۔ شادی شدہ کزنز اور بہنیں کل ملا کر نو تھیں۔

عاشر انہیں اپنی 'غربت' کے بارے میں بتانے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن ان کا شور ہی اتنا تھا کہ عاشر کی بات ان کے شور میں دب جاتی تھی۔

ان لڑکیوں کے آخر میں ہی نیلے کلر کے سوٹ میں نیلوفر کھڑی تھی۔ اس نے اپنے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے جو شانوں سے کچھ نیچے تک ہی تھے۔ وہ سانولے رنگ اور ناٹے قد کی لڑکی تھی۔

نیلوفر نے لڑکیوں اور پھر عاشر کا جائزہ لیا۔ ان کی بحث کم از کم اگلے پندرہ منٹ تک ضرور جاری رہنی تھی، جبکہ نیلوفر کا کام صرف پانچ منٹ میں ہو جانا تھا۔

نیلوفر نے کچھ فاصلے پر بیٹھے بزرگوں کو دیکھا۔ وہ بھی آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اگر وہ تیزی سے جائے تو کسی کو بھی اندازہ نہیں ہونا تھا اور نہ ہی کسی نے متوجہ ہونا تھا، چنانچہ اس نے قدم مخالف سمت میں بڑھا دیے۔ اب وہ اس کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ایک

نظر پھر پورے آنگن اور لان میں بیٹھے لوگوں پر ڈالی تھی، کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اور وہ جلدی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

کمرے کا دروازہ جس قدر تیزی سے کھلا تھا، اسی قدر تیزی سے بند کر دیا گیا تھا۔ نینا چونک گئی تھی کہ اتنی جلدی عاشر آگئے اور وہ بھی اتنی تیز رفتاری سے......

''السلام وعلیکم!'' ایک نسوانی آواز نینا کے کانوں سے ٹکرائی۔

''وعلیکم السلام۔'' دھیمے لہجے میں جواب دیتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔

یہ لڑکی کچھ دیر پہلے بھی بہت سی لڑکیوں کے ساتھ اس کمرے میں موجود تھی۔ اور یہ واحد لڑکی تھی جو سامنے ٹیبل پر بیٹھی تھی اور شاید اسی وجہ سے نینا کے ذہن میں اس کی شبیہہ رہ گئی تھی۔

''یہ یہاں......'' نینا نے سوچا کیا تھا، لیکن اس لڑکی نے پہلے ہی بولنا شروع کر دیا بولنے سے پہلے نیلوفر سنگل سیٹڈ صوفے کے ایک بازو پر بیٹھ گئی تھی۔

''میں نیلوفر ہوں۔'' اس لڑکی نے اپنا تعارف کروایا۔ نینا نے محسوس کیا کہ وہ اپنی آواز بھاری کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

''اصل میں آپ سے ملنے اور گفتگو کرنے کا بہت اشتیاق تھا۔ میں پہلے بھی آئی ہوں یہاں، لیکن آپ سے گفتگو نہیں ہو سکی۔ اتنی ساری لڑکیوں میں ویسے بھی یہ مشکل تھا۔'' اتنا کہہ کر نیلوفر چپ ہوگئی۔

''آخر دلہن سے ملنے کا اتنا انوکھا اشتیاق بھی کیوں؟'' نینا اس کی بات سُن کر اُلجھی تھی، لیکن نیلوفر نے پھر سے بولنا شروع کر دیا تھا۔

''آپ کافی خوبصورت ہیں، آپ کی اور عاشر کی جوڑی واقعی بے مثال ہے...... اگر میں بھی آپ کی طرح خوبصورت ہوتی تو شاید آج یہاں......''

اتنا کہہ کر نیلوفر نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں۔ نینا کو اپنے اندر اُمڈتے جذبات کی سمجھ نہیں آئی۔

''اوہ سوری...... مجھے یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں عاشر کی بڑی پھوپو کی بیٹی ہوں۔ ہم لوگ اگلی کالونی میں رہتے ہیں۔ اب تو انشاء اللہ ملاقات ہوتی رہے گی۔ ونس اگین سوری (Once Again Sorry) میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا...... خدا حافظ یہ کہہ کر نیلوفر جھٹکے سے اُٹھی اور باہر چلی گئی۔ باہر آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور پھر ارد گرد نظر دوڑائی کہ کہیں اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔

'اوہ' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ سمن نے اسے باہر نکلتے دیکھ لیا تھا۔ نیلوفر نے پوری کوشش کی کہ وہ اس چیز کا نوٹس نہ لے، لیکن اب اسے اپنا پروگرام ڈوبتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ واپس اس گروپ کی طرف آئی۔ نیگ لینے کے بارے میں تکرار ابھی تک ہو رہی تھی۔

نیلوفر کے قریب آنے پر سمن اس کے پاس آگئی اور اس کے ماتھے پر تیوری واضح تھی۔

''تم اس روم میں کیوں گئی تھی؟'' سمن کا لہجہ کافی سرد تھا۔

''وہ دراصل میں، میں اپنا ہینڈ بیگ وہاں بھول آئی تھی اس لیے......'' نیلوفر کو بروقت بہانہ سوجھا تھا۔

سمن نے مزید کوئی سوال نہ کیا، بلکہ چپ ہوگئی۔ اسے یقین تھا کہ نیلوفر کوئی نہ کوئی گڑبڑ کر آئی تھی، لیکن فی الحال چپ رہنا ہی مناسب تھا۔

☆......☆......☆

نینا اُلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ بیٹھی تھی۔ نیلوفر کی باتیں اور اس کے بولنے کا انداز......

ذہن اُلجھتا ہی جا رہا تھا، لیکن وہ اسے کیوں بتا گئی تھی؟ اور وہ بھی شادی کی رات......

نینا بے وقوف نہیں تھی۔ اس قدر مختصر گفتگو اور وہ بھی اس طرح چھپ کر...... کہیں نہ کہیں گڑ بڑ ہو سکتی ہے۔ لیکن ذہن کا ایک حصہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ شاید نیلوفر جو کچھ بتا کر یا ظاہر کر کے گئی ہے وہ اضطراری ہو اور صحیح ہو؟'' کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد عاشر کمرے میں آ گیا۔ نینا نے اپنا سر گھٹنے پر ٹکایا ہوا تھا۔ ٹھوڑی کے نیچے اس نے دونوں ہاتھ میں رکھے ہوئے تھے۔

یہ رطابہ کا اصرار تھا کہ وہ اپنی سیج پر اسی طرح بیٹھے۔

''اتنا بوجھ گھٹنے پر نہ دیں، گھٹنا ٹوٹ جائے گا۔'' عاشر نے بالکل سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ نینا کچھ خجل سی ہو گئی تھی۔

''ارے میں کہہ رہا ہوں کہ گھٹنا ٹوٹ جائے گا اور آپ ہیں کہ ابھی تک ویسے ہی بیٹھی ہوئی ہیں۔'' عاشر نے اپنے لہجے کو اب کچھ سخت کیا تھا۔

''میرا گھٹنا ٹوٹے گا نا، آپ کیوں آدھے ہوئے جا رہے ہیں۔'' نینا نے بے ساختہ کہا تھا، لیکن بعد میں زبان دانتوں تلے دبا لی۔ اندازِ نشست ابھی تک وہی تھا۔

''اوہو...... اور کون سی چیزیں آپ کی اور کون سی میری ہیں۔'' عاشر نے شوخ لہجے میں کہا۔ فقرہ ذو معنی تھا۔ نینا کی پلکیں خود بخود جھک گئیں۔

''ویسے آپ لگ کافی خوبصورت رہی ہیں۔'' نینا کی پلکیں مزید جھک گئیں۔

''یہ آپ نے آنکھیں کیوں بند کر لی ہیں؟'' عاشر کا لہجہ خوشگوار سے خوشگوار ہوتا جا رہا تھا۔

''کیوں کہ آپ کی شکل ڈراؤنی ہے۔'' نینا نے اب مسکرا کر جواب دیا تھا۔

''اچھا...... لیکن باہر سمن وغیرہ کہہ رہی تھیں کہ میری اور آپ کی شکل کافی ملتی جلتی ہے بلکہ ہم تو بہن بھائی لگتے ہیں۔'' عاشر کی بات پر نینا کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی تھی اور دل چاہا تھا کہ کہہ دے ''صحیح تو کہہ رہی تھیں'' لیکن پھر شرم آڑے آ گئی۔

''ویسے کہہ صحیح رہی تھیں۔'' عاشر نے بالکل بزرگ خواتین کی طرح ٹھوڑی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اوہ......'' نینا نے صحیح معنوں میں دانت پیسے تھے۔

''ویسے اگر آپ گھونگھٹ نکال کر بیٹھی ہوتیں تو میں آپ کو کچھ نہ کچھ منہ دکھائی ضرور دیتا، لیکن آپ تو ایسے منہ باہر نکالے بیٹھی ہیں جیسے اگر گھونگھٹ نکالا ہوتا تو دم گھٹ جاتا، لیکن خیر پھر بھی میں کافی 'بامروت' انسان ہوں، اس لیے پہلے سے دیکھے ہوئے چہرے کو دیکھنے پر آپ کو چھوٹا موٹا گفٹ ضرور دوں گا۔''

نینا نے اپنے نئے نویلے پن کا 'مصلحت نامہ' ایک سائیڈ پر رکھا اور کینہ توز نگاہوں سے عاشر کو دیکھنے لگی۔ لیکن عاشر نے بھی اس کی تیز نگاہوں کا نوٹس لیے بغیر اپنی مزید چند ایک خوبیاں بتائیں، اور اپنی شیروانی کی جیب سے خوبصورت پیکنگ کیا ہوا ایک بہت ہی چھوٹا گفٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس چھوٹی سی چیز کی پیکنگ نے نینا کے قریب گھنٹی بجائی کہ کچھ غلط ہے۔ دل چاہا کہ عاشر سے کہے کہ پیکنگ کھول کر دے اور اس نے اپنے خیالات کو عملی جامہ بھی پہنایا۔

''دیکھے ہوئے منہ کی منہ دکھائی کے لیے پیک گفٹ کی ضرورت نہیں آپ مجھے اسے کھول کر دیں۔'' نینا نے چبا چبا کر کہا تھا۔

''میں بے مروت نہیں ہوں۔'' عاشر نے طمانیت سے کہا تھا۔

''اور میں بامروت نہیں ہوں۔'' نینا نے وہی طمانیت اپنے لہجے میں سمو دی۔

''دیکھیں پلیز......'' عاشر کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھنے کے لیے نینا نے اس کی بات کاٹ لی۔

''پلیز کھول دیں نا۔''

''آپ میرا دل نہ توڑیں۔'' عاشر نے کوشش کی کہ اس کا لہجہ کچھ پر شکایت ہو۔

''اگر آپ نے کھول کر نہ دیا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔''

''لیکن اگر میں نے کھول دیا تو میرا دل کرچی کرچی ہو جائے گا۔''

''کوئی بات نہیں میں اسے گم یا ایلفی سے جوڑ دوں گی۔'' عاشر نے قدرے بے بس ہو کر نینا کو دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ نینا سے بحث میں نہیں جیت پائے گا۔

اس لیے اس نے ایک مصنوعی ٹھنڈی سانس لی اور گفٹ پیک کھول دیا۔

''ویسے لگتا نہیں کہ آپ ایک دن کی دلہن ہیں۔'' گفٹ کھولتے ہوئے عاشر نے مصنوعی سانس خارج کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کیونکہ مجھے ایک دن پورا ہوا ہی نہیں ہے۔'' نینا نے بھی ہنوز اسی اطمینان سے کہا تھا۔

گفٹ دیکھ کر نینا کو حیرت نہیں ہوئی، اسے اندازہ تھا ایسی ہی کوئی اوٹ پٹانگ سی چیز ہو گی۔ اس گفٹ میں 'چوسنی' تھی۔ لیکن نینا کے اقدام پر عاشر ضرور حیران ہوا۔ نینا نے چوسنی کی ڈوری کو گلے میں ڈال لیا۔

''میں اپنی منہ دکھائی ساری زندگی اپنے سینے سے لگائے رکھوں گی اور اسے استعمال بھی کروں گی۔'' نینا نے ایک انداز سے کہا تھا۔ عاشر کو نینا کے انداز پر ہنسی آ گئی اور وہ کافی دیر ہنستا رہا تھا' جبکہ نینا بھی مسکراتی رہی تھی۔

''آپ بہت اچھی ہیں۔'' عاشر نے ہنسنے کے درمیان کہا تھا۔

''آپ نہیں تم۔'' نینا نے خود اعتمادی سے عاشر کی تصحیح کی تھی اور یہ عاشر کو کافی اچھا لگا تھا۔

''محبت پر یقین ہے۔'' عاشر نے پوچھا تھا۔

''ہوں۔'' نینا نے مختصر جواب دیا۔

''کبھی ہوئی ہے۔''

''ہو جائے گی۔'' جواب عاشر کو حسب خواہش ملا تھا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ نینا خاموش بیٹھی عاشر کے بولنے کا انتظار کرتی رہی اور عاشر نے الفاظ ترتیب دینے کے بعد کہا تھا۔ ''نیلوفر آئی تھی کمرے میں...... یقیناً کوئی الٹا سیدھا دھماکہ کر گئی ہو گی۔ تم اس کی باتیں ذہن سے نکال دینا۔ لوگوں کو زچ کرنا اور انہیں تنگ کرنا اس کی عادت ہے۔'' عاشر نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔

''اوہ...... یعنی میں صحیح سوچ رہی تھی۔ وہ مجھے اُلجھانا چاہتی تھی۔'' نینا نے سوچا تھا۔ وہ کافی دیر سے ثانوی طور پر نیلوفر کو سوچ رہی تھی اور اس کے ذہن میں موجود گرہ کھل گئی تھی۔

''ویسے مجھے بھی کچھ کچھ اندازہ ہوا تھا۔ مجھے وہ کچھ بوکھلائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔'' نینا نے عاشر کو بتایا تھا۔

''اچھا تم اسے چھوڑو۔'' یہ کہہ کر عاشر نے اپنی شیروانی سے ایک رنگ نکالی اور نینا کی بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔

نینا نے اس انگلی میں جان بوجھ کر رنگ نہیں پہنی تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اسے اس انگلی کو خالی رہنے دینا چاہیے اور اس نے اپنے دل کی بات مانی بھی تھی۔ اور اب......

عاشر نے انگوٹھی پہنانے کے بعد نینا کا ہاتھ دبایا تھا۔ اور اس دباؤ کو محسوس کرتے ہوئے نینا کو یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس کی آئندہ کی زندگی کس قدر خوبصورت ہو گی۔

(زندگی کی اونچی نیچی کٹھنائیوں پر سفر کرتے اِس خوبصورت ناولٹ کی اگلی قسط، انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

زندگی اِن دنوں اتنی تیز رفتار محسوس ہو رہی تھی کہ اسے آئینہ دیکھنے کا وقت نہیں ملتا تھا، جو صبح تیار ہوتے ہوئے آئینے میں اپنا دیدار ہوتا تو دوسرے ہی دن پھر صبح نصیب ہوتا۔ اسے غصہ آتا کہ کیا پڑی تھی مجھے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی۔ اماں، ابا نے تو......

خواب سے حقیقت کی دہلیز پار کرتا ایک سچ، افسانے کی صورت

اس سے علیک سلیک کچھ دن پہلے ہوئی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ جب بھی وہ اور روبی لائبریری یا کینٹین جاتے تو رضا انور کو بھی سیکنڈ فلور پر اپنا منتظر پاتیں اور یوں ایک تعلق سا ہو گیا۔ روبی اگر نہ بھی آتی تب بھی شرمین ملک، رضا انور حسن کے ساتھ ہی ہوتی۔ دنیا جہاں کی باتیں ہوتیں، اپنی شب و روز کی مصروفیات، استادوں، کتابوں پر تبصرہ ہوتا اور مستقبل کی باتیں۔ اس نے رضا انور حسن کی دوستی کو اب تک کسی ایسے تعلق سے تعبیر نہیں کیا تھا، جس تعلق پر عموماً یونیورسٹی میں دوستیاں اِس نے دیکھی تھی۔

تعلیمی سال اختتام پر تھا۔ اماں اس کے رشتے کے لیے بڑی پریشان رہتیں۔ اماں، ابا اس کے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتے تھے مگر وہ شوکت کے رشتے پر رضا مند نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں جب وہ بی اے میں تھی تو اس نے اماں کا ارادہ بھانپ لیا تھا کہ وہ اپنے بھانجے کو داماد بنانا چاہتی ہیں۔ مگر اس نے احتجاج نہیں کیا تھا، خاموش ہو گئی تھی۔

شوکت مناسب شکل و صورت کا لڑکا تھا۔ بی کام پاس اور بینک میں ملازم تھا۔ مناسب رشتہ تھا مگر اماں، ابا اب بیٹی کر رنگ دیکھ کر پریشان تھے جو شوکت کا ذکر سن کر چراغ پا ہو جاتی تھی۔ حالانکہ شوکت اسے چاہتا تھا اور وہ اس بات سے بھی اچھی طرح باخبر تھی۔ مگر کیوں اسے اب شوکت میں خرابیاں نظر آتی تھیں۔ وہ شوکت سے کیوں نہیں ملتی تھی۔ کیا اس کی تعلیم کم تھی یا اس کی تنخواہ؟ سوچ سوچ کر اسے کوفت ہونے لگتی۔

گھر کے ماحول میں بیزاری کا احساس تھا۔ اماں، ابا کی ناراضگی کا بھی احساس تھا۔ چھوٹی خالہ شادی کی تاریخ لینے پر تلی ہوئی تھیں اور اماں اس کی ہٹ دھرمی سے نالاں تھیں۔ اس دن اماں نے اس سے غصے میں کہا۔

''شرمین تمہارے انکار کی وجہ کیا ہے؟ کیا یونیورسٹی میں تم نے کوئی لڑکا دیکھ لیا ہے؟'' اور اس ''کوئی'' پر اس کا دل زور سے دھڑکا اور اس کی نگاہوں

کے سامنے رضا انور حسن کا سراپا آ گیا۔ ''رضا انور حسن'' ہاں وہ لاشعوری طور پر اسے پسند کرنے لگی ہے۔اس کی وجاہت سے متاثر تھی۔ اس کی حسِ مزاح اسے اپیل کرتی تھی۔اس کے دیکھنے کے انداز میں ایک وقار تھا۔

''اس باراس نے صرف رضا انور حسن کے لیے سوچا۔ شروع سے اب تک کی ملاقاتیں، اس کی باتیں کرنے پر اسے احساس ہوتا کہ باتوں سے تو نہیں اس نے شرمین ملک پر یہ ظلم کیا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے مگر ہاں اس کا جو دیکھنے کا انداز اسے سراہنے والا ہوتا تھا اور سراہا اسے جاتا ہے جسے پسند کیا جاتا ہے۔

''تو رضا انور حسن تم مجھے چاہتے رہے۔'' یہ سوچ کر ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور اسے اردگرد اچھا لگنے لگا۔اماں سے لڑائی پر وہ ہنس ہنس کر ماں سے بول رہی تھی۔ تبدیلی کا احساس اسے اپنی باہر کی دنیا میں نہیں اندر کی دنیا میں ہوا، چیزیں تو وہی تھیں، رشتے بھی وہی تھے اور اس کی زندگی کے شب و روز بھی وہی تھے۔ لیکن پھر بھی اسے سب کچھ بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ حالانکہ یونیورسٹی میں اس کا یہ دوسرا سال تھا۔ لیکن آج کل اسے یونیورسٹی بھی نئی نئی لگ رہی تھی۔ ابتداء میں تو اسے یونیورسٹی آنا بہت اچھا لگا اور طالب علموں کی طرح وہ بھی اسے نئے ماحول میں آ کر گھبراتی جہاں نظر اٹھاتی، لڑکوں کا جھمیلا اور ان کے قہقہے، اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اس کا ہی تعاقب کر رہے ہیں۔ وہ پریشان ہو جاتی لیکن پھر اس نے محسوس کیا ایسا نہیں ہے یہاں تو ہر ایک کی اپنی الگ دنیا ہے۔ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں۔ کتابیں، کلاسز، نوٹس، لائبریری کے چکر، یہاں تو طالب علم ان ہی حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ یونیورسٹی کے حوالے سے

اس نے کالج میں جس رنگینی کا ذکر سنا تھا۔ ایسا نہیں تھا۔ کلاسیں باقاعدہ ہوتیں۔

شروع شروع میں تو اسے بڑا لطف آیا لیکن پھر وہ کوفت کا شکار ہونے لگی۔ روز صبح سویرے اٹھنا اور پوائنٹ کے دھکے کھانا۔ یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے وہ بے حال سی ہو جاتی پھر ایک لمبا فاصلہ طے کر کے وہ ڈیپارٹمنٹ تک آتی اور ڈیپارٹمنٹ بھی تھرڈ فلور پر، کیا کہنے اس یونیورسٹی لائف کے...... وہ طنزیہ مسکراتی۔ گھر پہنچتے پہنچتے تھکن سے اس پر رقت طاری ہونے لگتی۔ الٹا سیدھا کھانا کھاتی، اماں کے ڈانٹنے پر نماز بھی مشکل سے پڑھی جاتی اور وہ بدحواس ہو جاتی۔ شام کو گھر کا کام......

''زندگی ان دنوں اتنی تیز رفتار محسوس ہو رہی تھی کہ اسے آئینہ دیکھنے کا وقت نہیں ملتا تھا، جو صبح تیار ہوتے ہوتے آئینے میں اپنا دیدار ہوتا تو دوسرے ہی دن پھر صبح نصیب ہوتا۔ اسے غصہ آتا کہ کیا پڑی تھی مجھے یونیوسٹی میں داخلہ لینے کی۔ اماں، بابا نے تو منع کیا تھا اور کیا فائدہ اتنا پڑھنے کا، کرنا تو مجھے وہی ہے چولہا ہانڈی۔ وہ کوفت سے بیگ اٹھاتے ہوئے سوچتی۔

پھر آہستہ آہستہ وہ اس ماحول کی عادی ہو گئی۔ اسے نت نئے کپڑے پہن کر اور صبح تیار ہو کر جانا اچھا لگنے لگا۔ قہقہے اسے شروع میں اپنے تعاقب میں آتے محسوس ہوتے تھے وہ ان قہقہوں کا ایک جز بنتی چلی گئی۔ گلے میں دوپٹا ڈالے، میک اپ سے مزین چہرے پر گلاسز لگائے وہ لوگ بھی سیکنڈ فلور سے گزرتیں تو میک اپ زدہ چہرے کا ٹکراؤ رضا انور حسن سے ہوتا، جو سحر زدہ شخصیت کا مالک تھا اور اس کی دوست روبی کا کزن تھا۔ روبی نے رضا انور حسن سے اس کا تعارف کروادیا تھا، جب وہ روبی سے ملنے جنرل ہسٹری ڈیپارٹمنٹ آیا تھا۔

اماں سے بول رہی تھی۔ گھر کے ماحول سے بیزاری کا احساس اسے اب محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ گھر سے یونیورسٹی کا راستہ کافی طویل تھا۔ پوائنٹ میں بیٹھی وہ کھڑکی سے باہر کے مناظر کو دیکھتی تو سب نئے نئے لگ رہے تھے۔ ایک نئے پن کا احساس تھا۔ یونیورسٹی میں واک کرتے ہوئے راہداری میں لگے پھولوں میں آج زندگی کا بھرپور احساس ہو رہا تھا، یہ رنگ برنگے پھول دیکھنے سے اسے زندگی کے رنگوں کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔

رضا انور حسن کے سنگ وہ بھی زندگی کے ان رنگوں کو دیکھتی گئی۔ یہی خوشیاں اسے جیون میں محسوس ہو رہی ہوں گی۔

''جیون ساتھی اگر وہ ہو جسے آپ چاہیں تو زندگی کا ایک الگ لطف ہوتا ہے اس کا غصہ بھی پیارا لگتا ہے۔'' اسے کالج میں ندا کے کہے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ گلاسز سر پر جمائے ہوئے اس مخصوص جگہ کو دیکھنے لگی۔ جہاں رضا انور حسن کو اپنا منتظر پاتی تھی۔ وہ وہیں کھڑا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ شفق کے کئی رنگ اس کے چہرے پر بکھر گئے۔ اس نے معمول کی طرح اس کا حال چال پوچھا تو اسے آج ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ رضا انور حسن اس سے پہلی مرتبہ مخاطب ہوا اور اظہارِ عشق کر رہا ہو۔ وہ اپنی کلاس لینے چلا گیا اور وہ ڈیپارٹمنٹ آ گئی۔

لیکچر نوٹ کرتے ہوئے بھی اسے رضا انور حسن کا خیال تھا۔ آج کل روبی نہیں آ رہی تھی۔ ورنہ وہ اسے ضرور دل کا حال بتاتی۔

کلاس ختم ہوئی تو اس نے رضا کو اپنا منتظر پایا۔ کینٹین جاتے ہوئے وہ چپ چپ سی تھی بس اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کینٹین تک کا سفر اتنا طویل ہو جائے کہ رضا کے ساتھ اس کی زندگی بیت جائے۔ لیکن رضا صرف کینٹین تک کے سفر تک ہی فی الحال اس

کے ساتھ جاسکتا تھا۔

''کیا بات ہے، شرمین! آج تم خلاف معمول خاموش ہو، خیریت ہے؟'' رضا نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہوں...... ہاں نہیں تو۔'' اس نے اپنی منتشر دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے رضا کی طرف دیکھا تو اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے نظریں جھکالیں۔ تھوڑی دیر خاموش رہی اس نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے رضا کی طرف دیکھا تو وہ پھر اس سے پوچھ بیٹھا۔

''کوئی بات ضرور ہے، کہو کیا بات ہے؟'' رضا کے حوصلہ دینے پر شرمین ملک کا دل چاہا کہ وہ اپنی ساری کیفیت اسے بتادے کہ وہ اسے چاہتی ہے مگر وہ بولی۔

''رضا بات یہ ہے کہ اماں، ابا میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' رضا اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ شرمین کا جی چاہا فوراً کہہ دے کہ تم پریشان نہ ہو، میں یہ شادی نہیں کروں گی۔'' وہ ابھی یہ الفاظ کہنے ہی والی تھی کہ رضا بے ساختہ ہنسنے لگا اور وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔

''شرمین ملک، بنتی بولڈ اور ماڈرن ہو، لیکن ہو نا عام سی لڑکی، اتنا شرما رہی ہو ارے بھئی ہاں کردو۔ تمہارے والدین اچھا ہی سوچ رہے ہیں۔ کیا رکھا ہے لڑکیوں کی پڑھائی میں، میں تو اس پڑھائی لکھائی کے سخت خلاف ہوں۔ امی جان نے روبی کو بہو بنانے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے رضا مندی دے دی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اب یونیورسٹی نہیں جائے گی بس گھر پرہ کر سمسٹر کی تیاری کرے گی اور شادی کے بعد میں اسے کچھ نہیں کرنے دوں گا۔ عورت کی ذمہ داری گھر سنبھالنا ہے۔'' روبی کے ذکر پر رضا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ چاہت کے سارے رنگ روبی کے ذکر پر وہ رضا کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے دل کو قابو میں کرتے ہو۔ پوچھا۔

''پڑھائی کے خلاف ہو اور پڑھی لکھی لڑکیوں سے دوستی بھی رکھتے ہو۔''

''دوستی الگ بات ہے اور شادی الگ، اور پھر روبی پڑھی لکھی ہے۔ بس بے باک اور نڈر نہیں۔ وہ اس ماحول میں بھی بے باکی سے نہیں آتی، سادہ آتی ہے۔ شرمین معاف کرنا، یہاں آکر لڑکیاں، لڑکیاں نہیں رہتیں بلکہ حوریں بننے کی کوشش میں معصومیت کھودیتی ہیں۔ مجھے بے باکی اور نڈر پن ایک دوست میں تو پسند ہے، منگیتر یا بیوی میں نہیں۔ یار پیریڈ کا وقت ہوگیا ہے، میں کلاس لینے جارہا ہوں۔'' وہ جاچکا تھا لیکن شرمین ملک میں اب اتنا دم نہیں تھا کہ وہ اُٹھ سکتی، وہ اپنے ٹوٹے دل اور بکھرے خیالات کے ساتھ سوچ رہی تھی کہ رضا انور میں بے باک اور نڈر ہونے کے باوجود تمہیں یہ نہ بتاسکی کہ میں تمہیں چاہنے لگی ہوں۔''

اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو اسے یاد آیا کہ آج اسے جلدی گھر جانا ہے۔ چھوٹی خالہ شادی کی تاریخ لینے آرہی ہیں۔ وہ بیگ شولڈر پر لٹکائے یونیورسٹی گیٹ سے باہر آگئی جہاں بائیک لیے شوکت کھڑا تھا اسے گھر پہنچانے کے لیے، جسے دیکھ کر وہ اُداسی سے مسکرادی۔ شوکت کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اسے شبانہ کی بات سچی لگی۔

''زندگی میں اس شخص کا ہم سفر بننے میں زیادہ لطف ہے جو محبت کرنا جانتا ہو اور آپ سے محبت کرتا ہو۔''

''ہاں۔'' اس کا سر ہلا اور وہ دھیمے سے مسکرادی اپنے اِس فیصلے پر کہ وہ شوکت کے سنگ ملنے والی خوشیوں سے اپنے گھر کو بنائے گی۔

☆☆......☆☆

افسانہ

عورت کے دل کی تو کیمسٹری ہی دنیا سے نرالی ہے۔ بس ایک پیار بھری نظر، دو میٹھے بول۔ اور عورت بے مول بک جاتی ہے مگر نعمان کو ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ انہوں نے تو غالباً ان ساڑھے پانچ سالوں میں مجھے کبھی غور سے بھی نہیں دیکھا تھا کجا پیار بھری نظر اور......

سنبل کے ثمر بار قلم سے، ایک یادگار افسانہ

ہمارے ہاں برادری سسٹم بہت اسٹرونگ تھا۔ اور کوئی خرابی نہیں تھی۔ پڑھایا لڑکیوں کو بھی جاتا تھا، بس لڑکوں سے کچھ کم، میٹرک، انٹر یا سمپل گریجویشن، شادیاں ہر حالت میں خاندان میں ہی ہوتی تھیں۔

ایسے میں کمال یہ نہیں تھا کہ میں نے ڈاکٹر بننے کی خواہش ظاہر کی، کمال یہ تھا کہ اسے فوراً قبول کرلیا گیا۔ مگر اس پاداش میں میرے خوابوں کو زنجیر کردیا گیا، میرے پروں کو باندھ دیا گیا اور مجھ سے پرواز کی صلاحیت چھین لی گئی۔

Medical Aptitude Test کلیئر کرتے ہی میرا نکاح تایا زاد نعمان سے کردیا گیا۔ نعمان مجھ سے انیس سال بڑے تھے۔ ان کی اب سے آٹھ سال پہلے شاہا آپی سے زبردست افیئر کے بعد شادی ہوئی تھی۔ شادی کے دو سال بعد شاہا آپی کا اپنے فرسٹ بے بی کی پیدائش پر انتقال ہوگیا، دو ہفتے بعد بے بی کی بھی ڈیتھ ہوگئی۔ اس کے بعد سے نعمان شادی سے انکاری تھے۔ نعمان میں کوئی خرابی نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ اپنا امنگوں بھرا وقت گزار چکے تھے۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتی انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا تھا۔ لیکن خوابوں اور خواہشوں کا تاوان دینا ہی پڑتا ہے اور عورت کو تو ضرور۔

☆......☆......☆

میڈیکل کے پانچ سالوں میں کئی ہاتھ میری طرف بڑھے۔ امنگوں بھرا دل تو میرے پاس بھی تھا۔ مگر خوابوں کی طرح میں نے دل اور جذبات کو بھی زنجیر کرنے کا فن سیکھ لیا تھا۔ ابتسام رضا جو اپنے خوبصورت لہجے میں کہا کرتا۔ ''ڈاکٹر روما! محبت سے منکر ہو۔ محبت روٹھ جائے تو رُلا دیتی ہے۔'' وہ آرام سے بولا۔

''محبت ہم سے راضی ہی کب ہے، جو مزید روٹھے گی۔'' میں آہستگی سے گویا ہوئی۔

''تم جیسی محبتوں سے گندھی لڑکی کے منہ سے

ایسی بات سُن کر حیرت ہوئی۔'' اس کے لفظوں میں ہی نہیں چہرے پر بھی حیرت تھی۔

''محبت مجھے گوندھ کر بھول گئی ہے، دوسرے ہاتھوں میں تھما گئی ہے کہ جو سلوک چاہے کرو، یہ محبتوں سے گندھی ہے۔ نہ شکوہ کرے گی نہ فریاد۔'' میں استہزائیہ ہنسی۔ '' جو ڈھالنا ہے ڈھال لو۔''

''نہیں قطعی نہیں، محبت کسی کو نہیں بھولتی۔ اس کا دامن بڑا وسیع ہوتا ہے۔ یہ سب کو اپنے دامن میں سمیٹ کر رکھتی ہے، بکھرنے نہیں دیتی۔'' اس نے مجھ سے قطعی متاثر ہوئے بغیر کہا۔

پھر اس نے مجھے کیوں بکھیر دیا۔ اپنوں سے محبت کی سزا اتنی کڑی!! کیا تھا، جو محبت مجھے احتجاج کرنا سکھا دیتی، اپنے حق میں لڑنا سکھا دیتی مگر کہہ نہ سکی۔

''ڈاکٹر ابتسام! یہ ایک لایعنی اور فضول بحث ہے۔'' کہا تو یہ کہا۔

''یعنی محبت تمہاری نظر میں لایعنی اور فضول ہے۔'' اس کے لہجے میں دُکھ کر لایا۔

''ہاں ایک شادی شدہ عورت کی زندگی میں اپنے شوہر کی محبت کے سوا ہر محبت فضول اور لایعنی ہوتی ہے۔'' میں نے پل صراط پار کر ڈالا۔

''ڈاکٹر روما! کم از کم آپ کو بتانا تو چاہیے تھا...... میرا سفر بہت طویل ہو چکا ہے اور واپسی بہت مشکل ہے۔'' ابتسام کا لہجہ ٹوٹا ٹوٹا، بکھرا بکھرا تھا۔

''کیا اپنے ماتھے پر ٹیٹو کروالوں۔'' میں پتا نہیں کیوں تلخ ہوگئی، پھر میں رُکی نہیں۔

☆......☆......☆

ہاؤس جاب کے دوران بھی کتنی ہی نظروں میں محبت لہرائی تھی مگر ڈاکٹر ابتسام رضا کی بات نے مجھے ریزروڈ کر دیا، واقعی مجھے کوئی حق نہیں تھا دلوں سے کھیلنے کا۔ مگر میرا قصور بھی تو نہیں تھا۔ میں نے کبھی کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی اور کرتی بھی کیوں۔ اپنے اوقات سے بخوبی واقف تھی میں۔ میں تو ایک بے پنکھ پنچھی تھی، اڑنے کی صلاحیت سے محروم۔ میں نے اپنے آپ کو رُوڈ کر لیا تھا۔ اور گویا یہ میرے گرد حفاظتی باڑھ تھی۔ مگر ڈاکٹر احمر انصاری نے بلا ہچکچاہٹ یہ باڑھ کراس کر لی۔

''ارے ڈاکٹر روما! کبھی صحت مندوں کو بھی دیکھ لیا کریں۔ ان کا بھی حق ہوتا ہے۔'' میں ایک Typhoid Patient کی کیس ہسٹری دیکھ رہی تھی کہ وہ چلے آئے۔

''اِس سے کیا ہوگا ڈاکٹر!'' میں نے بے اعتنائی سے کہا۔

''اِس سے پتا چلے گا کہ آپ کوتاہ بین نہیں ہیں۔'' جواب ترنت آیا۔

''مجھے کوتاہ بین ہی رہنے دیں۔'' میں نے Patient کی فائل رکھی اور وارڈ سے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

''ڈاکٹر روما! آپ نے خود کو اتنا محدود کیوں کر رکھا ہے۔'' ڈاکٹر احمر اس سرے کی تلاش میں تھے جو مجھے ادھیڑ ڈالتا۔

''آپ کو لگتا ہوگا ڈاکٹر! ایسا نہیں ہے۔'' میں نے ان کی بات کو اہمیت نہیں دی۔

''کیا چھپاتی ہیں آپ؟'' وہ ایکدم سے پرسنل ہوگئے۔ غصہ تو آیا مگر میں نے قابو پایا۔

''میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں ہے ڈاکٹر احمر! میں ڈاکٹر روما نعمان ایم بی بی ایس، نعمان عذیر پی ایچ ڈی اِن نیوکلیئر فزکس کی وائف ہوں۔ فی الحال رخصتی نہیں ہوئی مگر ہاؤس جاب

مکمل ہوتے ہی ہو جائے گی پھر میں اپنے شوہر کے ساتھ اسپیشلائزیشن کے لیے ملک سے باہر چلی جاؤں گی۔ میں ہارٹ سرجن بننا چاہتی ہوں۔ بس یا اور کچھ۔'' میں سب بتاتی چلی گئی مگر یہ نہ بتا سکی کہ میں ہارٹ سرجن بننا چاہتی ہوں مگر خود میرے دل کا کوئی علاج نہیں ہے۔

آج ساڑھے پانچ سال گزرنے پر بھی میں اس تعلق کو دل سے قبول نہ کر سکی۔ میرا دل آج بھی نعمان عذیر کی محبت سے خالی ہے اور خود نعمان عذیر کا بھی تو۔ اگر نعمان کوشش کرتے تو کیا ایسا ممکن نہیں تھا۔ تھا بالکل ممکن تھا۔

عورت کے دل کی تو کیمسٹری ہی دنیا سے نرالی ہے۔ بس ایک پیار بھری نظر، دو میٹھے بول۔ اور عورت بے مول بک جاتی ہے مگر نعمان کو ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ انہوں نے تو غالباً ان ساڑھے پانچ سالوں میں مجھے کبھی غور سے بھی نہیں دیکھا تھا کجا پیار بھری نظر اور دو میٹھے بول۔

''سب کچھ بتایا ڈاکٹر روما! ایک بات بتانا بھول گئیں۔'' اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کہ ڈاکٹر روما! کے دل کو نعمان عذیر کی محبت نے چھوا بھی نہیں ہے۔ یہ دل آج بھی کورا ہے۔ اور اس میں محبت کی ہوک ہے۔'' انہوں نے اپنا تجزیہ بیان کیا اور وہ گنگ رہ گئی۔ اتنا صائب تجزیہ۔

''کیوں درست کہہ رہا ہوں ناں!'' انہوں نے میرے سامنے چٹکی بجائی۔

''پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' میں نے لاپروائی برتی اور آگے R.M.O روم کی جانب بڑھی۔

''ڈاکٹر روما! تعلق روگ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا۔'' انہوں نے ہولے سے کہا۔

''ڈاکٹر احمر! کچھ تعلق ایسے ہوتے ہیں جو ٹوٹ جائیں تو زندگی کو روگ بنا دیتے ہیں۔'' میں جواب دے کر رُکی نہیں۔

☆......☆......☆

بعد میں بھی ڈاکٹر احمر کی ساحر آنکھیں اور ساحر الفاظ کی جادوگری مجھے روکنے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر میں نے آنکھیں اور کان بند کر لیے۔

''کب تک بھاگیں گی، آخر تھک کر گر پڑیں گی۔'' وہ کہتے۔

''گرنا ہوتا تو بہت پہلے گر پڑی ہوتی۔ جو اپنی مرضی کے خلاف پہلا قدم اٹھا لے۔ اس کے لیے باقی کا راستہ آسان ہوتا ہے۔'' میں نے آرام سے کہا۔

''تو یہ مانتی ہیں کہ یہ راستہ آپ کی مرضی کا مخالف ہے۔'' ڈاکٹر احمر میری پکڑ پر مسکرائے۔

''میرے نا ماننے سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی۔'' میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''تو راستہ بدل کیوں نہیں لیتیں، من چاہا راستہ۔'' ڈاکٹر احمر مجھے بغاوت کی ترغیب دے رہے تھے۔

''بغاوت مشکل نہیں ہوتی ڈاکٹر! مشکل ہوتا ہے ثابت قدم رہنا۔'' میں نے کہا۔

''اس ثابت قدمی کا کوئی صلہ بھی تو ہو۔'' ڈاکٹر احمر چڑ سے گئے۔

''عورت کب صلے کی تمنا کرتی ہے۔'' میں نے استہزائیہ ہنستے ہوئے کہا۔

''جو خود ڈوبنا چاہے اسے کون بچائے۔'' ڈاکٹر احمر میرے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک گئے تھے۔ مگر میں ڈاکٹر احمر کو بتا نہ سکی کہ مجھے وہ بغاوت

کا درس بیکار دے رہے ہیں کیونکہ وہ خود بھی وہ نہیں تھے جو میرے دل کی سرزمین پر محبتوں کی آبیاری کر پاتے۔ جو میرے من میں پھول کھلا پاتے۔

☆......☆......☆

اور میری محبت نے جہاں گھٹنے ٹیکے وہ شرجیل احمد تھے۔ کیونکہ میری روح محبت کی پیاس سے تڑخی ہوئی تھی۔ اور محبت کی پیاس محبت سے ہی بجھتی ہے۔ محبت محبت ہی سے ہار مانتی ہے۔ محبت محبت کا ہی ساتھ چاہتی ہے اور محبت محبت کے قدموں میں ہی جھکتی ہے۔ اسی کے سامنے گھٹنے اور ماتھا ٹیک دیتی ہے۔

شرجیل احمد پائلٹ تھا۔ وہ کہتا تھا اور وقت ٹھہر جاتا تھا، تھم جاتا تھا۔ رُک جاتا تھا۔ میں نے اتنی خوبصورت مردانہ آواز کبھی نہیں سنی تھی۔ بھاری آواز ٹھہرا ٹھہرا پرفسوں لہجہ، وہ کہتا۔

''ڈاکٹر روما! مجھے بس اپنے ساتھ کی نوید دے دو۔ مجھے مالا مال کردو۔ پھر میں تمہیں پوری دنیا دکھاؤں گا۔ میری ہر فلائٹ پر تم میرے ساتھ ہوگی۔'' اور جواباً میں کچھ نہ کہتی مگر میرے کٹے ہوئے پَر دہائیاں دینے لگے۔ چھپایا میں نے کچھ شرجیل سے بھی نہیں تھا کہ چھپانے کا فائدہ ہی کوئی نہیں تھا۔ اور شرجیل کے قدموں میں میری محبت ہاری تھی میرا ایمان نہیں۔ اور محبت کو دھوکا دینے والا تو سب سے بڑا گناہ گار ہوتا ہے۔ اس کی تو کہیں بھی معافی نہیں ہے۔

''تم اِن...... اَن چاہی زنجیروں کو توڑ کیوں نہیں ڈالتیں۔'' وہ مجھے بغاوت کا درس دیتا۔

''کچھ زنجیریں توڑنے کے لیے نہیں ہوتیں۔ ان زنجیروں کی عادت ہوجاتی ہے۔ یہ زنجیریں ہماری روٹس بن جاتی ہیں۔ اگر ہم ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کریں تو یہ ہماری روٹس سے ہمیں جدا کردیتی ہیں۔ ہمیں مرجھا دیتی ہیں اور مرجھائے پودے کے ساتھ کوئی نہیں رہ سکتا۔'' میں نے آہستہ آہستہ کہا۔

''تو پھر تمہارا، میرے ساتھ ہونے کا مطلب؟'' وہ جھنجلا گیا۔

''اس لیے شرجیل! کہ میں محبت کرنا چاہتی تھی، بے حد و بے پناہ۔ میں چاہتی تھی کسی کو میں چاہوں اور کوئی مجھے چاہے بے حد و بے پناہ۔ میں جاننا چاہتی ہوں محبت ہے کیا؟ یہ کیسی مدھر ہے جو مدہوش کر دیتی ہے۔ اس میں کیا اسرار ہے۔ یہ کیوں مسرور کر دیتی ہے؟ یہ کیوں سرخوشی عطا کرتی ہے؟ یہ کیوں ہر غم ہر تفکر کو بھلا دیتی ہے؟ یہ کیسا نشہ ہے جو ہوش و حواس سے بیگانا کردیتا ہے۔ جو رگ رگ میں بہنے لگتا ہے۔'' میں بول رہی تھی اور آنسو میری آنکھوں کے لبریز پیالے سے بہنے کو بے تاب تھے۔ اور شرجیل نے انہیں اپنی انگلی کی پور پر سمیٹ لیا۔

''مجھے آج تک یہ اپنے مشرقی ماں باپ سمجھ نہیں آئے۔ ساری زندگی معمولی معمولی خوشی بھی اولاد کی جھولی میں ڈالنے کے لیے بے تاب رہنے والے، اولاد کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کس آسانی سے ملیا میٹ کردیتے ہیں۔'' اس نے دکھ سے کہا۔

''روایات مائی ڈیئر روایات! ہماری روایات، ہمارے رواج، ہماری رسوم، یہ سب ہیں ہماری زندگی، ہماری خوشیوں کے دشمن۔ اور ان سے بغاوت...... ہر شخص کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ پورے سیٹ اَپ سے لڑنے کا۔ تو کسی کو تو بھینٹ چڑھنا ہی ہے۔ سو عورت سب سے آسان ہدف ہوتی ہے۔ زندگی بھر کیے گئے احسانوں کا بدلہ ایک ہی وار میں اُتار لیا جاتا ہے۔'' میں اذیت پسندی سے مسکرائی۔

''تم تو پڑھی لکھی ہو، تم کیوں ان ریت و رواج اور رسوم کے خلاف بغاوت نہیں کرتیں۔''
اس نے پھر اُکسایا۔

''میری تعلیم ہی تو میرے پیروں کی سب سے بھاری زنجیر ہے۔ کیونکہ اگر میں نے بغاوت کی تو مجھ سے زیادہ تعلیم بری ٹھہرے گی اور میرے ساتھ ہی میرے خاندان کی ہر لڑکی پر اعلیٰ تعلیم کا راستہ بند کر دیا جائے گا اور یہ مجھے ہونے نہیں دینا۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنی محبت کا ہی تاوان کیوں نہ دینا پڑے۔'' میں نے بے لچک لہجے میں کہا۔

''تمہاری سوچ قابلِ فخر ہے مگر فرض کرو تم تو ثابت قدم رہو، مگر آگے کوئی اور بغاوت کر دے تو؟'' اس نے بھی حتی الامکان سمجھانے کا بیڑہ اٹھا رکھا تھا۔

''تب بات تعلیم پر نہیں آئے گی کیونکہ میری مثال سامنے ہوگی۔ پھر وہ لڑکی ہی بری کہلائے گی۔ میں بارش کا وہ پہلا قطرہ بننا چاہتی ہوں، جو دھرتی کی پیاس بجھا دیتا ہے اور اس پہلے قطرے کی تقلید میں قطرے، قطرے در قطرہ گر کہ بارش بن جاتے ہیں۔ مجھ سے پہلے بھی کئی لڑکیوں نے اعلیٰ تعلیم کا حصول چاہا مگر کسی کو اجازت نہیں ملی، صرف مجھے ملی۔ تو میں کبھی ایسا نہیں کروں گی کہ اپنے بزرگوں کا یقین اور اپنے پیچھے آنے والیوں اور اپنی طرف دیکھنے والیوں کا مان توڑ دوں۔ میں کبھی ایسی بری مثال نہیں بنوں گی کہ جو میرے خاندان کی لڑکیوں کی راہیں کھوٹی کرے، انہیں بند کر دے۔'' میرے عزائم بلند تھے۔

''چاہے اس میں تمہارے دل کا خون ہو جائے۔'' اس نے بڑی بے بسی سے مجھے دیکھا۔

''میرے دل کا خون میرے بعد آنے والوں کی راہوں کے دیوں کا فیول بنے گا۔ ان کی راہوں کو روشن کرے گا۔ اور شرجی بغاوت مشکل نہیں ہوتی۔ بغاوت تو سب سے زیادہ آسان ہے اور بغاوت کامیاب بھی ہو جاتی ہے مگر پیچھے کیا رہ جاتا ہے۔ ہم اپنے حصے میں کامیابیاں رقم کر کے دوسروں کی راہ کھوٹی کر دیتے ہیں۔ ان کے حصے میں ناکامیاں ہی ناکامیاں لکھ دیتے ہیں اور پھر اپنے لیے تو سب ہی جی لیتے ہیں مگر زندگی کا مقصد دوسروں کے کام آنا ہے۔'' میں نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا اور اس نے مجھے دیکھا اور چلا گیا۔

اور آج میں پورے یقین سے کہتی ہوں کہ میں نے محبت کو جیا ہے پوری سانسوں کے ساتھ۔ اس نے میری سرزمینِ دل پر قدم رکھا ہے، مجھے اپنا احساس بخشا ہے۔ میں نے محبت کے ساتھ پرواز کی ہے، بے پروں کے ساتھ بھی، مجھے اپنا ساتھ بخشا اور پھر چھوڑ گئی۔ مگر اپنی یاد کا زادِ راہ چھوڑ گئی، آج سوچوں بھی تو کوئی شرمندگی دل میں سر نہیں اٹھاتی کیونکہ دل کی راہوں پر میں نے ہمیشہ دماغ کو دربان رکھا۔

میرے بعد وہ راہیں کھل گئیں جو مسدود تھیں اس لیے محبت کبھی میرے دل میں شرمندگی بن کر نہیں ابھری، ہمیشہ فخر بن کر میری رگوں میں دوڑی ہے۔ اسی محبت نے نعمان کی بے حسی کے ملال کو دھو دیا۔ انہوں نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی مگر مجھے افسوس نہیں ہے۔ مجھ سے نہیں کی، کسی سے تو کی ہے۔ اور کسی نے مجھ سے اور میں نے بھی تو کسی سے کی ہے۔ محبت اعزاز ہے اور اسے میں نے اعزاز کی مانند ہی وصول کیا۔ شرمندگی کا طوق بنا کر گلے میں نہیں ڈالا۔ محبت نے مجھے محروم نہیں رکھا۔

☆☆......☆☆

''وہی تو...... بات یہاں تک پہنچ گئی کہ اپنے باس کو امپریس کرنے کے لیے لڑکیاں گھروں سے مزیدار کھانے پکا پکا کر لا رہی ہیں اور محترم سر دھن دھن کر تعریفیں کیے جا رہے ہیں! یہاں بیوی پورے دن گرمی میں کھپتی رہے۔ صاحب کو یہ دکھائی نہیں دیتا۔'' عرفات......

شک کی دیمک کا شکار ایک دوشیزہ کا افسانہ خاص

''مہر! کاش میرے پاس ایسی طاقت ہوتی کہ میں تمہیں اپنی محبت اور خلوص کا یقین دلا پاتا۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو، میری زندگی میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ایک تم ہی کافی ہو۔'' عرفات نے بیوی کے قریب بیٹھتے ہوئے، اپنے بالوں کو مٹھی میں جکڑا۔ وہ چپ چاپ آنسو بہائے جا رہی تھی۔

''یار! سمجھو تو، میرا دل ہے کوئی بازار تو نہیں کہ اس میں ایک ہجوم اکٹھا کر لیا جائے''۔ عرفات علی ایسا ہی صاف گو تھا، اپنے جذبات اور تاثرات کا اظہار وہ بڑے بھرپور انداز میں کرتا آیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے ایسا ہی کیا۔

''کیا پتا چند سالوں بعد جب آپ کا محبت سے جی اوب جائے، تو آپ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ جائیں۔ میں اکیلی زندگی کیسے گزاروں گی؟ آپ کچھ بھی کہیں مگر یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ مرد ذات کو بدلتے دیر نہیں لگتی'' مہرین کے چہرے پر اداسی سیاہ رات کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ عرفات نے چونک کر دیکھا۔ ہونٹ تو اس کی مہر کے ہی تھے، مگر ان سے نکلنے والے جملے کسی اور کے لگے۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ شروع سے ہی مہر کا اتنا خیال رکھنے کے باوجود، پتا نہیں کیوں وہ آج کل عدم تحفظ کا شکار ہونے لگی تھی۔ یہ نفیسہ بھابی کی پڑھائی ہوئی پٹیاں تھیں، جو ان کی خوشگوار نخلستان زندگی میں دکھوں کی گرم ہوا چلنے لگی۔

''ایک تو...... پر مہر جیسی بے وقوف لڑکی! آج کل۔ ان کی مرید بنی ہوئی ہے اور بس ان ہی کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھے جا رہی ہے'' عرفات نے اپنی شریک زندگی کو دانت کچکچا کر دیکھا۔ آنکھوں میں نمی لیے، وہ اسی کو خاموشی سے تکے جا رہی تھی۔ مہرین کی موجودگی میں اتنا سکوت...... وہ تو ہر وقت چہچہاتی، عرفات کے اردگرد ڈولتی رہتی تھی۔

''مجھے محسوس ہوا کہ میری ہم سفری میں ساتھ گزارے جانے والے چند سال۔ میری سچائی کے گواہ ہیں۔ تمہیں محبت کی پرکھ ہے۔ ہم ایک

دوسرے کے بہت نزدیک ہیں۔ مگر سب باتیں مفروضات ثابت ہوئیں۔ تم تو آج بھی فاصلوں پر کھڑی ہو۔'' عرفات نے دھیمے اور پُر اثر لہجے میں مہرین کو سمجھانے کی کوشش کی۔

عرفات کے یوں افسردہ ہونے پر مہرین نے شوہر کی طرف دیکھا، نگاہیں آپس میں ٹکرائیں، محبت کا کرنٹ سا اس کے وجود میں دوڑا۔ وہ ایک دم اپنی ناراضی بھلا کر عرفات کی پیش قدمی کا خوشگوار انداز میں جواب دینا چاہ رہی تھی کہ نفیسہ بھابی کی باتوں سے اس کے گرد جو شک کا حصار کھنچا ہوا تھا، اس نے قدم آگے بڑھانے نہ دیا۔ مہرین ایک دم بجھ گئی، وہ سپاٹ چہرے لیے عرفات کے سامنے سے اٹھ گئی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

''کوئی تو میری حالت پر رحم کھائے۔ مہرین کا کیسے نادان دوست سے پالا پڑ گیا ہے؟ شکیل تیری بیوی کا اللہ بھلا کرے۔ کیوں میری مہر کی برین واشنگ کر رہی ہیں؟'' عرفات نے بیوی کی بے وقوفی پر اپنا ماتھا سچ مچ پیٹ ڈالا اور اپنے دوست سے دل ہی دل میں استدعا کی۔

اسے اگر ذرا بھی الہام ہوتا تو وہ کبھی بھی سمیرا کا ذکر مہرین سے نہ کرتا۔ اس کے دل میں کوئی چور نہیں تھا، اسی لیے اس نے مہرین سے یہ بات نہ

چھپائی۔اور بات کسی اور رنگ میں رنگ دی گئی۔

''مہریار آج میں نے لنچ میں جو چاؤ من کھائے کہ، بڑے سے بڑے ریسٹوران میں بھی نہیں ملتے ہوں گے۔'' مہرین شوہر کے ساتھ بیٹھی خوش گپیوں اور چائے سے لطف اندوز ہورہی تھی عرفات نے اسے بتایا وہ چونک گئی۔

''اچھا! کہاں؟ آفس کے کیفے ٹیریا میں بنا تھا؟ مہرین نے اشتیاق سے پوچھا۔

''نہیں وہ جو میری ایک اسسٹنٹ ہے۔سمیرا حق۔اسے جب سے پتا چلا کہ میں چائینز کا دیوانہ ہوں۔وہ کبھی کبھی لنچ میں میرے لیے کچھ بنا کر لے آتی ہے۔مگر آج کے چکن چاؤ من تو ادھم تھے،مزہ آ گیا،عرفات نے آنکھ بند کر کے چٹخارہ بھرا۔اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اتنی سی بات کا یوں بتنگڑ بن جائے گا۔مہرین اس کی بے ضرر سی بے تکلفی کو یوں شک کی نگاہوں سے دیکھے گی۔

''واہ بھئی واہ کیا کہنے ہیں؟ آپ کی جرأت کو سات سلام پیش کرتی ہوں'' وہ ایک دم تیکھی مرچ بن گئی۔

''کیا کہہ رہی ہو؟ ایسی بات......'' ابھی عرفات کے منہ کی بات مکمل بھی نہ ہو پائی کہ مہرین نے تیزی سے کاٹا۔

''وہی تو...... بات یہاں تک پہنچ گئی کہ اپنے باس کو امپریس کرنے کے لیے لڑکیاں گھروں سے مزیدار کھانے پکا پکا کر لا رہی ہیں اور محترم سر دھن دھن کر تعریفیں کیے جا رہے ہیں! یہاں بیوی پورے دن گرمی میں کھپتی رہے۔صاحب کو یہ دکھائی نہیں دیتا۔'' عرفات کا منہ کھلا کھلا کا رہ گیا۔غلط فہمی کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھ کر مہرین نے معصوم سی لڑکی کے ساتھ بے دھڑک اپنے مجازی خدا کا افیئر چلا دیا جب کہ سمیرا! اسے اپنا بڑا بھائی گردانتی تھی۔وہ ناراض ہو کر اندر چلی گئی اور عرفات ماضی کی مہرین کو یاد کرنے لگا،جس کی زبان پر محبت کی ایسی چاشنی تھی کہ ہر ایک اس کا گرویدہ ہو جاتا۔

☆......☆......☆

ان دنوں کی ملاقات ایک اسکول میں ہوئی۔

عرفات اپنے بڑے بھائی راحت کے دونوں بچوں کو صبح صبح آفس جاتے ہوئے اسکول ڈراپ کرتا تھا،کیوں کہ راحت کی دوسرے شہر میں نوکری تھی۔مہرین اسی انگلش اسکول میں کوآرڈینیٹر کے عہدے پر فائز تھی۔چمپئی رنگت،موٹی موٹی آنکھوں اور متناسب سراپے کی حامل مہرین عرفات کو پہلی نگاہ میں ہی بہت اچھی لگی۔

اسکول میں کبھی کبھی بچوں کی ماہانہ کارکردگی کے حوالے سے بلائی جانے والی میٹنگ میں عرفات اور مہرین کے درمیان بات چیت ہونے لگی۔بے تکلفی بڑھی تو وہ آپس میں گھل مل گئے۔من موہنی سی مہرین عرفات کے دل و دماغ پر چھاتی چلی گئی۔اسے لگتا یہ لڑکی ہی اس کی منزل ہے پر وہ اس انتہا تک جانا نہیں چاہتا تھا۔

عرفات اپنے گھر والوں کی بنیادی سوچ سے با خوبی واقف تھا،جانتا تھا کہ اس کی راہ میں خاندانی رواج رکاوٹیں کھڑی کر دیں گے۔اسی لیے بہت سوچ سمجھ کر وہ اس کانٹوں بھری راہ میں مہرین کو الجھانے سے گریزاں ہوا۔دل مضطر کو جھڑکیاں دیتا،خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔

عرفات نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر بھائی کے بچوں کو اسکول وین لگا دی۔اسکول،میٹنگ والے دن اسے آفس میں ضروری کام پڑ جاتا یوں مجبوراً بھابھی کو جانا پڑتا لگا۔مہرین اس کی راہ تکتی رہ جاتی۔وہ دراز قد اور وجیہہ عرفات علی کے سحر میں گرفتار ہو چکی تھی،اس کے یوں اچانک غائب ہو جانے پر

پریشان ہو اٹھی مگر ان کے درمیان کون سے عہد و پیمان ہوئے تھے جو وہ عرفات کا گریبان پکڑنے کا حق رکھتی۔ یوں اس کا سیل نمبر ہونے کے باوجود مہرین کی نسوانی حیانے رابطہ کرنے سے باز رکھا۔

عرفات جتنا اس سے دور بھاگ رہا تھا۔ وہ اتنا ہی یاد آئے جاتی۔

رات گئی، بات گئی' کے مصداق۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مہرین کو بھول جائے گا مگر دو دن میں ہی اسے احساس ہوا کہ بات اب بہت دور نکل گئی ہے۔ محبت کی جڑیں تو دل کی زمین کے اندر ہی اندر پھیل چکی ہیں۔ اس کے لیے اب مہرین کے بغیر زندگی گزارنا ناممکن ہوگیا۔ تھا۔ سوتے جاگتے اسی کی یاد ۔ کچھ ایسی ہی حالت مہرین کی بھی ہوگئی مگر وہ ہونٹوں کو بند کیے رہی۔

عرفات کی ہمت جواب دے گئی تو اس نے دماغ کو ڈانٹا اور دل کی بات مان کر اپنی ماں کو مہرین کے بارے میں بتادیا۔ وہ ایک دم آگ بگولہ ہو اٹھیں ۔ان کے کمرے سے بات نکل کر پورے گھر میں کیا پھیلی سارے اس کی مخالفت میں کھڑے ہوگئے۔ عرفات نے پروانہ کی۔ وہ اپنے ارادوں پر ڈٹ کر کھڑا ہوگیا۔

ایک لمبی بحث مباحثہ کے بعد عرفات کے والد نے چند شرائط پر بیٹے کی بات مان لی۔ وہ لوگ مہرین کے گھر رشتہ مانگنے پہنچ گئے ،اس پر تو حقیقتاً شادی مرگ طاری ہوگئی۔ شرط کے مطابق شادی کے بعد ان دونوں کو علیحدہ رہائش اختیار کرنے حکم دے دیا گیا۔

مہرین حیران رہ گئی مگر عرفات کے سمجھانے پر خاموش ہوگئی۔ نئے سویرے کے ساتھ نیا بسیرا، ان کو راس آگیا۔ دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں اتنے شاداں وفرحاں تھے کہ بہت دنوں تک اس بات کا غم نہیں منایا، اپنی چھوٹی سی دنیا میں جلد ہی مگن ہوگئے۔

عرفات اور مہرین کی محبت۔ شادی کے ایک سال کے اندر اندر مزید پروان چڑھی۔ وہ دونوں محلے بھر میں ایک مثالی جوڑا کہلانے لگے۔ ان کے ازدواجی زندگی میں ہونے والے معمولی اختلافات کبھی بھی گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل پاتے۔ عرفات کے آفس جانے کے بعد مہرین کام والی سے گھر کی صاف صفائی کروالیتی۔ اس کے بعد کھانا پکاتی۔ ان کاموں سے فراغت مل جاتی تو وہ ٹی وی لگا کر یا کوئی اچھی سی کتاب ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتی، کبھی کبھی ویک اینڈ پر میکے کا چکر لگا آتی۔ مگر کب تک؟ ایک ہی طرح کے کاموں سے اب وہ بیزار رہنے لگی۔۔ اولاد ہوجاتی تو شاید وہ مصروف ہوجاتی، مگر قدرت کو ابھی یہ بات منظور نہ تھی۔ ایک دن مہرین شریک حیات سے تنہائی کا شکوہ کر بیٹھی۔

'وہی ہوا، جس کا ڈر تھا' عرفات نے سوچا اور عجیب سے احساس سے دوچار ہوگیا۔ اسے اپنی محبت پر شرمساری ہوئی کہ مہرین جیسی، سوشل اور باتونی لڑکی کو تنہائی کے درد سے ہمکنار کردیا۔ عرفات کے باقی تینوں شادی شدہ بھائی اب بھی مل جل کر ان کے والدین کے ساتھ اسی بڑے سے گھر میں رہتے تھے، اس کا دل اپنے گھر کے لیے مچلتا، وہ والدین سے تنہائی میں مل کر مہرین کے لیے راہ ہموار کرنے کی پوری کوشش کررہا تھا۔ اسے تاحال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہاں کی رونق کے مقابلے میں یہاں کے اکیلے پن پر بھی عرفات کو اپنے گھر والوں کی زیادتی کا احساس ہوتا۔ انہوں نے مہرین کی ساری خوبیوں کو صرف ان کی نگاہ میں ایک خامی کی خاطر نظر انداز کردیا کہ وہ ان کی برادری میں سے نہیں تھی۔ اسی لیے شادی میں رکاوٹیں ڈالی گئیں،

کیوں کہ ان کے خاندان میں آج تک غیر برادری کی بہو نہیں آئی تھی۔ مگر وہ جو کہتے ہیں رشتے تو اوپر طے ہوتے ہیں تو ان کا ایک ہونا تقدیر میں لکھا تھا جو ہو کر رہا۔ وہ اس دور میں بھی ذات برادری کے جھنجٹوں میں پڑے ہوئے تھے۔

'کیا تھا کہ وہ بھی اس کی دوسری بھابیوں کی طرح بھرے پرے سسرال میں رہ رہی ہوتی۔ وہاں کی رونق میں کتنا خوش رہتی۔' عرفات نے مسکراتی نگاہوں سے مہرین کو دیکھا جو اپنی قمیض کی سلائی کرنے میں مگن تھی۔ وہ بہت بدل گئی تھی۔ عرفات ان باتوں کی تلافی کے طور پر شام کو بیوی کو ساحل سمندر پر گھمانے پھرانے لے گیا، ایک اچھا ٹائم گزار کر مہرین اپنی خاموش جنت میں لوٹ آئی۔

☆......☆......☆

''اب یہ ہوگا یعنی کہ ایک ہی محلے میں رہتے ہوئے بھی پرانے دوستوں کو ایسے نظر انداز کیا جائے گا'' عرفات مسجد سے مغرب کی نماز کی ادائیگی کے بعد باہر نکل کر جوتا پہن رہا تھا کہ شکیل احسان نے پیچھے سے آکر شرارت سے کہا۔

''ارے ...... شکیل! کیسے ہو بھائی! کافی دنوں سے تمہاری کوئی خیر خبر نہیں؟'' عرفات نے مسکرا کر دوست سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو شکیل نے اسے گھسیٹ کر گرمجوشی سے گلے لگالیا۔

''میاں! ہم تو یہیں پر ہیں۔ پر جب سے شادی ہوئی، آپ تو جیسے بھابی کو مکمل طور پر پیارے ہوگئے ہو۔'' شکیل نے عرفات کے ساتھ چلتے ہوئے شکوہ کیا۔ اس نے مڑ کر دوست کو نگاہوں میں تولا۔ وہ کافی پرانا اور قابل اعتبار شناسا تھا۔ اسے بھی آج کل کسی غمگسار کی ضرورت تھی یوں اپنا حال دل پرانے دوست سے کہہ سنایا۔ شکیل نے ساری کتھا سننے کے، اسے بھرپور مسکراہٹ سے نوازا۔ اس کے بعد ترنت مہرین کو اپنی بیوی نفیسہ کے پاس بھیجنے کا مشورہ دے دیا۔

''میاں! ان دونوں میں دوستی ہوجائے گی تو ہمارے لیے بھی اچھا رہے گا۔ بیویوں کے طفیل ہم دوستوں کو بھی کبھی کبھار شام کی چائے ایک ساتھ پینے کا موقع مل جائے گا۔ نفیسہ کے پاس اکثر محلے کی دوسری خواتین بھی کچہری کرنے آتی ہیں۔ بھابی کی وہاں سب سے ملاقات ہوگی تو ان کی بوریت دور ہوجائے گی۔ یوں وقت بھی اچھا کٹ جائے گا۔'' شکیل نے عرفات کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے مشورہ دیا، جو اس کے دل کو چھو گیا۔ اس نے گھر واپسی پر مہرین کو سمجھا بجھا کر نفیسہ بھابی سے دوستی کرنے پر مجبور کیا گویا اپنی شامت اعمال کو صدا دی۔

☆......☆......☆

مہرین شروع میں تو نفیسہ کے گھر جانے میں تھوڑا جھجکی، مگر دو ایک بار جانے کے بعد، اسے بھی وہاں سب سے بات چیت کرنے میں مزہ آنے لگا۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا مگر بات اس سے بہت آگے چلی گئی۔ اب جانے نفیسہ نے اسے شادی شدہ زندگی کے کون کون سے ایسے گر سکھائے کہ مہرین کی محبت کی شیرینی کو جیسے بے اعتباری کی مکھیوں نے چوس لیا۔ وہ شوہر کو شیرنی کی نگاہوں سے دیکھتی، کبھی جیبوں کی تلاشی لی جارہی ہوتی۔ کبھی لڑکی کی تصویر کی تلاش میں اس کا پرس کھنگالا جاتا۔ اور تو اور، وہ اکثر اس کے موبائل پر آنے والے ٹیکسٹ میسج بھی دل لگا کر پڑھنے لگی۔ جاسوسی کرنے میں اس نے تربیت یافتہ جاسوس کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

کافی دنوں تک تو عرفات نے مہرین کی اپنے لیے محبت کو جنون میں بدلتے دیکھ کر انجوائے کیا۔ مگر بات جب حد سے بڑھنے لگی، شک وشبہات نے اس

کی زندگی میں زہر گھولنا شروع کر دیا تو وہ بے زار ہو اٹھا۔

''کل ہی آفس جا کر، سمیرا سے کال کروا کر مہرین کی غلط فہمی دور کروا دوں گا ورنہ...... معاملات مزید خراب ہو جائیں گے۔ وہ نہ خود چین سے بیٹھے گی اور نہ ہی مجھے بیٹھنے دے گی۔'' عرفات کی خیالوں کی ڈور ٹوٹی۔ اس نے اداسی سے دروازے کی جانب دیکھا، بیوی کو تلاش کیا، جو بلاوجہ کے کام نکال کر کچن میں مصروف ہونے کا بہانہ کر رہی تھی۔ وہ مہر کی رگ رگ سے واقف تھا۔ نفیسہ نے اس کے دل میں مردوں کے خلاف ایسی گرہ باندھ دی کہ وہ جانے انجانے عرفات کے ساتھ بھی زیادتی کر جاتی۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وجود میں بڑھتی ہوئی گھٹن اور حبس نے بے چین کیا تو عرفات نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ ایک سرد ہوا کا جھونکا، اسے چھو گیا۔ عرفات نے چہرہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند پورے آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔ نرم سی دودھیا چاندنی، کھڑکی سے پھسلتی ہوئی اس کے کمرے میں پھیلنے لگی، ماحول ایک دم خواب ناک ہو گیا۔ اسے شرارت سوجھی۔

وہ مسکراتا ہوا کچن کی طرف بڑھا۔ مہرین کسی سوچ میں گم سلیب کے پاس کھڑی تھی، عرفات نے کچھ کہے بغیر پیار سے بیوی کا ہاتھ تھاما اور اسے زبردستی کمرے میں گھسیٹتا، ہوا واپس ہوا۔

عرفی کیا کر رہے ہو؟ اف...... ہاتھ تو چھوڑو۔'' مہرین ناراضی دکھاتی کمرے میں داخل ہوئی۔ عرفات نے اسے کھڑکی کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔ وہ ایک دم مسحور ہو گئی۔ عرفات اس کے برابر میں آ کھڑا ہوا۔ آسمان پر نگاہیں جما دیں، مہرین نے شوہر کی تقلید میں اپنا خوش نما سر اٹھا کر چودھویں کے چاند کو تکا، اس کے نرم گلابی لبوں کے گوشوں سے ایک دم مسکراہٹ مچلنے لگی۔

''عرفات جانتے ہیں نا کہ ان کی مہر ایسی چاندنی راتوں کی دیوانی ہے۔ جب ہی تو مجھے خوش کرنے کے لیے یہاں لے کر آئے۔'' مہرین کو ایک بار پھر شوہر کی شدید محبت کا ادراک ہوا۔ دل کے غبار ڈھل گئے، وہ اس سحر انگیز ماحول کے فسوں گری میں گرفتار ہو گئی۔

☆......☆......☆

نفیسہ کا عجب حال تھا۔ شادی کے بعد سے اس نے شکیل کو اتنا دبا کر رکھا تھا کہ وہ اہلیہ کے سامنے سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ جیسا وہ چاہتی گھر کا ماحول ویسا ہی غیر متوازن ہوتا چلا گیا۔ شکیل نے بلا شرکت غیرے، اس کی حکومت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اتنی بڑی کامیابی کے بعد۔ نفیسہ اپنے آپ کو تیس مار سمجھتے ہوئے، محلے بھر کی خواتین کو اس راہ پر چلنے کی صلاح دیتی۔ مہرین دل کی صاف لڑکی تھی۔ جو دل میں ہوتا وہی زبان پر، سب کو اپنے جیسا سمجھتی، اسی لیے لوگوں پر جلد اعتبار کر لیتی۔ اسے بھی نفیسہ کی باتیں سچ سنائی دیتیں۔

''میں تو کہتی ہوں وہ کم عقل عورتیں ہوتی ہیں جو شوہر حضرات پر آنکھ بند کر کے اعتبار کر لیتی ہیں، انہیں کھینچ کر رکھنا ضروری ہے، ورنہ یہ فوراً ہی پٹری سے پھسل جاتے ہیں۔ مجھے دیکھو، شادی کے سات سال گزر گئے، مگر مجال ہے کہ شکیل ایک دن بھی اِدھر اُدھر ہوئے ہوں'' نفیسہ نے گپ شپ کرنے والی خواتین کی باتوں کے بیچ میں اپنی نصیحت کا تڑکا لگایا، مہرین جس کا دل رات تک صاف ہو چکا تھا، پھر گڑبڑایا۔

''بھابی! اس طرح شوہر پر شک کرنے سے گھر کا ماحول جو آلودہ ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں چھوٹی چھوٹی

باتوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔'' مہرین نے پہلی بار نفیسہ کی بات سے اختلاف کیا تو اس نے ناگواری سے اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے مہرین کو گھورا۔

''یہ کیا بات ہوئی، اگر تمہیں کسی معاملے پر شک ہوگا تو تم کیا ان سے پوچھو گی نہیں؟ ویسے بھی تم جیسی عقل سے کوری لڑکیاں ہوتی ہیں۔ جن کے شوہر انہیں بے وقوف بنا کر دوسری لڑکیوں کے ساتھ پینگیں بڑھاتے ہیں۔ میرے شکیل کو دیکھا ہے، غیر لڑکیوں سے دو فٹ دور بھاگتے ہیں۔'' نفیسہ نے مہرین کو جھڑکتے ہوئے، میاں پر نگاہیں جمائیں، جو کہیں جانے کے لیے اپنی بائیک نکال رہا تھا، مجال ہے جو اس نے نگاہ اٹھا کر بھی خواتین کی اس بیٹھک کی طرف دیکھا ہو جہاں پانچ خواتین چہ میگوئیوں میں مصروف تھیں۔ نفیسہ نے اس معاملے پر خود کو خیالوں ہی خیالوں میں ایوارڈ سے نوازا۔

☆......☆......☆

''عرفات! سنیں! شکیل بھائی ہمارا بکرا دیکھنے آئیں ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں'' عرفات جو واش روم میں شب خوابی کا لباس تبدیل کرنے گیا ہوا تھا، مہرین نے دروازہ بجا کر اسے زور سے پیغام دیا۔ وہ جلدی سے باہر نکلا۔

''شکیل بھی اپنے نام کا ایک ہے۔ رات کے دس بجے بکرا دیکھنے چل پڑا۔ صبح پوچھ رہا تھا کہ تمہارا قربانی کا جانور کیسا آیا ہے؟ میں نے کہا تھا کہ آ کر دیکھ لینا۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ آج رات کو چل پڑے گا۔'' بیوی کے چہرے پر ناگواری کی چھاپ دیکھ کر اس نے تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے دھیمے سے صفائی پیش کی۔ پاس رکھی کرسی پر پڑا اپر اٹھا کر پہنا۔ اور دروازے کی طرف بڑھا پھر پلٹ کر مہرین کے قریب آیا۔

''سنو! مہر پلیز دو کپ چائے بنا دو۔'' وہ تیزی سے صحن کی طرف بڑھا جہاں قربانی کے لیے لایا گیا بکرا باندھا گیا تھا۔ مہرین چپل پہن کر کچن کی طرف چل دی۔

''اچھا دانا مل گیا ہے دیکھنے میں بھی خوبصورت جانور ہے۔'' شکیل نے بکرا دیکھتے ہوئے کہا پھر وہ دونوں وہیں کھڑے ہو کر مہنگائی اور عید قرباں پر جانوروں کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر تبصرہ کرنے لگا۔ مہرین ان دونوں کی باتوں پر مسکرا دی۔ آج کل ہر دوسرے گھر کا موضوع، گائے، بکرے بنے ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

''کیا! بھابی کا فون تھا؟ اوہو! دو منٹ میں ہی پریشان ہونا شروع ہو گئیں'' مہرین چائے لے کر صحن کی طرف بڑھی تو عرفات کے شکیل کو چھیڑنے پر ہنس دی۔ عرفات کو بھی نفیسہ بھابی کی شکی طبیعت کے بارے میں پتا ہے، ان کی نگاہیں ہر وقت شوہر کے تعاقب میں جو رہتی ہیں۔'' مہرین سوچتی ہوئی آگے بڑھی کہ شکیل کے بدلے ہوئے تیور پر حیران رہ گئی۔

''کس آفت کا نام لے لیا۔ منہ کا مزہ خراب کر دیا۔ نہیں یار یہ تو میری نئی دوست ہے۔ رانگ کال پر بات چیت شروع ہوئی۔ چند مہینوں میں ہماری دوستی بڑھتی گئی جو اب رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ روبی بہت خوبصورت، اچھی اور ہمدرد لڑکی ہے۔ نفیسہ کی طرح کوئی جلاد نہیں۔ جو جینا حرام کر کے رکھ دے۔ سچ روبی کی وجہ سے زندگی کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ ایک بار پھر زندہ ہونے کا احساس ہونے لگا ہے۔'' شکیل نے مسکرا کر کہا۔ ان کی آواز میں جذبوں کی گنگناہٹ تھی۔ مہرین کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اسے شکیل کی بات نے شاک پہنچایا۔ عرفات جو بالٹی میں بکرے کا چارہ ڈال رہا تھا چونک کر شکیل کی طرف مڑا۔

''دوست! مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ تم بھابی سے

چھپ کر یہ گل کھلا رہے ہو۔ یار یہ تو۔ بڑے افسوس کا مقام ہے'' عرفات نے غصے سے کہا۔

''پلیز بھائی! لیکچر نہ دو۔ میں اب مزید نفیسہ سے ڈر ڈر کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ مجھے بھی خوش رہنے کا حق ہے۔ اتنی سی زندگی ہے ہنس گا کر جی لوں۔ ویسے بھی جب میں نے اسے زندگی کی ساری آسائشات دی ہوئیں ہے تو اسے بھی چاہیے کہ وہ گھر میں خوشی خوشی زندگی گزارے

میں باہر جو بھی کرتا پھروں۔ اسے ہوا بھی لگنے نہیں دوں گا۔'' شکیل نے اس کے غصے کا ذرا بھی نوٹس نہیں لیا۔ مہرین نے بغور عرفات کو دیکھا، وہ شکیل کی باتوں سے بہت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہ دونوں ایسے رخ پر کھڑے تھے کہ ان کی نظر ابھی تک مہرین پر نہیں پڑ سکی تھی۔

''میاں لیکچر نہیں دو بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی ایک ایسی کھڑکی اپنی زندگی میں کھول لو، جہاں سے تازہ ہوا کا گزر ہو۔ عمر کی نقدی ختم ہونے سے قبل۔ زندگی کے مزے لوٹ لو بھائی۔'' شکیل نے پاس بندھے سفید بکرے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شوخی سے کہا۔

میں...... میں!'' بکرے نے ممیاتے ہوئے گردن ہلائی۔

''دیکھو میاں! تم سے تو یہ جانور عقلمند ہے۔ اپنی خدمات پیش کر رہا ہے کہ ''میں'' ہوں نا۔ میری دوستی کرا دو۔'' شکیل کی شوخی عروج پر تھی۔ مہرین کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ جا کر اس شخص کا منہ نوچ لے، جو بیوی کے سامنے نقاب اوڑھے رکھتا ہے۔ خود تو غلط کرتا ہے۔ اس کے شوہر کو بھی ترغیب میں مبتلا کر رہا ہے۔

بس کر دو! مجھے اس کے آگے ایک لفظ نہیں سننا۔ پلیز اب تم جاؤ۔ میں اپنی مہر سے محبت ہی نہیں کرتا، اس کی عزت بھی کرتا ہوں۔ وہ میری زندگی کا حاصل ہے۔ اسے دھوکا دینے کے بارے میں، میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' عرفات نے بڑے ریلکس انداز میں دوست کو جواب دیا۔

''مجھے نہیں خبر تھی کہ تم بھابی سے اس قدر ڈرتے ہو۔ بھائی یقین کرو میں۔ تمہارے لیے ایک اچھی سی دوست ڈھونڈ نکالوں گا۔ بھابی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ یہ کیا کہ ہم خود پر پہرے بٹھا کر کسی ایک کے گرد ہی چکور بنے رہو۔'' شکیل نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اپنی خدمات پیش کی۔

''میرے بھائی بہت دیر ہو چکی ہے۔ گھر لوٹ جاؤ یہ نہ ہو کہ دن نکل آئے اور تمہیں خبر ہی نہ ہو اور تم اندھیرے میں ہی ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرو۔'' عرفات نے انگڑائی لیتے ہوئے دوست کی کم عقلی پر لطیف سی چوٹ کی۔ وہ منہ بناتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا

''ایک بات اور...... جب انسان نکاح کے مقدس بندھن میں بندھ جاتا ہے تو خود بخود ایک دوسرے کے لیے محبت کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اس رشتے سے نیک نیتی سے نباہ کیا جائے تو زندگی تبدیل ہو جاتی ہے۔ میں کبھی بھی اپنی بیوی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر اپنی محبت کی چادر کو داغدار نہیں کروں گا، جسے اوڑھا کر میں نے اسے عزت بخشی، اپنا نام دیا اور اس گھر میں لایا'' عرفات نے شکیل کو رخصت کرتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا، وہ منہ بناتا سر جھکا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

مہرین فوراً اپنے کمرے میں دوڑی۔ سارے اندیشے عرفات کی محبت کی بارش میں بھک سے اڑ گئے۔ اس کا شوہر پر اعتماد کیا بحال ہوا اپنے آپ سے شرمندگی ہوئی۔ وہ واقعی سچا ہے۔ اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔

☆☆......☆☆

مکمل ناول

اُمِ مریم

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

لاریب کو جیسے شاک لگا تھا۔ عبدالغنی اور محض چند گھنٹوں میں اتنا بیگانہ...... وہ اسے صدیوں کے فاصلے پر لگا تھا کسی غیر عورت کی فیور میں بولتا ہوا۔ اس سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی نقصان ہو ہی نہ سکتا تھا جیسے۔ وہ تو بیٹھے بٹھائے لٹ گئی تھی۔ "وہ...... جھوٹ بول رہی تھی......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا آٹھواں حصہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے دریچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ جو رب کو ناراض کر کے وحشتوں میں مبتلا ہے۔ گندگی اور پلیدگی کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونے میں مانع رکھتا ہے۔ مایوسی اس کی اتنی گہری ہے کہ رب جو رحمٰن ورحیم ہے، جس کا پہلا تعارف ہی یہی ہے۔ اسے یہی بنیادی بات بھلائے ہوئے ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرسچن نوجوان جو اپنی خوبروئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جبھی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب نا چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے جو خیالات کی چکی میں پس کر خود بھی سراپا تغیر کی زد میں ہے۔ علیزے کی واپسی کی خواہاں ہے اور علیزے کی مایوسی اور اس کی بے اعتباری کو اُمید میں بدلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص کر علیزے...... جس پر علیزے کی بڑی بہن ہونے کے ناتے پوری اجارہ داری ہے۔ عبدالغنی ان کا بڑا بھائی ہے۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیزگار نہیں عاجزی وانکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ در پردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پرہیزگاری و نیکی میں خود سے آگے کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر
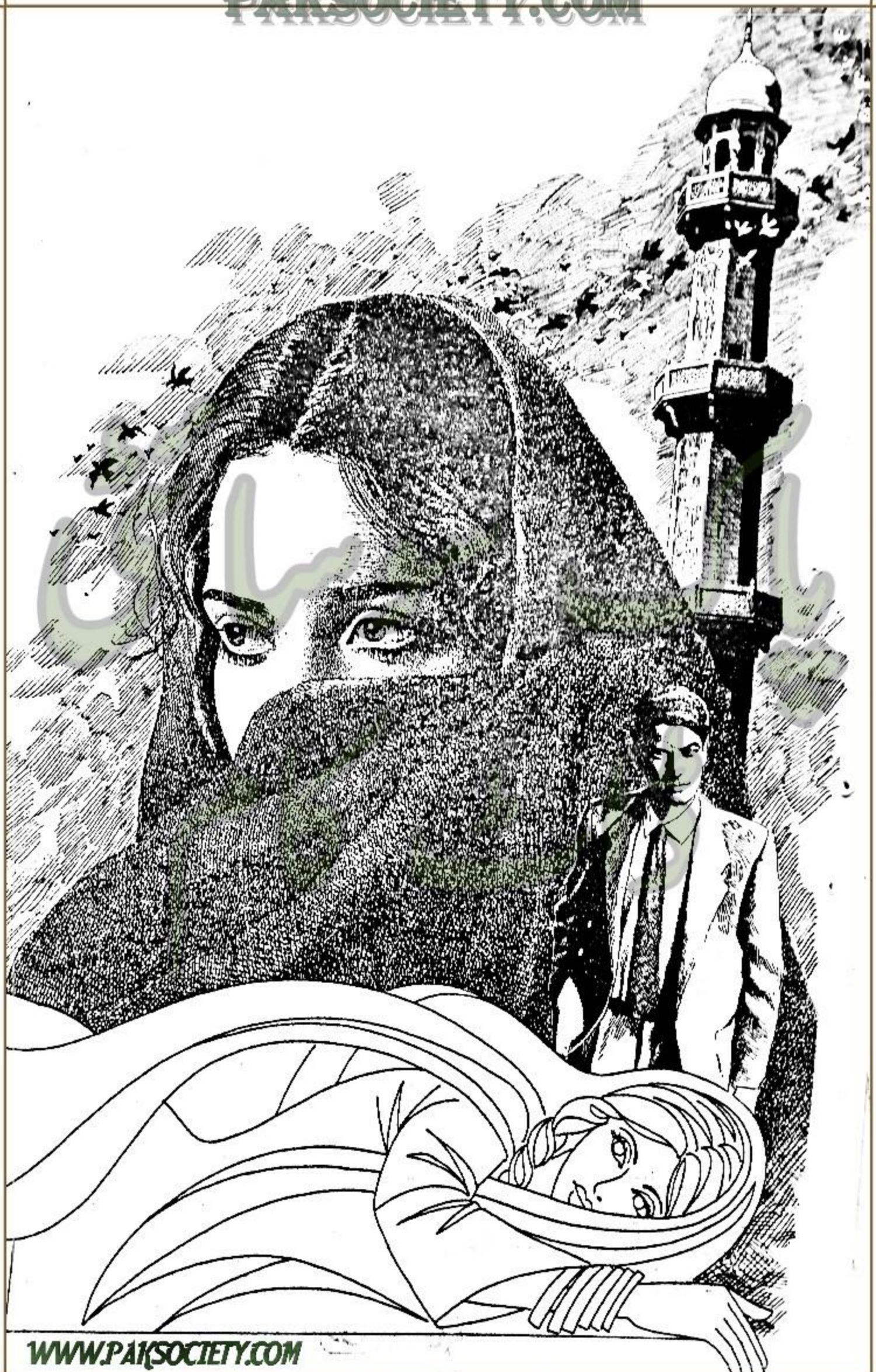
اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اس کے انکار پر اس سے بات کرنے خود ان کے ہاں آتا ہے اور شوبز تک چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضامند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہیں اس موقع پر اس کی پہلی ملاقات عبدالغنی سے ہوتی ہے۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔ محلے کا اوباش لڑکا علیزے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جس کا علم بریرہ کو ہونے پر بریرہ علیزے کی کردار کشی کرتی ہے۔ علیزے اس الزام پر سوائے دل برداشتہ ہونے کے اور کوئی صفائی پیش کرنے سے لاچار ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی ممی اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لاابالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ لاریب کی دلچسپی عبدالغنی کی ذات میں بڑھتی ہے۔ جسے بریرہ اپنی منگنی کی تقریب میں خصوصاً محسوس کر جاتی ہے۔ لاریب محبت کی راہوں کی تنہا مسافر ہے۔ عبدالغنی انجان بھی ہے اور لاتعلق بھی۔ لاریب کے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث ہے کہ وہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے مگر وہ لاریب کی طرح ہرگز مایوس نہیں ہے۔ شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سرد مہری ہی نہیں حاکمیت آمیز بھی ہے۔

اسے ہارون کے ہر اقدام پہ اعتراض ہے۔ وہ اس پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہے اور اس کی ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ ممی کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جبھی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاریب کو بھی جتلا چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ لاریب کو عبدالغنی سے روا رکھا جانے والا ممی کا رویہ بغاوت پر ابھارتا ہے۔ وہ تمام لحاظ بھلائے جو اب تک اس کے قدموں کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکے تھے اپنا گھر چھوڑ کر عبدالغنی کے پاس آ کر عبدالغنی سے خود کو اپنانے کی گزارش کرتی ہے۔ عبدالغنی اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے بہلا، سمجھا کر واپس بھیجتا ہے۔ مگر لاریب اس مصالحانہ عمل کو سمجھے بغیر اسے اپنی ریجیکشن اور تذلیل سمجھتے ہوئے شدید ہیجان میں مبتلا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھتی ہے۔ ممی اس کی حالت پر ہراساں جبکہ لاریب اسی ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا عبدالغنی کے حوالے سے اپنی ہر شدت اور شدت پسندانہ بے بسی ان کے سامنے عیاں کر جاتی ہے۔ ممی جو بریرہ کے حاکمانہ رویے اور ناشکرانہ انداز کی بدولت سخت دل برداشتہ ہیں اور اپنی بیٹی کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے میں شامل ہیں۔ لاریب کی خوشی کی خاطر اس شادی پر بالآخر آمادہ ہونے پر ایک بار پھر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لاریب کی دائمی مسکراہٹ کی چاہ انہیں عبدالغنی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے۔

بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔ جبھی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنورتی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر اذیتوں کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت تنہا ہوتی ہے۔ جب وہ علیزے کے حوالے سے اس پر الزام عائد کرتی ہے۔ صرف ہارون نہیں...... اس کی حرکت کے بعد علیزے بھی بریرہ سے نفرت پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ وقت کچھ اور آگے سرکتا ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساسِ جرم میں مبتلا رب کو منانے ہر صورت علیزے کی واپسی کی ملتمس ہے۔ ہارون کے ہر احساس سے گویا بے نیاز ہو چکی ہے۔ ہارون اس بے نیازی کو لاتعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوبز کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آ کر بریرہ کو جھنجوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

علیزے کی واپسی کے بعد عبدالغنی سمیت اس کے والدین بھی علیزے کے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ علیزے نے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی یہ علم بانٹ رہی ہے۔ عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیرِ تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

عمیرا ایک بدفطرت عورت کے بطن سے جنم لینے والی باکردار اور باحیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرز زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ مگر حالات کے تار عنکبوت نے اسے اپنے منحوس پنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کمی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔

اپنے اور ہارون کے بیچ میں آئی خلیج کو پاٹنے کے لیے بریرہ مکمل طور پر تیار ہے۔ اب وہ صرف ہارون اسرار کی باندی بن کر رہنا چاہتی ہے۔ اُسے محبت کا ادارک اپنی غلطی کا اعتراف کرا دیتا ہے۔ سارہ ایک بار پھر ماں بننے والی ہے۔ وہ یہ خبر ممی کو بتا دیتی ہے۔ ممی اُسے اسامہ سے فی الحال اس خبر کو راز میں رکھنے کا کہتی ہیں۔ عبدالہادی نامی خوبصورت وجیہہ نوجوان کا علیزے کے لیے رشتہ آتا ہے۔ جسے چھان بین کے بعد قبول کرلیا جاتا ہے۔ لاریب اور عبدالغنی ایک خوبصورت زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا بیٹا عبدالعلی ہے جو اُمِ جان اور بابا جان کی بھی آنکھوں کا تارا ہے۔ رخصتی کے بعد علیزے عبدالہادی کی معیت میں حجلۂ عروسی تک پہنچتی ہے۔ اچانک عبدالہادی اُسے مخاطب کرتا ہے تو وہ گھونگٹ اُلٹ دیتی ہے۔ وہ نوجوان کوئی اور نہیں۔ یوسف ہوتا ہے......

(اب آپ آگے پڑھیے)

یہ بہتی ندیا پہ چڑھتے دریا
یہ گہرا ساغر یہ جھیل جھرنے
یہ آبشاریں یہ اپنا جیون
تمہاری آنکھوں پہ وار جائیں
رنگ خوشبو گلاب سارے
سب تمہاری بلائیں لے لیں
نظر تمہاری اتار جائیں

وہ خاموش ہوا تو لاریب کا بس نہیں چلا تھا۔ فدا ہو جائے اس پر یا اپنا دل نکال کر اس کے قدموں میں رکھ دے۔ اور کچھ نہیں تو اس کے گلے تو ضرور لگ جائے۔ بس نم آنکھوں میں محبت کا احساس لیے اسے دیکھتی رہی تھی۔

''آمین ثم آمین۔'' ہارون نے مسکرا کر بات کو آگے بڑھایا تھا۔ عبدالہادی کھنکارا۔

''اب آپ کچھ سنایئے نا ہارون بھائی!'' اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ ہارون نے بے اختیار اس گوشے کی جانب دیکھا جہاں بریرہ خاموش بیٹھی تھی مگر اسی کی جانب متوجہ، نگاہوں کا یہ تصادم بہت دلفریب تھا۔ ہارون نے فی الفور نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا۔ بریرہ یوں مسکرائی گویا اس کے انداز کے خائف ہونے کو پوری طرح محسوس کیا ہو۔

''جی ہارون بھائی! سنایئے ناں۔'' لاریب نے بھی اصرار کیا تھا۔ وہ تب بھی خاموش رہا۔ پھر سر کو اثبات میں ہلانے لگا۔

محبت اس طرح جیسے، گلابی تتلیوں کے پر
محبت زندگی کی جبینِ ناز کا جھومر
محبت آرزو کے سیپ کا انمول سا گوہر
محبت آرزو کی دھوپ میں اُمید کی چادر
محبت میں ترے گیسو، تری پلکیں، تری آنکھیں
محبت خاموشی تری، محبت ہے تیری بانہیں
محبت ہے تری دھڑکن محبت ہے تری یادیں
محبت تیری خاموشی، یہ تیری بات جیسی ہے
محبت کانچ کا سودا، محبت آگ کا دریا
محبت جون جیسی بھی محبت برف جیسی بھی
محبت رات کالی بھی محبت نیلا موسم بھی
محبت کچا آنگن ہے محبت تتلیوں کا گھر
محبت گھات گہری ہے محبت مات جیسی ہے

وہ اک تان اک لے میں بڑے جذب سے کہتا یکدم رُک گیا۔ پھر سر اٹھا کر بریرہ کی جانب دیکھنا شروع کیا تھا۔ ماحول پر ایک سکوت طاری ہوگیا۔ بریرہ کو اپنے دل کی دھک دھک بھی سنائی دینے لگی۔ اسے ڈر لگا۔ جانے وہ اب کیا کہہ ڈالے۔

مگر بھی محبت ہو ہی جاتی ہے
کسی انجان ہستی سے
کسی کاغذ کی کشتی سے
کسی کھڑکی کے منظر سے
کسی دھندلی سی حسرت سے
کسی جھوٹی تسلی سے
محبت ہو ہی جاتی ہے

اس کی سلگتی آنکھوں میں جیسے ماضی کی ایک ایک یاد جھلس رہی تھی۔ اور ان سے دھواں اٹھتا تھا۔ اسے وہ اذیت و کرب سے دوچار محسوس ہوا تو بے چینی بریرہ کے اندر سرایت کرنے لگی۔ یہ محفل شاید جاری رہتی۔ مگر اس کا دل اتنا بوجھل ہوا تھا کہ مزید وہاں نہیں ٹھہر سکی۔ علیزے اس سے بھی پہلے وہاں سے نیچے جا چکی تھی۔

☆......☆......☆

''آپ تیار ہیں؟'' وہ سر جھکائے قدرے مضطرب لگتی تھی۔ عبدالہادی کی آواز پر سر اٹھانے سے قبل ہی اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

''ظاہر ہے اور مجھے کوئی سنگھار تو کرنے نہیں تھے۔'' وہ جیسے پھاڑ کھانے کو دوڑی تھی۔

''بہترین اخلاق کی ہمارے مذہب میں بہت اہمیت ہے۔ آپ کو یہ سن کر بالکل اچھا نہیں لگے گا کہ آپ کی ساری خوبصورتی کو گھن لگ جاتا ہے اس خامی کے باعث۔'' اس کا بیگ اٹھاتے ہوئے وہ شریر انداز میں مسکراہٹ دبا کر کہہ رہا تھا۔ علیزے کے تو جیسے سر پر لگی تھی۔

''تم جتنے اچھے اور اعلیٰ مومن ہو ناں سب پتا ہے مجھے۔'' اس کا بس ہی نہ چلا تھا گویا گلا ہی دبا ڈالتی اس کا۔

''کاش کہ کسی محاذ پر جام شہادت نوش کر سکتے۔ ہماری سچائی کا یقین تو آتا کسی طور۔ قہر بھری ظالم جوانی اسی انتظار میں کٹ جائے۔'' ادھر مجال ہے جو اثر ہوا ہو۔ علیزے دھک سے رہ گئی۔ اس کی بدلی ہوئی ٹون نے اس کے اندر خطرے کی گھنٹی کو ٹناٹن بجانا شروع کر دیا کرتی تھی۔ اسے لگا وہ آہستہ آہستہ اپنی فارم میں آ رہا ہے۔ اپنا اصل دکھا رہا ہے...... اصل...... جو بہت مکروہ تھا۔ جو قابلِ نفرت تھا۔

''بس ہو گئی بولتی بند۔ ادھر ہم میدان میں کودے نہیں اور آپ کی دوڑ لگی نہیں۔ یہ تو فیئر نہیں ہوا مسز۔'' بیرونی دروازہ کھولتے ہوئے اس نے جیسے رُک کر شکوہ کیا تھا۔ علیزے کے اندر الاؤ سے دہک اٹھے۔

''خبردار! جو یہ لفظ میرے لیے استعمال کیا ہو۔ میرے لیے ہر رشتہ اور بندھن حرام ہے جب تک تمہارا اصل سامنے نہیں آ جاتا میرے۔'' وہ انگلی اٹھا کر غرائی۔ عبدالہادی نے ہونٹ بھینچ لیے۔ رُخ پھیر کر اسے کچھ دیر خاصی پُرتپش نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر عجیب سی بے بسی کے ساتھ گویا ہوا۔

''میرا ضبط مت آزمائیں دیا! آخر انسان ہوں میں بھی۔'' اس کا لہجہ بھیچا ہوا تھا مگر علیزے حقارت بھرے انداز میں متنفرانہ انداز میں ہنکارا بھر کے اسے گھورنے لگی۔

''انسان نہیں کہو خود کو، شیطان ہو تم۔ اپنی شیطانیت کب تک چھپا کر رکھو گے۔ بالآخر تمہیں عیاں ہونا ہی ہے۔ مجھے بھی اسی وقت کا انتظار ہے۔''

جواب میں عبدالہادی کے چہرے پر کتنے ہی رنگ آ کر گزر گئے۔ ضبط کی دہکتی ہوئی آنچ اس کی آنکھوں میں ہلکی نمی کی صورت تیر گئی۔ ہونٹ بھینچے وہ خاموش کھڑا اسے کتنی دیر دیکھتا رہا۔

ثواب سمجھ کر تم دل توڑتے ہو ہمارا
گناہ سمجھ کر ہم گلہ نہیں کرتے

خود کو سنبھال کر وہ مدھم بے حد بھاری مگر بوجھل آواز میں گویا ہوا تھا۔ ہونٹوں کی تراش میں بڑی مجروح، بڑی تھکی ہوئی مسکان تھی۔ باہر آ کر سوٹ کیس ڈگی کھول کر رکھا۔ پھر گاڑی کا دروازہ اَن لاکڈ کر کے کھولا اور بہت مؤدب انداز میں خود پیچھے ہٹ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

''میں آگے نہیں بیٹھوں گی تمہارے ساتھ، سمجھے؟'' وہ جو اس کے انداز سے خار کھا رہی تھی۔ بھڑک اٹھی۔ عبدالہادی کے چہرے سے بے بسی کا اظہار ہوا تھا۔

''ابھی بیٹھ جایئے پلیز! چاہے کتنا ہی ناگوارِ خاطر کیوں نہ ہو۔ چاچو آ رہے ہیں۔ انہیں مطمئن کرنا میرے لیے بہت دشوار ہو جایا کرتا ہے۔'' وہ بے حد پست آواز میں جیسے منت کرتے ہوئے بولا تھا۔

''تمہارا سر درد ہے یہ۔ مجھے بہر حال تمہارے مسائل سے لینا دینا نہیں۔'' وہ جواباً پھنکاری۔

''میں جانتا ہوں لیکن یہ سارے بدلے بعد میں چکا لیجیے گا۔ اب تو ویسے بھی میں آپ کے ہی رحم و کرم پر ہوں گا، پلیز۔'' اس سرگوشیانہ انداز میں پھر لجی ہوا تھا۔ علیزے نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور پیر پٹختی ہوئی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ شاہ صاحب تب تک پہنچ چکے تھے۔ پہلے اسی کی جانب آئے۔ علیزے احتراماً باہر آنے لگی تو انہوں نے مشفقانہ انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے منع کرتے اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ عبدالہادی گھر لاک کرنے میں مصروف تھا۔

''خیریت سے جاؤ بیٹے! اپنا فون رکھ لیا ہوتا۔ عبدالہادی بہت پیارا بچہ ہے۔ شکایت کا موقع تو نہیں دیتا۔ لیکن اگر کوئی مسئلہ ہو تو بیٹے میں باپ کی طرح ہوں آپ کے۔ آپ بلا جھجک کہہ سکتی ہیں۔

مجھے بہت اچھا لگے گا اگر آپ مجھ پر بھروسہ کریں گی تو۔'' ان کے انداز میں بے حد اپنائیت و محبت تھی۔ علیزے کی آنکھیں جانے کس احساس کے تحت نم ہونے لگیں۔

''چاچو......! یہ شخص کتنے سالوں سے ہے آپ کے ساتھ؟ کیا اس نے واقعی اسلام قبول کیا ہوگا؟'' دکھ اور غم کی انوکھی کیفیت کے زیرِ اثر وہ جیسے بے اختیار ہو کر یہ سوال کر گئی تھی۔ شاہ صاحب جیسے چند لمحوں کو چکرا کر رہ گئے۔ مگر اعصاب مضبوط تھے خود کو سنبھال بھی لیا۔

''کون؟ عبدالہادی کی بات کر رہی ہو بیٹے! تین سال ہو گئے اور اس کا ہر لمحہ میرے سامنے گزرا ہے۔ حافظِ قرآن ہے۔ دو مرتبہ حج کر چکا ہے۔ عنقریب پھر عمرے کی سعادت حاصل کرنے والا ہے۔ جہاد کا جذبہ رکھتا ہے۔ وقتِ تہجد اٹھتا ہے۔ مسجد کی امامت کے فرائض سنبھالے ہوئے ہے۔ آپ یہ نہ سمجھنا کہ میں اس کی تعریف کر رہا ہوں۔ بیٹے جب کوئی مشورہ کرے یا سوال پوچھے تو یہ اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ پوری دیانت داری سے راہ نمائی کی جائے۔ آپ سمجھ سکتی ہو نا بیٹے!'' انہوں نے اس کا سر تھپکا، انداز تائیدی نہیں تھا، اصلاحاً تھا۔ وہ یاسیت بھرے انداز میں جیسے ناچار سر کو ہلانے لگی۔

''فی امان اللہ!'' انہوں نے عبدالہادی کو آتے دیکھ کر گفتگو کو سمیٹا۔ پھر عبدالہادی سے ملنے لگے۔ عبدالہادی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر محتاط نظروں سے اس کا جائزہ لیتے گاڑی اسٹارٹ کی۔

''چاچو سے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟'' وہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ چند لمحوں میں اس نے ان میں اتنی تبدیلی محسوس کی تھی کہ یکدم بے حد بجھے ہوئے اور نڈھال لگنے لگے تھے۔ وہ ان کے نزدیک گویا سب کچھ قرار پایا تھا۔ یہ احساس کہ وہ ہنوز ناشاد اور

مضطرب ہے انہیں بہت بری طرح سے مضطرب کر گیا تھا۔ اس کے پوچھنے پر ٹال تو گئے تھے مگر خود کو فی الفور سنبھال لینے پر قادر نہیں تھے۔ عبدالہادی کی اُلجھن پریشانی میں ڈھلی تھی جبھی نا چاہتے ہوئے بھی اس سے سوال کر لیا اور گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا تھا۔

''اُن ہی سے پوچھ لیا ہوتا۔ تمہارے ہی سکھائے پڑھاتے ہیں۔ کچھ اور منہ سے نکال بھی کیسے سکتے ہیں۔ پہلے بڑا افسوس ہوا۔ ایک اچھے خاصے پرہیزگار انسان سے جھوٹ اور غلط بیانی سُن کر، یا پھر تم باقی سب کی طرح انہیں بھی دھوکہ دے رہے ہو۔'' وہ پھنکاری تھی۔ عبدالہادی شل ہو کر رہ گیا۔ اب قطعی دشوار نہیں رہا تھا شاہ صاحب کی اچانک بدل جانے والی کیفیت کو سمجھنا۔ وہ کئی بار شادی کے بعد ڈھکے چھپے انداز میں اس سے علیزے کے رویے کے حوالے سے سوال کر چکے تھے۔ عبدالہادی محض ان کی دل آزاری کے خیال سے ہر بار تسلی سے نواز دیتا۔ انداز ایسا ہوتا مگر پُر اعتماد اور شگفتہ کہ وہ سیدھے سادھے انسان کبھی جان ہی نہ سکے وہ پردہ رکھ رہا ہے۔ بہلا رہا ہے انہیں۔

''اب کیوں زبان گنگ ہو گئی؟ جواب نہیں ہے ناں میری بات کا کوئی۔'' علیزے نے پھر اسے نشانہ بنایا۔ عبدالہادی نے عاجزانہ نظروں سے کچھ دیر اسے دیکھا تھا۔

''میرا خیال ہے میں اپنے حصے کی صفائی بھی دے چکا اور وضاحت بھی۔ آپ کی سوچوں پر بہر حال میرا اختیار نہیں ہے۔ آپ جو چاہیں سمجھیں اور کہیں۔'' اتنے اشتعال کے باوجود اس کا لہجہ دھیما بھی تھا، نرم بھی، کنٹرول میں بھی، علیزے لاجواب بھی ہوئی تھی اور شرمندہ بھی مگر اظہار ضروری نہیں تھا۔

''گاڑی روکو، مجھے پچھلی سیٹ پر جانا ہے۔''

اک نیا حکم جاری ہوا تھا۔ انداز جھلایا ہوا تھا۔ عبدالہادی نے بغیر کسی پس و پیش کے سائیڈ پر کر کے گاڑی کو بریک لگا دی۔ علیزے اپنی چادر سنبھال کر نیچے اُتری تھی اور اس کی بڑھائی پچھلے دروازے کی جانب نظر انداز کر دی۔ انداز زچ کرنے والا تھا۔ اوقات واضح کرنے کو بھی ضروری۔ عبدالہادی بغیر کسی خاص تاثر کے نیچے اُترا۔ خود پچھلا دروازہ اَن لاکڈ کیا تھا۔ وہ بیٹھ گئی تو بند کر کے واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ علیزے جلتی آنکھوں کے ساتھ کھڑکی کی جانب رُخ پھیر گئی۔ یہ جانے بغیر کہ بیک ویو مرر سے اسے دیکھتا ہوا عبدالہادی اس کی بھیگتی آنکھوں کو محسوس کرتا پورے وجود میں بے چینی سرائیت کرتا پا رہا تھا۔

☆......☆......☆

حسبی ربی جل اللہ اللہ ہو اللہ
معافی قلبی غیر اللہ! اللہ ہو اللہ
کیا اونچی شان ہے اللہ ہو اللہ
سب دلوں کی جان ہے اللہ ہو اللہ

وہ عصر کی نماز پڑھ کے وہیں مسجد کے احاطے میں بیٹھ کر حسب سابق تسبیحات میں مشغول ہو گیا تھا۔ معاً لاؤڈ اسپیکر آن ہوا اور کوئی نوعمر لڑکا اپنی خوش الحان آواز میں توصیفِ ربی میں مشغول ہوا تھا۔ عبدالغنی کی ساری توجہ اسی جانب ہو گئی۔ ہونٹ اس کے ہم آواز ہو کر خود بھی اس ثناء میں مشغول ہوئے تھے۔ قاری صاحب سیڑھیاں اُتر کر آئے اور اس کے پاس بیٹھ گئے۔ عبدالغنی خیر مقدمی مسکراہٹ سے انہیں نواز چکا تھا۔ ساری توجہ ابھی بھی جیسے اُدھر تھی۔

نورِ ارض وسما اللہ ہو اللہ
خالقِ کون ومکاں اللہ ہو اللہ
تو قرارِ جسم وجاں اللہ ہو اللہ

تجھ سے سارے کام ہیں اللہ ہو اللہ

تجھ سے صبح و شام ہیں اللہ ہو اللہ

حمد مکمل ہوئی۔ لاؤڈ اسپیکر خاموش ہو گیا۔ عبدالغنی نے قاری صاحب کو دیکھا اور کھل کر مسکرایا تھا۔

''خیریت ہے ناں قاری صاحب! آپ پریشان لگتے ہیں۔ اور کچھ کہنا بھی چاہتے ہیں غالباً'' وہ خاصا حیران ہو کر گویا ہوا تھا۔ قاری صاحب نے سر اثبات میں ہلایا۔ پھر آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے دلگیری سے گویا ہوئے تھے۔

''اللہ نے اولاد کی نعمت نہیں دی تھی۔ ساری زندگی یہاں گزار دی۔ خوش تھے۔ کوئی شکوہ ہی نہیں تھا۔ مگر اس بڑھاپے میں رب تعالیٰ نے بہت اہم ذمہ داری سونپ دی ہے۔ بہت دنوں سے بہت پریشان تھا۔ رب سے مدد مانگتا رہا ہوں۔ آج صبح سے دل کر رہا تھا آپ کے پاس جاؤں، مدد طلب کروں۔ میرا یقین ہے یہ رہنمائی بھی رب کی رہنمائی ہے۔ آپ کا دھیان دلانا، آپ کے پاس بھیجنا۔''

وہ بے حد انکساری مگر یقین سے کہہ رہے تھے۔ عبدالغنی نے ان کا ہاتھ سہلایا تھا۔ گویا تسلی دینا چاہی۔

''بیشک مدد کرنے والی ذات تو رب تعالیٰ سبحانہ کی ہی ہے۔ اللہ پاک نے انسان کو انسان کا وسیلہ بنایا ہے۔ مجھے بہت خوشی اور روحانی تسکین حاصل ہوگی، آپ یقین کریں اگر آپ کے کام آسکا۔''

''مجھے بھی یقین ہے بیٹے! آپ ہی میرے کام آؤ گے۔ آپ ہی اس کام کے لیے موزوں ہیں، یہ بات تو میں بھی جان گیا ہوں۔ جو فہم و فراست، جو عدل و انصاف اس کام کا اہم جزو ہے وہ ہر کسی کو ودیعت نہیں ہوتا ہے۔'' قاری صاحب کا لہجہ پُر یقین تھا۔ عبدالغنی قدرے چونکا۔ البتہ چہرے پر انکساری کے تاثرات مزید گہرے ہو گئے تھے۔

''اللہ کرے آپ کا یقین سلامت رہے۔ اللہ مجھے توفیق سے نوازے۔ آپ حکم کیجیے۔'' وہ جیسے ہمہ تن گوش ہوا تھا۔

''کچھ دن قبل میں تہجد کی اذان کے لیے مسجد میں آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مسجد کے احاطے میں ایک نوجوان بچی موجود تھی......'' ساری بات کھول کر بتاتے اُن کا لہجہ دھیما ہوتا چلا گیا تھا اور عبدالغنی کی سنجیدگی اور تدبر میں مزید اضافہ۔

''وہ بچی بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہے بیٹے! ابھی آج صبح کی ہی بات ہے۔ اس نے اپنی ماں کو کچھ آدمیوں کے ساتھ گاڑی میں یہاں گلی میں بھی دیکھا۔ خود سوچو اگر وہ اس حد تک اس کا پیچھا لے سکتے ہیں تو کب تک اس تک نہیں پہنچیں گے۔ اس گناہ کی دلدل سے محفوظ رہنے کی خاطر ہی وہ بچی فوری طور پر عقد کرنا چاہتی ہے۔ اس کی خواہش بس اتنی ہے کہ اس کی سچائی مخفی نہ رکھی جائے۔ اس شخص سے کہ وہ دھوکہ دینا نہیں چاہتی۔ باقی تحفظ کے علاوہ اس کی اور کوئی خواہش اور تقاضا نہیں ہے۔'' اپنی بات مکمل کر کے وہ بڑی آس مندانہ نظروں سے عبدالغنی کو دیکھنے لگے تھے۔ جوان کا مقصد اور پھر خواہش کو سمجھتا ہوا اچھا خاصا کنفیوژ ہو چکا تھا۔ پہلے تو اسے سمجھ نہیں آئی انکار کیسے کر دے۔ وہ اتنی آس لے کر آئے تھے مگر وہ بہر حال مجبور تھا۔ لاریب کی انوالومنٹ جتنی تھی اس کے ساتھ اور جتنی وہ جذباتی تھی۔ اس مجبوری یا مصلحت کو سمجھے بغیر ری ایکشن دے سکتی تھی اور بہت شدید بھی۔

''آپ کی بات بجا ہے قاری صاحب مگر میں تو آپ کو پتا ہے شادی......''

''میں سب کچھ جانتا ہوں بیٹے! یہ بھی کہ آپ

ماشاءاللہ سے شادی شدہ ہو۔ بیٹے کے باپ ہو۔ مگر یہ دھیان میں رکھیں کہ یہ کام آپ ثواب کی نیت سے کروگے۔ خالصتاً اللہ کی رضا کی خاطر...... کسی مجبور اور بے سہارا عورت کو سہارا دینا، اس کا پردہ سلامت رکھنا بہت زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے قاری صاحب مگر میری زوجہ بہت دل برداشتہ ہوں گی اور......''

''میں سب کچھ سمجھتا ہوں عبدالغنی بیٹے! ہر بات دھیان میں تھی پھر بھی آپ کے پاس آیا ہوں تو وجہ یہی ہے۔ یہ بوجھ صرف آپ ہی اٹھا سکتے تھے۔ میں نے کہا ناں یہ اعلیٰ ظرفی، یہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے والے کا ہی کام ہوسکتا ہے۔ اور ہاں بیٹے! جب کوئی کام خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے اس میں اللہ ہی مددگار بھی ہوتا ہے۔ آپ اللہ کا نام لے کر بسم اللہ تو کریں۔''

قاری صاحب نے جیسے اس کے لیے ہر راہ مسدود کردی تھی۔ عبدالغنی ساکن و سامت بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی نگاہ میں لاریب کا ہنستا مسکراتا چہرہ اُتر آیا۔ اس چہرے سے ہر لحہ مسکان غائب ہورہی تھی۔ اس کی جگہ رنج والم غیر یقینی اور گہرے شاک نے لے لی۔

''بیٹے اللہ کے نام پر جب سوال ہو تو یہ شش و پنج مناسب بات نہیں لگتی۔ کم از کم آپ کو تو بالکل نہیں۔'' قاری صاحب نے خاصے دکھ میں مبتلا ہو کر کہا تھا۔ عبدالغنی کی شرمندگی کا انت شمار نہیں رہا۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ وہ اللہ کی بجائے لاریب کے متعلق سوچ رہا تھا۔ بلاشبہ جب کوئی کام رب کے لیے کیا جاتا ہے تو اللہ ہی مددگار بھی ہوتا ہے۔

''ٹھیک ہے قاری صاحب! مجھے اعتراض نہیں ہے۔ اور میں دُعا کرتا ہوں جس کام کے لیے اللہ نے میرا انتخاب کیا ہے اس کو احسن طریقے سے نبھانے کی بھی رب تعالیٰ مجھے ہمت و توفیق سے نوازے آمین۔''

فضا میں مغرب کی اذان کی مقدس پکار اُبھری تھی۔ قاری صاحب نے جوشِ مسرت سے بے قابو ہوتے اٹھ کر عبدالغنی کے اونچے پورے توانا سراپے کو اپنے بازوؤں میں بھرنے کی کوشش کی تھی۔

☆......☆......☆

شاید یہ ساری کا احساس تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر آنے کے کچھ دیر بعد ہی وہ لیٹ گئی تھی۔ آنکھ کب لگی احساس ہی نہ ہوسکا۔ اس نے ذرا سا زاویہ بدلا تو یاد آیا گاڑی کی سیٹ پر پڑی ہے۔ ٹانگیں سکیڑ کر پیٹ سے لگائی ہوئی تھیں۔ اوپر گرم مردانہ شال تھی۔ یہ عبدالہادی کی تھی۔ اس کے وجود کی مہک میں بسی ہوئی۔ اس کی غفلت کے دوران ہی یقیناً اسے اوڑھائی ہوگی عبدالہادی نے۔ اسے عجیب سا احساس گھیرنے لگا تھا جبھی ایک دم براؤن شال جھٹک کر اٹھ گئی۔ اس کا دوپٹہ اس کی چادر اس کے گرد یونہی لپٹی ہوئی تھی۔ اسے قدرے قرار آیا۔ جو اگلے لمحے پھر جاتا رہا تھا۔ گاڑی موٹر وے کے کسی سنسان علاقے میں رُکی ہوئی تھی۔ سورج مکمل طور پر ڈوب چکا تھا۔ اور عبدالہادی گاڑی میں موجود نہیں تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ چند سکینڈ میں کتنے ہی خدشوں اور واہموں نے اسے آن گھیرا تھا۔ جبھی رنگ بالکل فق ہوگیا۔

''کیا وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے؟'' سب سے پختہ خیال یہی تھا جس نے روہانسا کرکے رکھ دیا۔ وہ سراسیمہ ہوکر باہر نکلی اور جیسے پتھر کی بن گئی تھی۔ سڑک سے خاصا ہٹ کر نشیب کی جانب قبلہ رُخ جائے نماز بچھائے وہ نماز میں مشغول نظر آیا تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر...... رب کی بارگاہ میں حاضر تھا۔ علیزے کا یہ سکتہ ٹوٹا تو عجیب سی شرمندگی

وجود کا احاطہ کرنے لگی۔ ذہن سنسنا رہا تھا، جیسے اسے جانے کیوں کچھ نہ یاد آیا تھا۔ سر چکرانے لگا۔ حقیقت کیا تھی؟ یہی...... اس کا دل گھبرانے سا لگا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے واپس گاڑی میں آ بیٹھی۔ پھر لیٹ گئی۔ جانے کتنی گھڑیاں بیتی تھیں۔ تب جا کے عبدالہادی واپس گاڑی میں آیا۔

''یہ تو جانتا ہوگا میں سو رہی ہوں۔ پھر اسے دکھاوا کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا؟ یا یہ اتنا شاطر ہے کہ سوچا ہوگا......''

وہ مزید کچھ نہیں سوچ سکی۔ سوچنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ اس کا دماغ جیسے ماؤف ہو رہا تھا۔ عبدالہادی اپنے دھیان میں تھا۔ اس نے جائے نماز سائیڈ پر رکھ دی تھی اور چائے کا صاف مگ اٹھا کر ٹی پاٹ سے اپنے لیے چائے نکال کر سپ لیتے ہوئے ساتھ میں شاید بسکٹ وغیرہ کھانے میں مشغول ہو گیا تھا۔ اس کام سے فراغت کے بعد اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ علیزے آنکھوں پر بازو رکھے اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ اور محسوس کر رہی تھی۔ جانے کس احساس کے تحت اس کی آنکھیں بھیگیں اور نمی کنپٹیوں سے ہوتی بالوں میں جذب ہونے لگی۔ وہ دکھ سے شل ہو رہی تھی۔ دکھ اس بات کا تھا کہ اس کی حقیقت اگر یہی تھی۔ یعنی وہ واقعی مسلمان ہو چکا تھا تو وہی تھا اس کے لیے اللہ کا انتخاب؟ اس کے دل میں پھر بھی گنجائش تھی نہ محبت۔ وہ تو اس سے آج بھی نفرت کرتی تھی۔ نفرت کے احساس کو نکال بھی نہ سکی تھی۔ بے بسی کا یہی شدید احساس اسے رُلا رہا تھا۔

''اللہ تو وہ ہستی ہے ناں۔ جس کے سامنے، دم مارنے کی اجازت نہیں۔ اللہ تو وہ ہستی ہے کہ جس سے آپ کا کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔ اسے یہی دکھ رُلا رہا تھا کہ عبدالہادی کے متعلق اس کی نفرت بھی عیاں تھی اس پر۔''

وہ سوچتی رہی روتی رہی۔ یہاں تک کہ عبدالہادی نے پہلے کے انداز میں گاڑی روک کر پھر نماز ادا کی تھی۔ اس کا انہاک، اس کی پابندی قابلِ ستائش تھی۔ مگر وہ داد دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ معاً گاڑی کی خاموش فضا اس کی بھاری بھرکم خوش الحان آواز سے گونجنے لگی۔

میرا درد نغمہ بے صدا
میری ذات ذرہ بے نشاں
میرے درد کو جو زباں ملے
مجھے اپنا نام ونشاں ملے
مجھے رازِ نظم وجہاں ملے
جو مجھے یہ رازِ نہاں ملے
میری خامشی کو بیاں ملے
مجھے کائنات کی سروری
مجھے دولتِ دوجہاں ملے

رات کا وقت تھا۔ سڑکیں تقریباً خالی، وہ اسپیڈ بڑھا چکا تھا۔ علیزے کچھ دیر تک یونہی لیٹی رہی۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ عبدالہادی کی نگاہ شیشے سے پڑی تھی اس پر۔ چہرے پر اسے جاگتے پاکر بہت نرم مسکان بکھیری۔

''بہت سوئی ہیں آپ، میں نے جان کر نہیں جگایا۔ اب کچھ کھالیں۔'' وہ آئینے میں ہی اس پر نگاہ رکھے دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ علیزے کچھ نہیں بولی۔ اس کا ذہن ابھی بھی غبار میں ڈوبا ہوا تھا جیسے۔

''ٹی پاٹ میں چائے بھی ہے اور ٹفن کیریئر میں کھانا بھی، یہ لیجیے، منہ دھو کر فریش ہو جائیں۔'' وہ گاڑی روک چکا تھا۔ کھانے کے لوازمات کے برتن خود اس کے پاس رکھے۔ ساتھ پانی کی بوتل تھی۔

''کیا یہ سفر رات بھر جاری رہے گا؟'' وہ بالآخر بولی تھی۔ آواز بوجھل سی تھی۔ عبدالہادی واپس

ڈرائیونگ سیٹ پر چلا گیا تھا۔ پلٹ کر اسے دیکھا۔
''نہیں، مزید کچھ ڈرائیو کے بعد ہوٹل میں قیام کریں گے۔ آپ تھک گئی ہیں غالباً۔'' وہ ایک بار پھر چپ ہوگئی اور بوتل اٹھائے گاڑی سے باہر آگئی۔ پہلے کلی کی تھی پھر اوک میں پانی بھر بھر کے منہ پر، خاص کر آنکھوں پر چھپاکے مارے۔ اک ٹھنڈک کا احساس اندر اُترا تھا۔ وہ گم صم سی واپس آکر بیٹھ گئی۔ عبدالہادی نے اس کے انداز کی تبدیلی کو قدرے حیرانی سے دیکھا تھا۔
''طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟'' اُس کے لہجے میں تشویش اُتر رہی تھی۔ علیزے نے نگاہ بھر کے اسے دیکھا تھا مگر جواب نہیں دیا۔
''علیزے......! آپ مجھے پریشان کر رہی ہیں۔'' بے اختیاری کی کیفیت میں وہ اسے چھو کر غالباً بخار کا اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ یکدم راستے سے ہی ہاتھ جھجک کر پیچھے ہٹا لیا۔ اس کے انداز میں اچھی خاصی بے بسی اُتر آئی تھی۔ علیزے جھنجلا گئی۔
''میں خود پریشان ہوں۔ بہتر ہے تم مجھے مزید پریشان مت کرو۔'' اس کے لہجے میں رکھائی سی اُتر آئی۔ عبدالہادی سرد آہ بھرتا ہونٹ بھینچ کر رہ گیا اور کچھ کہے بغیر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

☆......☆......☆

لاریب نے عبدالعلی کو سلا دیا تھا۔ اور خود کچن کا کام سمیٹ کر باہر صحن میں آگئی۔ آج عبدالغنی کو معمول سے زیادہ دیر ہوگئی تھی۔ کھانا وہ تب ہی دونوں اکٹھے کھاتے جب عبدالغنی عشاء کی نماز پڑھ کر آتا تھا۔ وہ اس وقت تک خود بھی نماز پڑھ لیا کرتی تھی مگر آج نہیں پڑھی تھی۔ اُسے عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ دھیان کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔ ایسے میں وہ نماز نہیں پڑھ سکتی تھی۔ نماز تو مکمل یکسوئی اور توجہ سے پڑھنی چاہیے۔ یہی سوچا تھا عبدالغنی آجائے گا تو پڑھ لے گی۔ دو سے تین بار وہ بیرونی دروازے تک بھی گئی تھی اور دروازہ کھول کر باہر گلی میں بھی جھانکا۔ فون کرنے کا فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ عبدالغنی مسجد یا تو فون لے کر نہیں جاتا تھا۔ اگر پاس ہوتا بھی تو سائلینٹ پر رہا کرتا تھا۔ اس کے انتظار کا پیمانہ جس وقت لبریز ہوا اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔
لاریب لپک کر آئی۔ وہ تو اس کی آہٹیں بھی پہچانتی تھی۔ جبھی ہمیشہ پوچھے بغیر دروازہ بے دھڑک ہو کر کھولا کرتی۔ عبدالغنی کے ٹوکنے پر بڑے پُراعتماد انداز میں مسکرا دیا کرتی تھی۔
''مجھے کبھی آپ کے متعلق دھوکہ نہیں ہوسکتا، بے فکر رہیں۔''
''السلام وعلیکم! اتنی دیر کر دی آپ نے آج۔ اگر کچھ دیر اور نہ آتے ناں تو میں خود پہنچ جاتی لینے۔'' دروازہ کھولتے ہی وہ نان اسٹاپ شروع ہوئی تھی۔ عبدالغنی محض کھنکارا اور اسی سنجیدگی سے اس کے سلام کا جواب دیا جو اس پل اس کے چہرے، اس کے پورے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اور اندر داخل ہونے کے بعد قدرے سائیڈ پر ہوگیا۔
''آجایئے آپ۔'' وہ دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ لاریب کی حیرت دوچند ہوگئی تھی۔ برقع پوش لڑکی کو جھجکتے سہمے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوتے پا کر۔
''یہ کون ہے؟'' لاریب نے اچنبھے میں گھر کر یہ سوال کیا تھا۔
عبدالغنی نے پہلے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھائی پھر لاریب کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر استعجاب تھا۔ وہ سراپا سوال، سراپا حیرت لگتی تھی۔
''لاریب! انہیں اندر لے جاؤ۔ پھر میں تم سے بات کرتا ہوں۔''

''لیکن......'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ عبدالغنی نے نرمی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

'' پلیز! جو کہا ہے وہ تو کرو پہلے۔'' اُس کا پُر رسان لہجہ نرم بھی تھا، پُر اسرار بھی، لاریب کا دل عجیب سے احساس سے لبریز ہو گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ اس لڑکی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی بیٹھک میں لے گئی تھی۔

'' آپ یہاں اطمینان سے بیٹھیے اور یہ برقع اُتار دیں تو بہتر ہے۔ کھانا میں گرم کرتی ہوں۔ آپ تب تک چاہیں تو فریش ہو جائیے۔ یہ واش روم ہے۔''

اُس نے ہاتھ سے اٹیچ باتھ کی جانب اشارہ کیا۔ لڑکی نے محض سر ہلایا تھا۔ وہ سکڑ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ دھان پان سی، بے حد نازک مگر بے حد گہرے سانولے رنگ کی مالک لڑکی پہلی نگاہ میں کوئی تاثر نہیں چھوڑتی تھی۔ اس پر اس کی حد سے بڑھی ہوئی گھبراہٹ و کنفیوژن، وہ باقاعدہ کانپ رہی تھی۔ لاریب نے گہرا سانس بھرا اور باہر آ گئی۔ عبدالغنی اسے کچن میں ملا تھا۔ سالن اور چاول گرم ہونے کو چولہے پر چڑھا دیے تھے۔ خود فریج سے سلاد کی سجی سجائی پلیٹ نکال رہا تھا۔

'' یہ ہے کون لڑکی؟'' وہ جاتے ہی اس کے سر پر چڑھی۔

'' یار کھانا تو کھا لو سکون سے۔'' عبدالغنی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ صاف لگتا تھا یہ مسکراہٹ جبری ہے۔ کھینچ تان کر لائی ہوئی۔

'' میں تب ہی سکون سے کھا سکوں گی اگر مجھے اس لڑکی کا بائیو ڈیٹا مل جائے گا۔ عبدالغنی اسے آپ کے ساتھ آتے پا کر میں ہضم نہیں کر رہی ہوں گویا۔ مجھے لگ رہا ہے تفکر اور گھبراہٹ سے میرا دل بند ہو جائے گا۔ بتا دیں ورنہ پتا نہیں۔''

'' لاریب...... لاریب...... کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ اس طرح پریشان مت ہو۔''

'' تو پھر بتائیں مجھے۔ اگر مجھے پریشان نہیں دیکھنا چاہتے۔'' وہ بے ساختہ ہلکے سے چیخی تھی۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ عبدالغنی مضطرب ہو کر رہ گیا۔ گو کہ وہ ہزار طریقے سوچ چکا تھا اب تک اس سے بات کرنے، منانے، قائل کرنے کے، مگر اب جیسے ذہن بالکل بلینک تھا۔

'' یہاں آؤ، بیٹھو، بات سنو میری۔'' عبدالغنی نے اسے پکڑ کر اسٹول پر بٹھا دیا۔ وہ بیٹھ تو گئی مگر عبدالغنی کو بے چین نظروں سے دیکھتی تھی۔

'' لاریب اگر کوئی دریا میں ڈوب رہا ہو بالفرض اور آپ کنارے پر کھڑے ہوں۔ تیرنا بھی آتا ہو آپ کو۔ اللہ نے طاقت بھی دی ہو کسی کی مدد کی تو کیا کسی کی مشکل آسان کرنی چاہیے؟ تمہارا کیا خیال ہے؟'' وہ سوالیہ ہوا تھا۔ لاریب نے متحیر، اُلجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

'' ظاہری بات ہے مدد کر دینی چاہیے۔ یہ تو ثواب کا کام ہے۔'' وہ بے اختیار کہہ گئی تھی۔

'' تو بس سمجھ لو، مجھ سے بھی اللہ نے ایسا ہی کام لیا ہے۔ مجھے مدد کرنی پڑ گئی ہے کسی کی۔'' عبدالغنی کے جواب پر لاریب ٹھٹک سی گئی۔

'' کیا مطلب؟ آپ نے اس لڑکی کو ڈوبنے سے بچایا ہے؟'' وہ ششدر ہو کر پوچھ رہی تھی۔ عبدالغنی نے رسان سے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ پھر کسی قدر تدبر سے بولا تھا۔

'' لاریب ڈوبنا صرف پانی میں نہیں ہوتا۔ یہ دریا پانی کا ہی نہیں ہوسکتا۔ ذلت کا بھی ہوسکتا ہے گمراہی اور گناہ کا بھی ہوسکتا ہے۔ مدد کی ضرورت وہاں بھی تو پڑ جایا کرتی ہے۔'' وہ اس کا گال تھپک رہا تھا۔ لاریب نے ایک دم لرزتے ہاتھ میں اس کا ہاتھ

دبوچ لیا۔ اس کی رنگت متغیر ہونے لگی تھی۔
''ٹھیک سے بتائیں عبدالغنی! کیا کر بیٹھے ہیں آپ؟ یہ مدد کس نوعیت کی ہے؟ میرا دل آخراتنا گھبرا کیوں رہا ہے؟'' وہ اس کی کلائی جھنجوڑتے ہوئے وحشت سے پُر آواز میں بولی۔
''لاریب...... کم ڈاؤن، دیکھو میں کہہ رہا ہوں ناں کچھ کام ذاتی مفاد اور خوشی کے لیے نہیں کیے جاتے۔ اللہ کی خاطر کر لیے جاتے ہیں۔ یہ کام بھی......''
''نکاح کر لیا ہے اس سے......؟'' اس کے لہجے میں سوال سے زیادہ ہراس کا غلبہ تھا۔
عبدالغنی نظریں چرا گیا۔ نہ اقرار نہ انکار۔ اس کے باوجود جیسے لاریب سمجھ گئی، جان گئی۔ اور لمحوں میں شق ہوگئی۔ شل ہوگئی، ختم ہوگئی۔ اسے لگا تھا اس کا سارا جسم مٹی ہوگیا ہے۔ ذرا سی بھی جنبش کی تو ڈھے جائے گی۔ عبدالغنی نے اس کی جامع، مہیب چپ، پر ہی حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔ اور دھک سے رہ گیا۔ ایسی ویران آنکھیں، غم میں ڈوبا چہرہ، سراسیمہ انداز...... وہ متفکر ہوتا بے اختیار اسے پکار گیا۔
''لاریب!'' عبدالغنی نے اسے تھاما تھا۔ جو سفید پڑتے چہرے کے ساتھ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے پوری کھلی آنکھوں میں دہشت کا عفریت لیے سکتہ زدہ نظر آتی تھی۔ اسے لگا وہ ابھی گر جائے گی۔ اور وہ واقعی گر گئی۔ یوں جیسے ریت کی دیوار ہو۔ ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی عبدالغنی اس پر غشی طاری ہوتے پا کر بوکھلا کر اسے پکارنے لگا تھا۔ مگر وہ ساکن تھی۔ بے جان محسوس ہوئی۔ عبدالغنی نے گھبرا کر اسے بازوؤں میں بھر لیا اور اسی طرح بازوؤں کے حلقے میں سنبھالے اندر کمرے میں لایا تو اضطراب اس کے ہر احساس سے چھلک رہا تھا۔ اسے بستر پر لٹاتے وہ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے اسے مسلسل پکار رہا تھا۔ ''لاریب......! آنکھیں کھولو۔''
وہ اس پر جھکا ہوا تھا۔ لاریب نے جھر جھرا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ کچھ دیر خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر ایکدم تڑپ اٹھنے کے انداز میں اس کے گلے میں بازو ڈال کر اس سے لپٹ گئی تھی۔
''عبدالغنی......!'' وہ پھوٹ پھوٹ کر بلک بلک کر رو پڑی۔ اس کا سارا وجود زوردار جھٹکوں کی زد پر تھا۔ عبدالغنی نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچ کر سینے سے لگا لیا۔
''آپ مذاق کر رہے تھے ناں......؟ کہہ دیں آپ نے مذاق کیا تھا۔ عبدالغنی میں مر جاؤں گی۔ آپ صرف میرے ہیں۔ کہہ دیں۔'' وہ تڑپ کر کہہ رہی تھی۔ یقین چاہ رہی تھی۔ عبدالغنی خاموش تھا۔ اسے تھپکتا رہا۔
''میں تمہارا ہی ہوں لاریب! تمہارے پاس ہوں۔ کیوں گھبرا رہی ہو۔'' اس نے ہونٹوں سے اس کے نم گال چھوئے۔ لاریب کے وحشی دل کو ذرا سا قرار آیا تھا۔ اس نے ذرا سا ہٹ کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کے ہاتھ بالکل سرد تھے اور لرز رہے تھے۔
''غلطی ہو جاتی ہے انسان سے۔ مجھے بھی برا نہیں لگے گا۔ آپ بس ابھی اسی وقت اسے طلاق دیں۔ گھر سے نکالیں اسے۔'' اس کے چہرے کے خدوخال میں اک جنونی سی کیفیت تھی۔ ایک وحشت ایک انجانا سا خوف۔ عبدالغنی کو البتہ دھچکا لگا تھا۔ وہ بے اختیار اس سے الگ ہوا۔
''لاریب!'' اس کی آواز میں غیر یقینی بھی تھی اور تادیب اور سرزنش بھی۔ لاریب کو البتہ اس کے اس انداز نے انوکھی اذیت سے دوچار کر ڈالا۔
''پلیز لاریب! وہ بات مت کرو جو میں کر نہ سکوں۔'' نگاہ پھیر کر وہ دکھ بھرے انداز میں بولا تھا۔

لاریب کے اعصاب کو جیسے شاک لگا تھا۔ وہ آن کی آن میں پیلی پڑنے لگی۔

"کیوں نہیں کر سکتے۔ آپ صرف مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مجھ سے......" وہ بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگی۔ "میں تو آپ کا کسی کو دیکھنا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تو......" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر آنسوؤں سے ڈبڈباتی نظروں سے عبدالغنی کا بازو پھر جکڑ لیا۔

"آپ میری بات نہیں مانیں گے عبدالغنی؟" اس نے ایسے سوال کیا تھا گویا انکار ہوا تو جان نکل جائے گی۔ عبدالغنی نے اسے نرمی سے تھام لیا۔

"لاریب...... تم ریلیکس ہو جاؤ۔ پلیز خود کو سنبھالو۔" وہ عجیب بے بسی کے عالم میں تھا۔

"آپ اسے نہیں چھوڑیں گے عبدالغنی؟" اس کا لہجہ ہیجانی سا ہو رہا تھا۔ عبدالغنی نے دیکھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ رنگت پہلے سے بھی زرد اور جسم خطرناک حد تک سرد ہو رہا تھا۔ لہجے کی بے قراری حد سے سوا تھی۔ عبدالغنی نے ہونٹ بھینچے۔ اس کے سارے الفاظ جیسے کھو گئے تھے۔ آنکھ کے گوشوں میں بے بسی کی نمی تھی۔

"ضد مت کرو لاریب! میں جانتا ہوں بہت ہرٹ کر چکا ہوں تمہیں۔ بہت دکھی ہو تم۔" وہ افسردگی سے دکھ سے کہہ رہا تھا۔ لاریب بغیر کچھ کہے گھٹ گھٹ کر روئے گئی۔ عبدالغنی نے اسے ساتھ لگا لیا۔ پھر اس کے سر پر بوسہ دیا تھا۔

"پلیز......! مت رو۔ ورنہ یہ آنسو میرے لیے سمندر بن جائیں گے۔ تم صرف مجھے شیئر کر رہی ہو۔ وہ سب کچھ کھو چکی ہے۔ بالکل تہی داماں ہے۔ میں نے دیکھی ہیں وہ لرزشیں...... جو آنے والی پریشانیوں نے اس کے اندر بھر دی ہیں۔ سسکیاں اس کے اندر سے پھوٹتی ہیں۔"

لاریب کو جیسے شاک لگا تھا۔ عبدالغنی اور محض چند گھنٹوں میں اتنا بیگانہ...... وہ اسے صدیوں کے فاصلے پر لگا تھا کسی غیر عورت کی فیور میں بولتا ہوا۔ اس سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی نقصان ہو ہی نہ سکتا تھا جیسے۔ وہ تو بیٹھے بٹھائے لٹ گئی تھی۔

"وہ...... جھوٹ بول رہی تھی۔ آپ نے یقین کر لیا؟" اس کا یہ سکتہ ٹوٹا تو وہ دھاڑی تھی جیسے۔ عبدالغنی خاموش رہا۔ لاریب کو یہ خاموشی اسی قدر شدت سے توڑ رہی تھی۔ اس کے اندر سرسراتی وحشت جیسے دیوانگی میں بدلنے لگی۔

"اسے طلاق دیں عبدالغنی! ابھی اسی وقت۔" وہ بولی نہیں چیخی تھی۔ اس کی آواز میں کراہیں بھی تھیں، منت بھی، اضطراب بھی تھا، اندیشے بھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ گردن کی رگیں پھولی ہوئی، لرزتی پلکیں، کپکپاتے ہونٹ، ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی ہچکیاں اس نے عبدالغنی کا کالر اپنی مٹھی میں جکڑا ہوا تھا۔

"آؤ اندر چلیں۔" عبدالغنی نے اسے تھامنا چاہا۔ وہ تڑپ کر فاصلے پر ہو گئی۔ اس نے صدمے سے پتھرائی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

"تو آپ اسے نہیں چھوڑیں گے؟"

"میں نے یہ کام اس لیے نہیں کیا تھا لاریب! تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟" اب کے وہ ذرا سا جھنجلا گیا تھا۔ لاریب نے اس کی بات سنی تھی تو اس کے جسم کو جھٹکا سا لگا تھا۔ اور جیسے اب تک کا ضبط پھر حد سے تجاوز کر گیا کہ ہر لمحہ اس کی حالت پھر بگڑتی چلی گئی تھی۔ جبڑے بھینچ کر نچلا ہونٹ دانتوں تلے یوں دب گیا تھا کہ اس سے خون پھوٹ پڑا۔ ناخن ہتھیلیوں میں گڑ گئے تھے۔ عبدالغنی نے اسے دیکھا تو جیسے سب کچھ بھول کر اس کی پڑ گئی تھی۔ وہ سراسیمہ سا اسے تھام کر پھر بستر پر لٹانے لگا تھا تو

اس کے اپنے حواس بکھر رہے تھے۔ لاریب کی سانسیں دھونکنی کی مانند چل رہی تھیں۔ عبدالغنی جیسے دکھ سے شل ہوتا اس کی سختی سے بھنچی ہوئی مٹھیوں کو کھولتا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بے دم انداز میں پکارتا رہا تھا۔

''خود کو سنبھالو لاریب! ایسا مت کرو میرے ساتھ پلیز۔''

لاریب ناہموار سانسیں لیتی کچھ سمجھی، کچھ نہ سمجھی سے اسے تکتی رہی۔ پھر بے چین آنکھوں میں ذرا سی نمی چمکی تھی۔ اور اگلے پل وہ بلک بلک کر رو دی تھی۔

''مجھے گلے سے لگالیں عبدالغنی! مجھ سے قریب آجائیں۔ آپ نے بہت فاصلے پر کرلیا خود کو......''

وہ ہچکیاں بھرتے کہہ رہی تھی۔ عبدالغنی نے اسے خود میں بھینچ لیا۔

''میں تمہارے پاس ہوں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کچھ مت سوچو ماسوائے اس کے۔'' عبدالغنی نے دھیرے سے کہا۔ لاریب کچھ نہیں بولی۔ یوں جیسے بہت تھک گئی ہو۔ یوں جیسے بہت ڈر گئی ہو کہ کچھ کہا تو عبدالغنی دور نہ ہو جائے۔ وہ اسے دور نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

اُن کا سفر بالآخر ایک ریسٹ ہاؤس پر آکر عارضی طور پر تمام ہوا تھا۔ عبدالہادی کے ہمراہ وہ بہت خاموشی سے ریسپشن پر آئی تھی۔ ساری بات چیت عبدالہادی نے ہی کی اور معاملہ طے ہونے پر رومز کی چابیاں لے کر اس کے ہمراہ آگے بڑھ آیا تھا۔ دوسری منزل پر چوتھا اور تیسرا کمرہ ان کو ملا تھا۔

''یہ لیجیے چابی! کچھ دیر میں کھانا آجائے گا۔ اور کچھ چاہیے ہوگا تو آپ آرڈر کرسکتی ہیں۔'' عبدالہادی نے کی رِنگ بڑھائی تھی۔ جسے وہ پکڑے بغیر تامل بھرے انداز میں گھورتی رہی۔

''اور تم...... میرا مطلب ہے کہ......؟'' وہ جھجک کر تھم گئی۔ عبدالہادی نے اس کے کشمیری سیب جیسے رخساروں پر لرزتی پلکوں کے سائے کو دلچسپی سے دیکھا تھا اور مسکراہٹ دبائی۔

''میں اس ساتھ والے کمرے میں ہوں گا، ڈونٹ وری۔''

''میں یہی کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے ان ہوٹلز والوں پر ہرگز اتنا ٹرسٹ نہیں ہے۔'' وہ نظریں چراتی انگلیاں چٹخاتی ہوئی بولی تھی۔ عبدالہادی نے بے ساختہ چونک کر بلکہ ٹھٹک کر اسے بغور دیکھا تھا۔

''آپ تو مجھ پر بھی ٹرسٹ نہیں کرتیں۔ پھر اب کیا حل ہو اس مسئلے کا؟'' اس کا لہجہ قدرے شوخ اور بہکا بہکا سا لگا تھا علیزے کو۔ تبھی بہت زیادہ چڑ گئی تھی۔ کچھ کہے بغیر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر ایک دھماکے سے بند کردیا۔ چادر اُتار کر پھینکی اور صوفے پر گر کر بے تحاشا رونے لگی۔

''بہت غلط بات۔ پرہیز گار لوگوں کے منہ سے تو گالیاں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ یعنی ڈبل گناہ غیبت کا بھی اور گالی کا بھی۔ کچھ تو ٹائم لگنا تھا چابی واپس کرنے تک۔ غریب آدمی ہوں۔ جیب پر بھاری پڑ سکتا تھا یہ اصراف۔'' وہ جانے کب آگیا تھا۔ باقاعدہ کھنکھار کر بولا تھا۔ علیزے شاکڈ ہو کر رہ گئی۔ پھر ایک جھٹکے سے گھٹنوں سے سر اٹھا کر اسے قہر بھری نظروں سے دیکھا۔ عبدالہادی متوجہ ہی تھا۔ بادامی آنکھوں میں شفاف سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ بھیگ کر سنہری آنکھوں کا فسوں مزید ستم ڈھانے کے درپے ہو گیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی گھائل تھا۔ سیدھا دل پر وار ہوا تھا۔ اگر نظریں نہ چرا لیتا تو شاید خود پر کنٹرول بھی کھو دیتا۔

''احسان جتلانے کی ضرورت نہیں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' اس کی کیفیت سے بے خبر وہ

ضبط کھو کر دھاڑی۔
''آپ ..... اتنی جلدی بدگمان کیوں ہو جاتی ہیں دیا۔'' وہ گہرا سانس بھر کے بستر کے کنارے تک گیا۔ پھر قدرے مسکرا کر شرارتی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔
''اگر ایسا ارادہ تھا تو پہلے آگاہ کر دیتیں مجھے آپ۔ وہ ریسپشنسٹ صاحبہ خاصی مشکوک ہو چکی تھیں کہ ایک دم سے کیا ہوا کہ ہم ایک کمرے پر متفق ہو گئے۔ میں نے تسلی بھی دی کہ میاں بیوی ہیں۔ مگر.....'' وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے گہری آنچ دیتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ علیزے بدحواس ہو کر رہ گئی۔ چہرے کے خدوخال سے تفکر چھلکا پڑتا تھا۔ وہ یکدم کھڑی ہو کر ہراساں نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
''تت..... تمہیں ضرورت کیا تھی میرا کردار مشکوک کرنے کی؟'' وہ پھنسی ہوئی آواز میں چیخی۔ عبدالہادی نے گہرا سانس بھر لیا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ آپ کا بھی جواب نہیں، پھر اٹھ کر اس سے کچھ فاصلے پر آن ٹھہرا۔
''کیوں پریشان ہو رہی ہیں خوامخواہ۔ جب ایسی بات اہم بھی نہیں۔''
''کیوں اہم نہیں۔ میرے نزدیک اپنا امیج بہت اہم ہے۔ او کے۔'' طیش سے بے قابو ہوتی وہ اسے دھکا دے کر غرائی تھی۔ لہجہ روہانسا ہو رہا تھا۔
''تو کیا اب میں ان صاحبہ کو اپنے نکاح نامے کی کاپی پیش کر کے آؤں؟'' وہ خاصے خراب موڈ میں بولا۔ عجیب لڑکی تھی بجائے کسی بھی بات کو انجوائے کرنے کے جھگڑا ڈال کر بیٹھ جاتی تھی۔
''تمہیں کیا پتا؟ عورت کردار کے بغیر باسی روٹی کی طرح ہوتی ہے۔ جسے کوئی کھانا پسند نہیں کرتا۔ سب اسے چھان بورے میں دے دیتے ہیں۔ میں

سیب سے دانت چمکدار

ایسے خستہ کرارے پھل اور سبزیاں جنہیں کچر کچر دانتوں سے کچل کر کھایا جاتا ہے، دانتوں کی صفائی میں ٹوتھ برش جیسا کام کرتے ہیں۔ ان پھلوں میں صفائی کرنے والے ایسے کیمیائی اجزاء ہوتے ہیں جو دانتوں کی بیرونی تہہ پر جمے ہوئے میل کچیل اور داغ دھبوں کو اچھی طرح صاف کر دیتے ہیں، خاص طور پر سیب میں نرمی کے ساتھ عمل کرنے والا (Malic Acid) ہوتا ہے جو نیویارک سٹی کی ماہر امراض دنداں جینیفر جیو کے بقول، دانتوں پر پڑنے والے داغ دھبوں کو تحلیل کر دیتا ہے۔

انتخاب: تابش علی حسنین۔ چشتیاں

جانتی ہوں لڑکیاں اپنے نسوانی وقار کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہیں۔ کسی بھی لڑکی کے لیے اس سے بڑھ کر ذلت کی بات کیا ہوگی کہ کوئی مرد محض اپنے وقت کو رنگین بنانے کے لیے اسے استعمال کر رہا ہو۔ مرد جس لڑکی کو اپنی عزت بنا کر اپنے گھر لے جانا چاہتا ہو اسے لے کر وہ کبھی ہوٹلوں یا پارکوں میں نہیں گھومتا۔ اس کے لیے باعزت راستہ اختیار کرتا ہے۔''
وہ یونہی آنسو بہاتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ عبدالہادی کے جیسے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔ اسے اندازہ ہوا جس بات کو وہ اتنا معمولی لے رہا تھا۔ اس لڑکی کے لیے کس درجہ تکلیف کا باعث بن چکی ہے۔ وہ گویا ہر بات کو لے کر ماضی کے حوالے سے سوچتی اور ہرٹ ہوتی تھی۔
''آئی ایم سوری دیا! آپ نے ٹھیک کہا۔ مگر یہ

بھی تو سوچیں آپ۔ میں اگر یہ غلطی کر چکا تھا تو اللہ نے مجھ سے ہی آپ کے دکھوں کا ازالہ بھی کروایا ہے۔ میں نے آپ کو اپنی عزت بنایا ہے اور......''

''تم کبھی میرے زخم نہیں بھر سکتے۔ یہ بات طے ہے۔ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا۔'' اس کے آنسوؤں میں کمی نہیں آئی تھی۔ عبدالہادی کے چہرے پر تغیر سا چھا گیا۔ وہ کچھ دیر یونہی بے بس نظروں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر یاسیت سے گویا ہوا۔

''چیزیں حیثیت نہیں رکھتیں، انسان بھی نہیں رکھتے، اہم ہوتے ہیں رشتے اگر چیزیں چھین لی جائیں تو دل صرف دکھتا ہے۔ مگر جب رشتے کھو جائیں تو دل ایسے ڈوبتا ہے کہ پھر ابھر نہیں سکتا۔ سانس تک رُک جاتی ہے۔ پھر زندگی میں کچھ اچھا نہیں لگتا۔ بس اتنا کہوں گا۔ اگر آپ یقین کر سکو۔ آپ کو کھو کر میں نے ان سب کیفیات کو شدتوں سے محسوس کیا تھا۔''

عبدالہادی کے لہجے کی گہرائی میں ایسی صداقت اور متانت تھی، ایسی شدت تھی کہ دل بے اختیار ہو کر ایمان لانے کو مچل جائے۔ علیزے بھی قدرتی طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ چند ثانیوں کو بالکل بھونچکی سی اسے تکتی رہ گئی تھی۔ عبدالہادی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور بھنوؤں کو مخصوص خوبصورت اور متاثر کن انداز میں جنبش دے کر گویا اپنی بات پر یقین دلانے کی از سر نو سعی کی تھی۔ علیزے بے اختیار نظریں چرا گئی۔ ہونٹ بھینچے آنسو پونچھتی وہ اسی عجیب دل جکڑتی کیفیت کے زیر اثر تھی جیسے۔ تبھی دروازہ ناک ہوا اور ہوٹل سروس کا ملازم اجازت ملنے پر کھانے کے لوازمات ٹیبل پر سلیقے سے سجا کر چلا گیا۔ علیزے اس دوران بھی یونہی رُخ پھیرے گریزاں اور خائف سی بیٹھی رہی تھی۔ عبدالہادی نے اسے متوجہ کرنے کو ہی باقاعدہ گلا کھنکارا تھا۔ مگر اس کی لاتعلقی، بے نیازی اور غفلت میں ذرا برابر جو فرق آیا ہو۔ عبدالہادی گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

''کھانا کھالیں علیزے!'' اسے باقاعدہ مخاطب کرنا پڑا تھا کہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' جواباً وہ بے رُخی سے کہہ گئی تھی۔ عبدالہادی کے چہرے پر عجیب سی بے بسی کا تاثر پھیلنے لگا۔

''پلیز علیزے! کسی بھی خفگی کا اظہار بہرحال کھانے پر نہیں نکلنا چاہیے۔ یہ بات تو آپ بھی جانتی ہیں ناں؟'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہتا تھا۔ علیزے کی اٹھی ہوئی سرد اور کچھ جتلاتی نظروں کے مفہوم کو سمجھتے مختصر سا سانس بھر کے خود کو کمپوز کرتے ہاتھ درمیان سے ہی واپس کھینچتے ہوئے وہ بولا تو لہجہ ہنوز متوازن تھا۔

''اُٹھ جائیں۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا ہوا آپ نے۔''

علیزے کچھ کہے بغیر اُٹھ گئی۔ چہرے کے سپاٹ تاثرات عبدالہادی کو بھی محتاط کر چکے تھے۔ وہ بہت خاموشی سے کھانے میں مصروف ہوئی تھی۔ عبدالہادی کچھ فاصلے پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ جھنجلا کر اُٹھ گئی۔ انداز ایسا تھا گویا غصہ ضبط کر رہی ہو۔ واش روم میں داخل ہو کر دروازہ ایک دھماکے سے بند کیا تھا۔ عبدالہادی نے مسکراہٹ دبا کر کاندھے اچکائے اور اٹھ کر کمرے کا دروازہ لاکڈ کر دیا۔ اس کے بعد کھڑکیوں کو بند کیا۔ چٹخنیاں چڑھادیں۔ پردے برابر کر دیے۔

''دیکھ لیجیے آپ کی سیفٹی کا سارا انتظام مکمل ہے۔ آیت الکرسی پڑھ کر حصار بھی کھینچ دوں گا۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اپنے پیچھے اس کی موجودگی کا احساس پا کر اس کی جانب پلٹتے

ہوئے وہ دھیمے مسکان زدہ لہجے میں گویا ہوا تھا۔ انداز دوستانہ قسم کا تھا۔ اس کی نگاہیں بہت نرم تاثر لیے علیزے کے وضو سے تر چہرے پر ٹھہر گئی تھیں۔ جو ایسے نوخیز شگفتہ گلاب کی مانند نظر آ رہا تھا جو شب بھر اوس میں نہا کر اپنی خوبصورتی میں کئی گنا اضافہ کر چکا ہوتا ہے۔

''تم سوتے کیوں نہیں ہو آخر؟'' وہ سخت چڑے ہوئے انداز میں کہہ گئی۔

''پھر آپ کا پہرہ کون دے گا؟ اگر ڈر گئیں آپ تو......؟'' عبدالہادی کا انداز ہنوز تھا۔

''شٹ اپ......'' وہ بہت بری طرح جھلسی تھی گویا۔ عبدالہادی مسکراتے ہوئے پلٹ کر بستر پر چلا گیا۔ علیزے رُخ پھیرے نماز میں مشغول ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

یہ جنون ہے یا سکون ہے
میرے چار سُو فقط ایک تُو

اتنے گھنٹے گزر گئے تھے۔ وہ اسی زاویے سے بیٹھی تھی۔ جیسے آ کر سرسری انداز میں بیٹھک کے صوفے پر ٹک گئی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہوا تھا کہ تب جو لرزش اس کے وجود میں اتری تھی۔ اس میں اب کمی آ گئی تھی۔ لیکن دل کی لرزش...... اس کا انداز ہنوز تھا۔ وہ ایسے کانپا تھا جیسے طوفان کی زد میں آ جانے والا خزاں رسیدہ پتا، وہ اتنی ہراساں تھی۔ اس درجہ خائف کہ کچھ بھی اور فکر دامن نہ گھیر سکی تھی ماسوائے اس کے کہ...... کہ اگر عبدالغنی نے اپنی اس بے انتہا خوبصورت، نازک اور دلفریب حسن کی مالک بیوی کی جذباتی کیفیت سے گھبرا کر اسے واقعی چھوڑ دیا۔ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تو......تو......'' اس تو کے آگے ہراس کا ایسا احساس تھا کہ دل دھڑکنیں بھولنے لگتا تھا۔

عبدالغنی! تحفظ و طمانیت کا احساس، بھرپور احساس دلاتا ہوا نام! جس کے وجود پہ پہلی نگاہ ڈالتے ہی اسے اب تک کی زندگی کی ساری تلخی، ساری کلفت مٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ کوشش کی تھی کہ وہ خدا سے شاکی نہ ہو مگر پچھلے دنوں جتنی دربدری، جس قدر خوف کی کیفیت تھی، وہ شاکی ہونے لگی تھی۔ اور جب اسے یہ خبر ملی تھی کہ کوئی ہے جو اُس سے عقد کرنے، اُسے تحفظ دینے، اسے اپنی عزت بنانے پر آمادہ ہے تو ایک حیرانی......اور بے یقینی کی کیفیت کے ساتھ جو خاکہ ذہن میں ابھرا تھا وہ کسی معمر وضعیف بوڑھے یا پھر کسی ایڈونچر پسند نوجوان کا تھا۔ پتا نہیں کیوں انسان اپنی فطرت کی کمزوریوں سے ہار جاتا ہے۔ شاید اللہ پر یقین کامل کا دعوا کرنے کے باوجود ہم کامل یقین رکھ نہیں پاتے۔ عبدالغنی کو دیکھنے سے قبل تک وہ اسی ایمان کی کمزوری کا شکار تھی۔ اس پر پہلی نگاہ ڈال کر وہ صرف ششدر نہیں ہوئی تھی۔ اسے رب پر بے تحاشا پیار بھی آیا تھا۔ اسے اپنی قسمت پر رشک بھی آیا تھا۔ اسے عبدالغنی سے وہ عشق ہوا تھا جو پہلی نگاہ کا منتظر ہوا کرتا ہے۔ نکاح کے ایجاب وقبول کے مرحلے اس نے اک سحر زدہ کیفیت اور اک سرشاری کے عالم میں طے کیے تھے۔ یہ احساس اتنا فرحت آگیں تھا کہ اسے اس سے کئی گنا بڑھ کر شخص ملا تھا جتنا اس نے کبھی سوچا اور تصور کیا ہوگا۔ نامعلوم کیسی کشش تھی عبدالغنی کے سراپے میں کہ وہ یوں یکدم اس کے حواسوں پر طاری ہو گیا تھا۔ سارا ڈر خوف جانے کہاں جا چھپا تھا۔ وہ ایک انوکھی سرخوشی کے عالم میں اس کے ہمراہ جانے کو تیار ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس اس کا ہمسفر جیسے کسی تفکر میں مبتلا تھا، کسی سوچ میں گم تھا۔ اس کا یہ تغافل عبیر کو بُرا نہیں لگا۔ مگر بے چین ضرور کر گیا تھا۔ اس سے قبل کہ یہ بے چینی

بڑھتی ۔ عبدالغنی نے نیم اندھیری گلی میں قدم بڑھاتے ہوئے اسے مخاطب کرلیا۔

''میں شاید گھر جا کے آپ سے روایتی انداز میں بات چیت اور ملاقات نہ کرسکوں۔ جبھی بہتر سمجھتا ہوں کچھ اہم اور ضروری باتیں ابھی آپ کو سمجھادوں۔'' گلا کھنکار کر بات کا آغاز کرتا ہوا عبدالغنی اپنی بھاری اور متوازن آواز میں اسے مخاطب کرتا ہوا عبیر کے اندر ایک انوکھا اطمینان بھر گیا تھا۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ عبدالغنی اس سے بات کرے، کچھ کہے، چاہے کچھ بھی۔

''میں شادی شدہ ہوں۔ ایک بیٹا بھی ہے۔ حافظ صاحب نے بتایا ہوگا آپ کو۔ لاریب عام بیویوں سے کچھ زیادہ ایچ ہے مجھ سے، اور کچھ زیادہ پوزیسیو بھی شاید۔ یہ سب بہت غیر متوقع ہوگا اس کے لیے اور بہت تکلیف دہ بھی۔ عین ممکن ہے وہ آپ کے لیے مسائل بھی پیدا کردے۔ عبیر...... میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ میں آپ کے حقوق غصب کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مگر ممکن ہے آپ کو لاریب کے رویے کو برداشت کرنا پڑے، ہر لڑکی کو...... شادی کے شروع میں کچھ نہ کچھ قربانی لازمی دینا پڑتی ہے۔ آپ کو بھی......''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ہر ممکن طریقے سے کوشش کروں گی آپ کو میری وجہ سے پریشانی نہ ہو اور چونکہ میں ایک عام لڑکی نہیں ہوں۔ جبھی میری خواہشات کا دائرہ بھی عام لڑکی کی طرح وسیع نہیں ہے۔''

عبدالغنی کی بات قطع کرکے اس نے جس نرمی و سبھاؤ سے تسلی دی تھی۔ عبدالغنی کے قدموں کی رفتار نہ صرف سست پڑی تھی بلکہ وہ بے اختیار پلٹ کر اس کا چہرہ دیکھنے پر جیسے مجبور ہوگیا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی اُس پل براہِ راست ان دونوں کو اُجال رہی تھی۔ اس روشنی میں اس کا سانولا، گہرا سانولا چہرہ جھکا ہوا اور قدرے ملول لگا تھا عبدالغنی کو۔

''آپ کی سوچ میں جتنا بھی ضبط اور قرار ہو۔ مگر آپ کا دل بہرحال ایک عام لڑکی کا دل ہے۔ جس کی خواہشات وہی ہیں جو ایک نارمل لڑکی کی ہوسکتی ہیں۔ عبیر...... میں نے اگر کسی قربانی کا تذکرہ کیا ہے تو وہ لاریب کے حوالے سے...... میری ذات کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے لیے آپ میں اور لاریب میں اب ہرگز کوئی امتیاز نہیں۔'' اپنی بات کے دوران عبدالغنی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور نرمی سے، اپنائیت بھرے انداز میں دبا کر چھوڑ دیا تھا۔ انداز تسلی کا تھا، دلاسے کا تھا۔ اپنے ساتھ کے یقین کا بھی تھا۔

عبیر کا پورا وجود ٹھہرا کر رہ گیا۔ کسی بھی مرد کا یہ پہلا باقاعدہ لمس تھا جو اس کے بدن پر اترا تھا اور اپنائیت ومحبت کا لازوال تاثر قائم کرگیا تھا۔ اس نے اپنے اندر ایک انوکھی کیفیت اور توانائی اترتی محسوس کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لاریب سے ملنا، لاریب کو دیکھنا اسے کسی بھی جیلیسی کے احساس سے ہمکنار نہ کرسکا بلکہ اس کی تکلیف اس کا درد وہ اپنے دل میں محسوس کرتی ایک مجرمانہ کیفیت سے ہمکنار ہوچلی تھی۔

عبدالغنی نے اسے بیٹھک میں جانے کا کہا تھا اور خود لاریب کی جانب متوجہ ہوگیا۔ یہ توجہ کیسی تھی، یہ غفلت کیسی تھی۔ جو اس سے برتی گئی جو کسی اور کو دی گئی۔ یہی وہ احساس تھا۔ جہاں نئی کیفیت اُبھری جیلیسی کی، رقابت کی، خوف کی، وہ اپنے ملے جلے احساسات کے ہمراہ تنہا تھی۔ بالکل اکیلی، ایسے میں سوچیں عجیب سی یلغار کرتی ہیں۔ وہ بھی انہی سوچوں کی یلغار کے زیر اثر آرہی تھی۔

''یہ اس کی شادی کی رات تھی۔ عجیب رات

تھی۔ وہ بغیر کسی سنگھار کے ایک بدصورت دلہن تھی۔
جسے اس کا شاندار، شہزادوں جیسا خوبرو دولہا چھوڑ کر اپنی پہلی مگر بہت حسین وجمیل بیوی کی دلجوئی میں مصروف تھا۔ اسے لگا تھا وہ ساری عمر ہار رہی ہے۔ تو اس مقام پر بھی جیت کیسے سکتی تھی۔ اسے دکھ اور یاسیت نے آن لیا تھا۔ آنکھیں بے مائیگی کے احساس سے بھیگتی رہیں۔ ایک بار دل میں آئی ۔رگڑ رگڑ کر سارے بدن کی میل اتار دے۔ وہ حسن جو بدنگاہی سے بچانے کو خود گہنا ڈالا تھا اسے پھر سے آشکار کرے اور اس شخص کی آنکھیں چندھیا کے رکھ دے۔ جو کتنی آسانی سے اسے چھوڑ کر دوسرے کمرے میں جا چکا تھا۔ مگر نہیں، یہ سوچ تو ایک عام لڑکی کی ہی سوچ تھی اور وہ خود دعویٰ کر چکی تھی کہ وہ عام لڑکی نہیں ہے۔
خود کو رد کرنا آسان نہیں، مگر اسے یہ کرنا تھا۔ اسے خود کو مارنا تھا ہمیشہ کی طرح۔ ہمیشہ کے صبر کے عادی دل کو سمجھانا اتنا بھی مشکل نہیں تھا۔ صبر آیا تو خدشے نے پنجے دل کی زمینوں پر گاڑھنے شروع کیے تھے۔
یہ رات واقعی اہم تھی۔ فیصلوں کی بھی، ہمتوں کو مجتمع کرنے کی بھی۔ اس نے یہی کیا تھا۔ وہ رات کا آخری پہر تھا۔ جب اس نے اُٹھ کر وضو کیا۔ پہلے عشاء کی ادائیگی کی پھر فجر کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب عبدالغنی نے بیٹھک کے دروازے پر قدم رکھا تھا۔ اس کے ملبوس کی مہک اور فجر کی اذان کی پہلی پکار نے ایک ساتھ عبیر کے احساسات کو متوجہ کیا تھا۔ وہ چونک کر عبدالغنی کو دیکھنے لگی۔ جس کی ساحر آنکھوں میں رتجگے لکھے ہوئے تھے۔ وہ نظریں جھکا گئی۔ عبدالغنی اسے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اذان مکمل ہوگئی۔ عبدالغنی نے زیرلب دعا پڑھی تھی پھر گہرا سانس بھر کے اسے مخاطب کیا تھا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔ لاریب کی خرابی طبیعت کے باعث میں......''
''اب کیسی ہیں وہ......؟'' عبیر نے نرمی سے بات کاٹ دی۔ وہ اسے مزید خجالت کا شکار نہیں کرنا چاہتی تھی۔
''ہنوز اپ سیٹ ہیں۔ اللہ پاک مہربانی فرمائے اس پر۔'' عبدالغنی کے لہجے میں لاریب کے لیے خصوصی لگاؤ کا احساس رچا بسا تھا۔ عبیر کو لاریب پر اس پل بے تحاشا رشک آیا تھا۔
''آمین۔'' وہ زیرلب کہہ گئی۔ عبدالغنی نے پھر اسے دیکھا تھا۔
''آپ نے رات کھانا کھایا نہیں ہوگا یقیناً کچن میں سب کچھ میسر ہے۔ بلکہ میں خود آپ کے لیے......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر جس ارادے سے پلٹا تھا اسے سمجھ کر ہی عبیر نے بوکھلا کر اسے فی الفور ٹوکا۔
''پلیز...... پلیز شاہ! اس تکلف میں مت پڑیں۔ آپ کی جماعت لیٹ ہوجائے گی۔ میں خود چلی جاتی ہوں کچن میں، اپنا گھر ہے یہ میرا۔'' بات کے اختتام پر وہ دانستہ مسکرائی تھی۔ عبدالغنی یوں نظر آنے لگا جیسے واقعی سر سے کوئی بھاری بوجھ اُترا ہو۔
''یہ بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ دروازہ بند کرلیں اور ہاں......'' وہ چلتے چلتے رکا۔ اور پلٹ کر نرم نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ ''لاریب کا خیال رکھیے گا۔ نیند میں ہے وہ۔ میں کوشش کروں گا آج جلدی آنے کی۔''
''آپ فکر نہ کریں۔'' وہ پھر تسلی آمیز انداز میں مسکرائی تھی۔ عبدالغنی مطمئن ہونے کے بعد دروازے سے نکل گیا۔ عبیر نے دروازہ بند کیا اور وہیں بند دروازے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ دل عجیب مغلوب قسم کے جذبات سے لبریز ہوکر رہ گیا

تھا۔ کیسا آدمی تھا۔ درویش قسم کا ایسی مختصر جان پہچان اور ایسا اندھا بھروسہ اعتماد، اپنا گھر اپنی عزیز از جان بیوی اور بچہ، کل کائنات اس کے سپرد کر کے چلا گیا۔ چاہے وہ اس غافل پڑی لڑکی کے ساتھ جو مرضی کر گزرے۔ قتل کر دے، گھر لوٹ کر لے جائے۔''

''کیا اسے ایسا اعتماد تھا مجھ پر کہ میں کچھ غلط نہیں کروں گی؟'' وہ ہونٹ کچلتی سوچتی رہی تھی۔ اُلجھتی رہی تھی۔ پھر سر جھٹک کر اندر آ گئی۔ پوری آمادگی کے ساتھ نماز ادا کی پھر دعا کو ہاتھ پھیلا دیے۔ آنکھیں جانے کس جذبے سے نم ہوتی تھیں۔ اس کے بعد وہ ٹہلتی ہوئی زیرلب قرآنی آیات کا ورد کرتی اسی کمرے کی جانب آ گئی جہاں ہو نصیب کی ملکہ محوِ استراحت تھی۔ عبیر نے جھجکتے ہوئے اندر جھانکا تھا۔ جہازی سائز بیڈ پر وہ بستر میں کروٹ کے بل واقعی بے سدھ پڑی تھی۔ داہنی جانب بچہ لیٹا نظر آ رہا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی اور رُخ کچن کی جانب پھیر دیا۔ فریج کھول کر دیکھا۔ انڈے ڈبل روٹی گوندھا ہوا آٹا، دودھ ہر شے موجود تھی۔ اس نے ساس پین میں چائے کا پانی رکھ دیا اور اسٹول گھسیٹ کر ٹک گئی۔ کیفیت خالی الذہنی کی تھی۔ جب آہٹ محسوس کر کے ہڑبڑا کر پلٹی تھی اور روبرو لاریب کو پا کر اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف اُتر آیا تھا۔

''تت...... تم؟'' وہ وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھتی پھنسی ہوئی بھراہٹ زدہ آواز میں چلائی۔ عبیر فطری طور پر گھبراہٹ کا شکار نظر آنے لگی۔ کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ محض لرزے تھے۔

''عبدالغنی کہاں ہیں؟ اور...... اور تم یہاں...... میرے گھر کے کچن میں آنے کی جرأت کیسے کر گئیں؟'' متلاشی نگاہیں اطراف میں دوڑا کر وہ پھر قہر بار انداز میں چیخی۔ عبیر کچھ اور سہم کر اسے ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔ کچھ بولنے کی کوشش اب بھی ناکامی کا شکار ہو چکی تھی۔ یہ لڑکی...... جو اپنے ملکوتی حسن اور اپنے سراپے سے چھلکتی تمکنت کے باعث ایک انوکھا سا غیر محسوس رعب کا احساس اس پر طاری کر چکی تھی۔ وہ اتنا گہرا اور جامع تھا کہ عبیر خود کو اس میں پھنسا ہوا بے بس محسوس کر کے محض پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔

''یہ بہت فاسد خیال ہے تمہارا کہ تم میرے گھر اور میرے شوہر پر قبضہ کر سکتی ہو۔'' دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ جو لاریب نے جیسے سنی نہیں شکر عبیر نے سنی مگر وہ لاریب کے سامنے دروازہ کھولنے کی جرأت نہ کر سکی۔ لاریب اب پہلے سے زیادہ بلند آواز میں غرائی تھی۔ اس کی آواز میں ہیجان اُتر رہا تھا۔ عبیر نے اسی گھبراہٹ و سراسیمگی کے احساس سمیت سر کونفی میں جنبش دے کر گویا اس کے خیال کی نفی کرنی چاہی تھی جسے لاریب نے جانے کس انداز اور فہم میں لیا کہ بپھرتے ہوئے آگے بڑھ کر نہ صرف اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے بلکہ منہ پر بھی بھرپور طمانچے رسید کیے تھے۔ اسی دوران دروازہ پھر کھٹکا۔

''کیا نہیں...... ؟ ہاں بولو...... کیا نہیں؟'' وہ جیسے حواسوں میں نہیں رہی تھی۔ حواس تو عبیر کے بھی سلب ہو گئے تھے۔ وہ لاریب سے ناراضی کی توقع تو ضرور رکھتی تھی، مگر اس طرح تشدد کا تو تصور بھی محال تھا۔ اور غیر متوقع کوئی بھی عمل ہو وہ حواس ضرور چھینتا ہے۔ منجمد ضرور کرتا ہے۔ وہ بھی وقتی طور پر منجمد ہی نہیں ہوئی گم صم بھی ہو گئی۔ پتھرا کر رہ گئی۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے فی الفور۔ ورنہ میں جان سے مار ڈالوں گی تمہیں سمجھیں؟'' وہ آنکھیں نکال کر سرتاپا کانپتے ہوئے پوری قوت سے چلائی تھی۔ تب عبدالغنی تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں آیا تھا۔ جب سے اُم جان اور بابا جان حج پر گئے تھے۔

لاریب کی طبیعت کی خرابی کے باعث عبدالغنی اسے ڈسٹرب نہ کرنے کے خیال سے چابی اپنے پاس رکھتا تھا۔ وہی چابی اب کام آئی تھی۔ مگر اندر کی صورت حال نے اسے ششدر کر کے رکھ دیا تھا۔ لاریب کے ہیجانی دھکے کے نتیجے میں عبیر لڑکھڑا کر اگر اس سے نہ ٹکراتی تو کچن کی دہلیز سے پرے پختہ فرش پر گری پڑی ہوتی۔

''لاریب......'' وہ تو جیسے چکرا کر رہ گیا تھا۔

''اسے گھر سے نکالیں، ابھی اسی وقت۔'' لاریب نے آگے بڑھ کر مجنونانہ انداز میں عبیر کو اس سے کھینچ کر فاصلے پر کرتے اپنا ہذیانی مطالبہ دہرایا تھا۔ عبدالغنی جیسے ابھی تک اس صدمے کی کیفیت سے نہیں نکل سکا۔ وہ اگر اپنی آنکھوں سے لاریب کو عبیر کے بال جھنجوڑتے، تھپڑ مارتے نہ دیکھ لیتا تو شاید یقین نہ کر پاتا کہ وہ ایسا کر بھی سکتی ہے۔ اس کا سرخ ہو کر دہکتا چہرہ اس کی اندرونی کیفیات کا واضح غماز تھا۔ عبیر جیسے سوئے دار فیصلے کی منتظر تھی۔ مجرم تھی، خطا کار تھی۔

''تم اندر چلو لاریب!'' اس نے جھکے سر، لرزتے دل اور کانپتے سراپے کے ساتھ عبدالغنی کی بھنچی ہوئی آواز سنی تھی۔ اور یونہی سر جھکائے رکھا۔

''میں نے کہا ہے آپ اسے گھر سے نکالیں۔'' لاریب جیسے اس حکم پر کچھ اور بھی غصیلی ہوگئی۔ جبھی پہلے سے زیادہ آواز میں چلائی تھی کہ عبدالغنی نے اسے بہت غصے میں دیکھا تھا اور ہاتھ بڑھا کر قدرے درشتی سے اس کی کلائی جکڑ لی۔

''عبیر کے متعلق میرا کیا فیصلہ ہے، یہ میں تمہیں رات آگاہ کر چکا ہوں۔ بہتر ہے خوامخواہ ماحول خراب مت کرو۔'' عبیر خود پلٹ کر بیٹھک میں چلی گئی تھی جب عبدالغنی نے لاریب کو دیکھتے ہوئے پھر رسان سے سمجھانا چاہا تھا۔ لاریب کو جیسے سکتہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس نے تھم کر یکدم ٹھنڈی پڑتے ہوئے اپنی کلائی کو جکڑے عبدالغنی کے سفید ہاتھ کو دیکھا۔ اس کی سخت غصیلی، حقیر زدہ گرفت کو محسوس کیا۔ اس کے لہجے کی جھنجلاہٹ ، بے زاری، اکتاہٹ کو محسوس کیا۔ سہا اور جیسے اندر تک شل ہوگئی۔ وجہ واضح تھی ایک دوسری عورت، درمیان میں محض ایک رات اور پھر یہ اتنی بڑی تبدیلی، اسے لگا تھا ڈھا کہ پھر لٹا ہو۔ دہلی پر پھر شب خون مارا گیا۔ کوئٹہ پھر غرق ہوا۔

اس کے اندر ایسی ہی قیامت اٹھی تھی کہ سب کچھ لمحوں میں مسمار ہوا اس نے جانا تھا۔ عبدالغنی اب صرف اس کا نہیں رہا۔ وہ کسی اور کا بھی ہوا تھا۔ اس کا دل اسی نقصان سے بچنے کو تو ہاتھ پیر مارتا تھا۔ تڑپتا سسکتا تھا۔ یہ نقصان پھر بھی جھولی میں آن گرا تھا۔ کچھ کہے بغیر اس نے اپنا ہاتھ تو چھڑوایا اور پلٹ کر اندر آگئی۔ عبدالغنی ایک لمحے کو تو بالکل حیران رہ گیا۔ اس کی بدلی کیفیت کو بھلا کیا خاک سمجھتا جانتا وہ۔ البتہ اُلجھتا ہوا ضرور پیچھے آیا تھا۔

''بات کو پک کرنے کی کوشش کرو لاریب! اس کا کوئی گھر نہیں ہے کہ یہاں سے نکال دوں تو وہاں چلی جائے۔'' لاریب آنکھوں میں بیگانگی لیے اسے دیکھتی رہی۔ ایک عجیب سرد مہر تاثر اس کے چہرے پر آن کر ٹھہر گیا تھا۔

''مجھے ایک بات کا جواب دیں آپ؟ میں نے کیا کمی دی تھی آپ کو......؟ کبھی کسی چیز کا مطالبہ ناجائز کیا؟ تنگ کیا آپ کو؟ پھر......؟ پھر کیوں عبدالغنی؟'' اس کا ضبط پھر چھلک گیا۔ وہ پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ آنکھیں جو پہلے ہی شدت گریہ سے بے حال اور سوجن کا شکار تھیں۔ ان پر مزید ستم توڑتا، عبدالغنی کو ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ وہ جتنا بے بس لاچار ہوا تھا۔ وہ اسی قدر شدتوں سے اس کا ضبط

آزمانے لگی۔

''میں نے کبھی آپ سے کچھ نہیں چاہا تھا۔ سوائے اس کے کہ...... کہ آپ یہ نہ کریں مگر......'' اس کی ہچکیاں بندھنے لگیں۔ عبدالغنی بے قرار سا ہوتا قریب آ گیا مگر لاریب نے اسے خود کو چھونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ بدک کر فاصلے پر ہوگئی۔ یہ بھی ناراضگی، شدید ترین ناراضگی کا ایسا اظہار تھا، جو اس سے قبل اس کی جانب سے دیکھنے کو نہیں ملا تھا کہ وہ ان گزرے ہوئے پانچ سالوں میں دکھ اور احتجاج کے اس انتہائی مرحلے میں کبھی داخل ہی نہیں ہو پائی تھی۔

''جو بھی غلطی تھی اس میں میرا قصور کہیں بھی نہیں نکلتا تھا عبدالغنی کہ سزا آپ نے میرے لیے تجویز کر ڈالی۔ غلطی بھابی کی تھی۔ انتقام بھائی نے لیا۔ آپ نے کیوں بھلا ان کا بدلہ مجھ سے نکالا ہے بولیں؟'' وہ بات کو کس رخ پر لے گئی تھی۔ عبدالغنی کا دل اپنا سر پیٹ لینے کو چاہنے لگا۔ صد افسوس وہ اسے سمجھنے سے اتنا قاصر کیوں رہی۔

''لاریب!''

''میں کچھ نہیں سنوں گی۔ سوائے اس کے کہ آپ اسے طلاق دیں گے۔'' عبدالغنی جتنی لاچاری سے مخاطب ہوا تھا وہ اسی قدر طیش میں آ کر پھر چیخی۔ عبدالغنی ہونٹ بھینچے پھر نگاہ کا زاویہ بدل کر یوں گہرے سانس بھرنے لگا جیسے اپنے اضطراب، اپنے طیش پر قابو پانا چاہ رہا ہو۔

''مجھے سمجھ نہیں آتی۔ آخر آپ کو اس دو کوڑی کی عورت میں نظر کیا آیا۔ جس کی شکل بھی ایسی نہیں ہے کہ اسے ایک سے دوسری مرتبہ دیکھنے کی بھی خواہش......''

''لاریب!'' عبدالغنی کا وہ ضبط جواب تک اس کے ہمراہ تھا۔ بالآخر چھلک گیا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور بھرپور تھپڑ کی صورت لاریب کے چہرے کی خبر لے گیا۔ شاید آسمان ٹوٹ پڑتا تو لاریب کو ایسی حیرت اور صدمہ نہ ہوتا جتنا اس پل اس لمحے وہ دکھ اور غیر یقینی کا شکار ہوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

عبدالغنی کا چہرہ بالکل سرخ تھا۔ یوں جیسے ابھی لہو چھلک پڑے گا۔ لاریب ہنوز پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں دکھ کا ایسا رنگ اترا تھا جو روح شق کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اگلے لمحے اس کی آنکھیں یکا یک پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ یہ نمی لمحے کے ہزاروں حصے میں اس کے دہکے ہوئے رخساروں پر اترتی چلی گئی۔

''آپ نے مجھے مارا عبدالغنی!'' اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے مقابل آن کر ٹھہرنے کے بعد وہ رقت آمیز آواز میں ایسے بولی تھی کہ ہزار ہا نوحے اس کی آواز میں مچل رہے تھے۔ عبدالغنی ہونٹ بھینچے دوسری جانب دیکھتا رہا۔ وہ عجیب سے زخمی دل سوز انداز میں جیسے روتے ہوئے ہنسی اور جیسے ہنس کر روئی۔

''آپ نے زندگی میں پہلی بار مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے تو اس کی وجہ بھی ہرگز معمولی نہیں ہے۔'' وہ بہت مشکل سے بولی تھی۔ گلے میں اترتے آنسو اس کی آواز کو بہت بوجھل بنا رہے تھے۔ عبدالغنی نے اسے چونک کر دیکھا اور جیسے کچھ کہنا چاہا۔ مگر وہ ہاتھ اٹھا کر اسے روک گئی۔

''ابھی میں نے آپ سے کہا تھا ناں عبدالغنی اس عورت کو گھر سے نکال دیں۔ میں نے آپ سے یہ بھی کہا تھا میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں آپ سے فیصلہ چاہتی تھی ناں عبدالغنی!'' وہ روانی سے بہتے آنسوؤں کو پونچھے بغیر بڑی دقتوں سے بات جاری رکھتے ہوئے کہے گئی۔

"فیصلہ آپ نے کر دیا۔ اس تھپڑ نے مجھے جتلا دیا میری حیثیت کو۔ میں......"

"لاریب......"

"کچھ مت کہیں عبدالغنی! کچھ مت کہیں۔ قسم کھاتی ہوں اگر آپ نے کچھ اور کہا تو میں مزید دل نہیں سنبھال سکوں گی۔ یہ پھٹ جائے گا۔" وہ زارو قطار روتے ہوئے بولی تھی۔ عبدالغنی کا اضطراب دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ تڑپ کر قریب ہوا اور اسے تھامنا چاہا۔ مگر لاریب مچل کر، تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی تھی۔

"مجھے ہاتھ مت لگائیں۔ مجھے مت چھوئیں عبدالغنی! آپ کا لمس میرے لیے زندگی تھا۔ لیکن تب تک...... جب تک آپ میرے تھے۔ صرف میرے۔ اب ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔" وہ سسکتی ہوئی فاصلے پر ہوئی تھی اور بیڈ کے نیچے پڑا بیگ گھسیٹ کر الماری کھول کر اپنے کپڑے اس میں بھرنے لگی۔ عبدالغنی کی صحیح معنوں میں جان پر بن آئی تھی۔

"کیا کر رہی ہو لاریب! میں......"

"نو آرگومنٹ عبدالغنی! بس کھیل ختم ہوا۔" وہ پلٹے بغیر چلائی۔ اس وحشت سے کہ کمرے کی دیواریں تک لرز اٹھیں۔ خود اس کی سماعتیں جھنجھنا اٹھیں۔ عبدالغنی ساکن ہو کر رہ گیا۔

"تم جا رہی ہو......؟" وہ ششدر تھا۔ لاریب دکھ سے شل ہوئی۔

"ہاں...... یہ طے ہے عبدالغنی کہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اس تھپڑ کو صرف اب اس صورت بھولوں گی اگر آپ اس عورت کو چھوڑ سکیں گے۔ ورنہ ہمارے راستے ہمیشہ کے لیے الگ ہیں۔ اوور آل! فیصلے کا اختیار آپ کے پاس ہے۔" عبدالغنی کے وجود پر عجیب سا سناٹا چھا گیا۔ لاریب اب سیل فون اٹھائے ممی کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ پھر وہ ان سے بات کرنے لگی۔ عبدالغنی نے سنا وہ انہیں گاڑی بھیجنے کا کہہ رہی تھی۔ اس سے قبل وہ ان پانچ سالوں میں میکے کی امارت سے اتنی بیگانہ تھی کہ کبھی اس قسم کی اپنائیت یا بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اسے عبدالغنی کی انا کا ہمیشہ پاس رہتا تھا۔ وہ کئی کئی گھنٹے عبدالغنی کے انتظار میں تو ضائع کر دیا کرتی تھی مگر کبھی ممی کے اصرار کے باوجود ان کی گاڑی میں نہیں آئی تھی۔ اور اب...... عبدالغنی نے نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔ اس کی آنکھوں کی جلن بڑھ گئی تھی۔ اس کے دماغ کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ اس کے دل کا درد بھی بڑھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے اپنے جسم کے گرد شال کی بکل باندھی اور بے زار نگاہوں سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ انہیں پھر سفر کرتے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ راستے میں ایک جگہ رُک کر اس نے ٹنکی بھی فل کرائی تھی۔ کچھ کھانے پینے کی اشیاء بھی لی تھیں اور دوبارہ طویل تھکا دینے والے سفر کا آغاز ہوا تھا۔ حالات سازگار ہوتے اور من پسند رفاقت بھی تو لازماً وہ اس سفر سے لطف کشید کر سکتی تھی۔ بل کھاتے اونچے نیچے، ٹیڑھے میڑھے راستے، جو سخت ترین پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ انتہائی دشوار گزار تھے۔ کہیں نیچے برف پوش پہاڑ اپنی جانب متوجہ کرتے تو کبھی بہت دور بہنے والا پانی کا دریا اس کے اندر گہری سراسیمگی دوڑا دیتا۔ اس سفر کی طوالت سے اُکتا کر ہی اس نے جل کر وہ بات کہی تھی جس کے جواب میں عبدالہادی جو بولا تھا وہ اس کے گال دہکانے کو کافی تھا۔

"اتنے غریب بھی نہیں ہو گئے تم کہ اس طرح ہڈیاں چٹخانے تو ڑنے کی بجائے پلین کے ٹکٹ لے لیتے۔" مسلسل لگنے والے جھٹکوں نے اتنا موڈ خراب

کیا تھا کہ وہ انا بالائے طاق رکھ کر یہ چبھتی ہوئی بات کہہ گئی تھی۔ عبدالہادی نے باقاعدہ گردن موڑ کر اسے کچھ دیر مسکراہٹ دبا کر دیکھا تھا۔

''بالکل ٹھیک کہا۔ آپ یہ تو سب کچھ لٹا سکتے ہیں۔ مگر اس طرح سفر کرنے کا مقصد زیادہ سے زیادہ آپ کی قربت حاصل کرنا ہی ہوسکتا تھا۔ ہوائی سفر میں یہ لطف کہاں مل سکتا تھا۔'' اس کی آنکھیں اس پل اپنے رشتے کے احساس کے ہمراہ کتنی گستاخی سمیٹ لائی تھیں۔

ان پری زادوں سے لیں گے خُلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی گر حدیں وہاں ہوئیں

وہ ابھی پہلے جملے سے نہیں سنبھلی تھی کہ عبدالہادی کے الفاظ نے اسے بھک سے اڑا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد کا اس کا غصہ بھی بھلا کیا کر سکا تھا۔ اسے تو لگا تھا جیسے مطلق اثر نہ ہوا ہو۔ اس پر ہاں البتہ علیزے ضرور محتاط ہوگئی تھی اس طرح کہ دوبارہ اسے مخاطب کرنے کی غلطی نہیں کی۔ یہاں تک کہ اس نے خود بھی اگر کچھ پوچھا تو جواب نہیں دیا تھا۔ یہ دیکھے بغیر کہ وہ اس کی اس حکمتِ عملی کے جواب میں کیسے محظوظ ہونے والے انداز میں مسکراتا رہا ہے۔

شدید سردی کی لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بل کھاتے پہاڑی راستوں پر پھیلی سڑک ...... تاحد نگاہ پھیلے ہوئے برف پوش پہاڑ مبہوت کردینے والے تھے۔ درختوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ جو سفر میں مسلسل ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ خوبانی، سیب اور بادام کے درخت جابجا پھیلے ہوئے تھے۔ ابھی سردی کے باعث پھل نہیں آیا تھا۔ تب گویا ان کی اصل خوبصورتی دیکھنے میں آتی تھی۔

پھر بالآخر اس سفر کا اختتام ہوگیا تھا۔ محل نما عمارت جو اونچے پہاڑوں کے درمیان ایستادہ تھی۔ پتھر سے بنی جدید و قدیم کا اعلیٰ شاہکار نظر آتی تھی اور مبہوت کردینے والی آرائش کے ہمراہ ملازموں کی ایک فوج نے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ علیزے کو اندازہ تو تھا اس کی امارت کا۔ مگر وہ ایسا رئیس زادہ ہوگا یہ گمان تک نہیں تھا۔ وہ قدرے حیران تھی جبکہ عبدالہادی ہر شے سے بے نیاز نظر آتا تھا۔

ملازمہ کی معیت میں وہ جس آبنوسی منقش دروازے کے سامنے طویل، شفاف راہداری سے گزر کر آن کررُکے وہ ہی اس کی ممی کا بیڈ روم تھا۔ خواب گاہ بہت پُرشکوہ اور وسیع تھی۔ خواب ایسے ماحول میں جہازی سائز بیڈ پر جو بوڑھی عورت دراز نظر آئی تھی اس کے کھنڈر وجود کو دیکھ کر بھی اندازہ ہوتا تھا کبھی عمارت یہ پُرشکوہ رہی ہوگی۔ چھت میں ایک بڑا اور دو چھوٹے فانوس روشن تھے۔ ایک کونے میں آرٹیفیشل پلانٹ اتنا حقیقت کے قریب لگتا تھا جیسے واقعی اور یجنل ہو۔

عبدالہادی بیڈ سے کچھ فاصلے پر جیسے ایک صدمے کی کیفیت کے زیر اثر کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کی نگاہیں زردیوں میں ڈوبے اس نحیف چہرے پر ٹھٹکی رہ گئیں، جو کہیں سے بھی اس کی حسین و جمیل ممی کا چہرہ نہیں تھا۔

''مائی سن! یہاں آؤ'' انہوں نے اپنے بازو پھیلا دیے تھے۔ ان کمزور بازوؤں میں لرزش تھی۔ عبدالہادی کا وجود لرزا اٹھا۔ اگلے لمحے وہ آگے بڑھا اور ان کے بازوؤں میں سمانے کی بجائے ان کے ناتواں وجود کو اپنے بازوؤں میں بھر کے ان کے کاندھے سے چہرہ ٹکا کر سسک پڑا۔

''مجھے دکھ ہے، میں نے آپ کو چھوڑ دیا۔'' علیزے نے اس کا فقرہ سنا تھا۔ اور بے ساختہ چونک پڑی۔

(باقی انشاءاللہ ماہِ دسمبر میں ملاحظہ فرمائیے)

''میں نوید......؟'' نوجوان نے گھبراتے ہوئے خود سے سوال کیا۔''ہاں بیٹا! تم ہی میرے نوید ہو۔ آج سے سات سال پہلے تم مجھ سے رُوٹھ کر چلے گئے تھے۔ نوید دیکھ...... دیکھو بیٹا

نہلے پہ دہلے کی تصویر، افسانے کی صورت

اس چار دیواری کے کمرے جس میں موت کا سناٹا تھا، دونوں ماں بیٹی سخت کرب میں مبتلا تھیں۔ نسیمہ نے تو رو رو کر اپنی آنکھیں سُجالی تھیں۔ خالہ فریدہ کو رہ رہ کر اپنے مرحوم شوہر ستار صاحب یاد آرہے تھے، جبکہ گم شدہ بیٹا نوید بھی انہیں بہت یاد آرہا تھا۔ باپ کے مرنے اور بھائی کے گھر سے چلے جانے کے بعد جیسے کہ نسیمہ کی زندگی کی تمام رونقیں، تمام سہولتیں اور تمام رشتے داریاں ہی چھن گئی تھیں۔ فریدہ آپا اُداس دل کے ساتھ اپنے پُرانے دھرانے کپڑے اور بچا کچھا سامان مختلف گٹھڑیوں میں باندھنے میں مصروف تھیں۔

''امی......'' نسیمہ نے گہری خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

''جی...... جی میری بچی کہو......'' فریدہ خالہ نے اپنے اداس چہرے سے سوچ کے آثار کو ختم کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''امی...... امی اب ہم کہاں جائیں گے۔ ہماری تو ابو بھی نہیں ہیں اور نہ ہی بھائی...... چاچا ہمیں پسند نہیں کرتے، امی چچا ہمیں اپنے گھر میں کیوں نہیں رکھتے۔ ان کے اپنے گھر میں بہت بڑے بڑے کمرے ہیں، مگر ہمارے لیے ان کے گھر میں ذرا بھی جگہ نہیں ہے۔ کاش میرے بھی ابو اور بھائی ہوتے، کاش ہمارا بھی اپنا گھر ہوتا تو میں...... میں خوب پڑھتی لکھتی اور کبھی بھی اپنے ابو کو دُکھ نہیں دیتی۔'' نسیمہ نے پھر سے اپنا آنسو بہاتے ہوئے بے قراری سے کہا۔

''چپ ہو جاؤ میری بچی، جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے، مجھے یقین ہے کہ تمہارا بھائی اپنے کیے پر پچھتاتے ہوئے ضرور واپس آجائے گا اور پھر دیکھنا تمہارا بھائی ہمارے لیے دنیا بھر کی خوشیاں جمع کردے گا، غم نہ کرو میری بچی جہاں ایک دَر بند ہوتا ہے وہاں رب کی طرف سے پچاسوں دَر کھل جاتے ہیں۔

''امی، عابد چچا کو ہم پر ذرا بھی ترس نہیں آرہا، کیوں زبردستی مکان خالی کروا رہے ہیں۔ اگر ہمارے پاس پیسے نہیں تو ہم کیا کریں، کہاں سے چوری کر کے لائیں......'' نسیمہ نے ناراضی سے کہا۔

''میری بچی وہ خود مالکوں کے ہاتھوں مجبور ہیں، ویسے بھی ہم نے کون سے چار مہینوں سے کرائے کے پیسے دے دیے ہیں۔'' فریدہ خالہ نے کہا۔

''مگر اب ہم جائیں گے کہاں؟ ہمارے تو کوئی سگے ماموں بھی نہیں ہیں، کاش میرے کوئی سگے ماموں ہی ہوتے۔ امی میری سہیلی عشرت کے ابو حادثے میں مارے گئے تو اس کی امی اور وہ ہماری طرح بے سہارا ہو گئے تھے، مگر اب اس کے ماموں

ہے۔'' نسیمہ نے اُداسی سے کہا۔

''میری بچی کون اپنی چھت اور چار دیواری چھوڑنا چاہتا ہے، مگر ہم مجبور ہیں۔ انہیں نقد رقم کی ضرورت ہے اور میں اتنی سی رقم کے لیے اپنا قیمتی زیور کوڑیوں کے دام بالکل نہیں بیچ سکتی، اور ہاں تم زیور کا کسی سے تذکرہ بھی نہیں کرنا......'' فریدہ خالہ نے سختی سے کہا۔ اچانک ہی باہر سے گولیاں چلنے کی آواز سے دونوں ماں بیٹی چونک گئیں۔ نسیمہ تو دوڑ کر فوراً ہی اپنی ماں سے جا لپٹی۔

انہیں کراچی لے گئے ہیں اور اب وہ وہاں بہت خوش ہیں۔'' نسیمہ نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اوہو...... اب تم کیا سوچنے بیٹھ گئی ہو، سامان ایک طرف رکھو اور سونے کی کوشش کرو، صبح جلدی اٹھنا ہے۔'' فریدہ خالہ نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''امی......''

''جی...... جی میری بچی......''

''آپ اپنا زیور بیچ کیوں نہیں دیتیں، آخر وہ کس دن کام آئے گا۔ امی مجھے اپنا گھر بہت اچھا لگتا

اس سیاہ اندھیری رات میں اتنے قریب سے فائرنگ کی آواز نے انہیں انتہائی خوف زدہ کر دیا تھا۔

''اوہو، تم گھبرا کیوں رہی ہو؟''

''امی مجھے ان آوازوں سے ڈر لگتا ہے۔ اس دن بھی ایسی ہی گولیاں چل رہی تھیں اور ایک گولی ہمارے ابو کے آ لگی تھی۔'' نسیمہ نے سہمتے ہوئے کہا۔ گولیوں کی آواز سن کر باہر کتے بھی بھونکنے لگے تھے، پھر نجانے کیا سوچ کر دونوں ماں بیٹی باہر برآمدے میں چلی آئیں۔ فریدہ خالہ کے ہاتھ میں

ایک روشن لالٹین تھی۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ ایک سایہ پیچھے میدان کے راستے سے کود کر ان کے مکان میں آ دھمکا۔ سائے کو دیکھتے ہی دونوں ماں بیٹی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

''خبردار...... اگر کسی نے ہلنے اور آواز نکالنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔'' آنے والے نوجوان نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ اس وقت دونوں ماں بیٹی کے قدم جیسے زمین سے چپک گئے تھے اور وہ دونوں ہی موت کے خوف سے ساکت ہوگئی تھیں۔

آ...... آواز نہ نکلے، ورنہ دونوں کو ٹھنڈا کر دوں گا......'' یہ کہتے ہی وہ نوجوان خطرناک تیور لیے ان دونوں کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھی جس کی لبلبی میں شاید دونوں کی موت تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک بے ترتیب گٹھڑی تھی، جس میں زیورات کے بنڈل، پیکٹ اور دیگر قیمتی چیزیں لالٹین کی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھیں۔

''ارے تمہیں زخمی کس نے کیا ہے، کیا ہوا تمہیں...... ارے سب کیا ہے؟''

''خدا کے لیے مجھے پناہ دے دیں، چوکیدار اور پولیس میرا پیچھا کر رہے ہیں......'' آنے والے لڑکے نے عاجزی سے کہا۔

''ارے نوید...... میرے بیٹے، نوید تم، بیٹا یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے اور تمہیں زخمی کس نے کیا ہے؟''

فریدہ خالہ نے حیرت و خوشی کی کیفیت میں نوجوان کے قریب ہوتے ہوئے بے خوفی سے کہا۔

''میں نوید......؟'' نوجوان نے گھبراتے ہوئے خود سے سوال کیا۔

''ہاں بیٹا! تم ہی میرے نوید ہو۔ آج سے سات سال پہلے تم مجھ سے رُوٹھ کر چلے گئے تھے۔ نوید دیکھ...... دیکھو بیٹا، یہ تیری بہن نسیمہ ہے۔ اس نے کبھی بھی تیرے انتظار میں اپنی آنکھیں خشک نہیں ہونے دیں۔'' فریدہ خالہ نے زار و قطار روتے ہوئے نوید کو گلے لگالیا اور ڈھیروں دعائیں دیتی ہوئی دیوانی سی ہونے لگی۔

''امّاں...... جی...... ہاں میں ہی آپ کا نوید ہوں، مگر امّاں آپ مجھے فی الحال کہیں چھپا دیں۔'' نوجوان نے چالاکی اور مکاری سے، بوڑھی عورت کو فریب دیتے ہوئے کہا۔

''آؤ...... آؤ میری جان...... میری نظریں تو ہر وقت تیری ہی منتظر تھیں۔ نسیمہ دیکھ میری بچی، میں نہ کہتی تھی کہ تیرا بھائی ضرور آئے گا، دیکھ لی نا اس مالک کی مہربانی...... اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔'' فریدہ خالہ نے دیوانہ وار کہا۔

''بھائی جان! میں آپ کے انتظار میں بہت روئی ہوں...... بہت۔ اللہ نے آپ کو ہم سے پھر ملا دیا ہے، اب آپ ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جانا۔'' نسیمہ بھی روتی ہوئی اپنے بھائی کے گلے سے جا لگی۔

''میری بہن...... تیرے بغیر میں بھلا کون سا سُکھ سے رہا ہوں۔ میں نے بھی تیری یاد میں رو رو کر راتیں گزاری ہیں۔ زمانے کی ستم ظریفی اور اپنی اَنا نے میرے چہرے پر وہ کالک مل دی ہے جو ہزار آنسوؤں سے بھی نہیں ڈھل سکتی۔'' اس چالاک نوجوان نے پھر بناوٹی انداز سے نسیمہ سے کہا۔

''بیٹھو بیٹا! مجھے اپنی پیاسی آنکھیں تو ٹھنڈی کرنے دو۔ تمہاری جدائی کے بعد سے اب تک ان آنکھوں نے صرف آنسو ہی بہائے ہیں۔'' بوڑھی اور بے سہارا ماں نے آنے والے نوجوان کے مزید قریب ہوتے ہوئے کہا۔

''امّاں میں اپنے کیے پر آج تک نادم ہوں، اب تمہیں کسی قسم کی کوئی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اب اس بُرے فعل کو بھی چھوڑ دوں گا۔ کل صبح ہی ہم یہ شہر چھوڑ دیں گے اور باقی زندگی کسی اچھے سے

مکان میں رہ کر گزاریں گے، اماں مجھے تھوڑا سا پانی تو پلا دینا۔" نوجوان نے اپنی خشک زبان اپنے ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"نسیمہ...... اپنے بھائی کے لیے پانی تو لے آؤ۔"

"جی اماں......" کہتی ہوئی نسیمہ پانی لینے کے لیے چلی گئی۔

"بیٹا! میں سب کو کہتی تھی کہ میرا بیٹا نوید ضرور آئے گا۔ بیٹا اب ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جانا۔ تمہارے ابو کے انتقال کے بعد ہمیں تمہارے چچا اور پھر تائی اماں نے بھی گھر سے نکال دیا تھا۔ بیٹا ہماری جانوں پر بہت ظلم ہو چکے ہیں۔ ہم نے بہت فاقے کیے ہیں، لوگوں کے جھوٹے برتن مانجھے ہیں، تب کہیں جا کر یہ عارضی چھت نصیب ہوئی ہے۔ بیٹا اب اگر تم ہمیں چھوڑ کر گئے تو ہم جیتے جی ہی مر جائیں گے۔"

خالہ فریدہ نے روتے ہوئے اپنی دکھ بھری داستان سنائی۔ اچانک ہی دروازے پر زوروں کی دستک نے جیسے کہ گھر میں بھونچال پیدا کر دیا۔ آنے والے نوجوان کا چہرہ پہلے ہی خوف سے اٹا ہوا تھا، دستک سنتے ہی خوف سے کانپنے لگا۔ نسیمہ اور اس کی ماں کا دل بھی دھک سے رہ گیا۔ فریدہ خالہ نے فوراً ہی نوجوان کو ایک جانب اندھیرے میں چھپایا اور خود انتہائی حوصلے سے تیزی سے دروازے کی جانب بڑھیں۔

"کون ہے...... کون ہے بھائی۔"

"آپ کے یہاں کوئی چور تو نہیں آیا......"

باہر سے شاید چوکیدار جمعہ خان کی آواز آئی تھی۔

"بہن خیال رکھنا، میدان کے ساتھ والے بنگلے میں چوری ہوگئی ہے، ہم اسے تلاش کر رہے ہیں۔ اگر وہ تمہیں نظر آ جائے تو ہوشیار رہنا، کیوں کہ اس کے پاس ہتھیار بھی موجود ہے۔" چوکیدار نے انہیں بتایا۔

"تمہاری بڑی مہربانی بھائی...... ویسے ہم محتاط رہیں گے۔" یہ کہتے ہوئے خالہ دروازے کے پاس سے ہٹ کر تاریک کمرے کی طرف آ گئیں۔

"چلا گیا، کون تھا۔" نوجوان نے خوف سے آنکھیں سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"چوکیدار تھا، مگر اب تم گھبراؤ نہیں۔ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا، کیوں کہ یہاں سب کو معلوم ہے کہ ہم رات دیر سے سوتے ہیں۔"

"تم نے کھانا کھایا......؟"

"ہاں میں کھانا کھا چکا ہوں۔"

"ہم نے یہ مکان کرائے پر لیا تھا، اب ہمیں مالک بہت پریشان کر رہا ہے۔ تین مہینے سے ہم کرایہ بھی نہ دے سکے ہیں۔ تمہارے ابو کے دیے ہوئے کچھ زیورات ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ تم دونوں ہی میرا کل زیور ہو، تم انہیں بیچ ڈالو، کیوں کہ مجھے تو ویسے بھی سونے کے بھاؤ تاؤ کا کوئی علم نہیں ہے۔"

"زیورات......" نوجوان نے حیرت سے کہا۔

"ہاں بیٹا! بہت سی چیزیں ہیں، جنہیں پڑے پڑے گھن لگ رہا ہے، میری آرزو تھی کہ اگر تم ملے تو وہ تمام زیورات تمہارے ہاتھوں فروخت کراؤں گی۔" فریدہ خالہ نے خوشی سے کہا۔

"اماں زیورات کہاں ہیں......؟" نوجوان نے چالاکی اور بھولپن سے پوچھا۔

"صبح دیکھ لینا میری جان، اب تو وہ تمہاری ہی امانت ہے۔" خالہ نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں۔" نوجوان نے قسمت کی ستم ظریفی پر خود کو کوستے ہوئے کہا۔

"اب تم سو جاؤ، میں کل صبح ہی تمہیں وہ تمام زیورات دے دوں گی۔"

"اماں...... اماں خدا کے لیے مجھے معاف کر دینا۔ میں نے آپ کا بہت دل دکھایا ہے، میری بہن تم بھی مجھے معاف کر دینا۔ میں آئندہ کے لیے

بُرے افعال سے توبہ کرتا ہوں۔‘‘ نوجوان نے مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

’’میں نے تمہیں معاف کر دیا میرے بچے۔‘‘ فریدہ خالہ نے بھی آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

’’اب تم سو جاؤ، میں صبح تمہیں جلدی اٹھا دوں گی، تا کہ تم شہر جا کر جلدی واپس آسکو۔‘‘

’’ٹھیک ہے اماں......‘‘ یہ کہتے ہی نوجوان نے پستول اپنے نیفے میں لگائی اور ساتھ لائی ہوئی گٹھڑی ایک جانب رکھی اور قریبی فرش پر آلیٹا، جس پر پہلے ہی سے بستر لگا ہوا تھا۔ اس کے لیٹتے ہی دونوں ماں بیٹی بھی اپنے بستر پر لیٹ گئی تھیں۔

☆......☆

نوجوان نے لیٹتے ہی دل و دماغ میں بوڑھی عورت کو لوٹنے کا پروگرام بنانا شروع کر دیا۔ وہ چاہتا تو دونوں ماں بیٹی کو جان سے مار سکتا تھا، مگر ایسے حالات میں اسے وہ تمام زیورات نہیں مل سکتے تھے جو بوڑھی عورت نے نجانے کہاں چھپائے ہوئے تھے۔ وہ آج اپنی قسمت پر حیرت زدہ تھا۔ بنگلے سے وہ کامیابی کے بعد صاف نکل گیا تھا اور اب قسمت کی دیوی نے اس اس خزانے میں لا دھکیلا تھا کہ جہاں صبح ہوتے ہی ایک بے وقوف عورت اسے اپنا بیٹا جان کر زیورات دینے والی تھی، اسے اپنی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ صبح زیورات ملنے کی خوشی میں اس کے چہرے پر رونق آگئی تھی اور اسے دولت کا انبار اپنے قریب پڑے ہوئے محسوس ہو رہا تھا۔ خوشی کی حالت میں اس نے کروٹ بدلی اور بے خوفی سے سونے کی کوشش کرنے لگا، کیوں کہ اسے یقین تھا کہ باہر پولیس اور چوکیدار ضرور اسے تلاش کر رہے ہوں گے اور دوسرا یہ بھی کہ دونوں ماں بیٹی کو بے وقوف بنا کر وہ خود کو محفوظ کر چکا تھا۔

رات نجانے کون سے پہر فریدہ خالہ نے اس نوجوان کو اٹھایا تو نوجوان گھبراتا اور آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

’’اماں خیر تو ہے، کیا وقت ہو رہا ہے......؟‘‘

’’معلوم نہیں بیٹا! ویسے اب صبح ہونے میں تھوڑی ہی دیر باقی ہے...... جلدی اٹھو، میں نسیمہ کو بھی اٹھاتی ہوں، وہ تمہیں ناشتا بنا دے گی۔‘‘

’’اماں اتنی جلدی اٹھانے اور ناشتا کرانے کی کیا ضرورت ہے، خوامخواہ بہن کی نیند خراب ہوگی۔‘‘

’’ہماری فکر نہ کرو، یہ ہماری روز کی عادت ہے۔‘‘ فریدہ خالہ نے برجستہ کہا تو نسیمہ نے اٹھتے ہی چڑچڑاتے ہوئے انگڑائی لی تھی اور اٹھ کر برآمدے میں آگئی، جبکہ نوجوان منہ ہاتھ دھونے کے لیے صراحی کے قریب آبیٹھا۔ انہوں نے اپنے تمام زیورات کے بنڈل کھول کھول کر اس طرح زمین پر سجانا شروع کر دیے کہ جیسے ان کی نمائش کر رہی ہوں۔ آج وہ بے انتہا خوش تھیں۔ نوجوان جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا اس نے آتے ہی کہا۔

’’اماں یہ آپ کیا کر رہی ہو......؟‘‘

’’بیٹا، تمہاری امانت تمہیں دکھا رہی ہوں دیکھو۔ دیکھو تمہارے باپ نے تمہارے لیے کتنا کچھ چھوڑا ہے۔‘‘ نوجوان نے زیورات کے بنڈلوں پر نظر ڈالی تو حیرت میں ڈوبتا ہی چلا گیا۔ ایک ڈبے میں سونے کا رانی ہار تھا، دوسرے میں ٹیکا، ایک سیٹ جھومر، آٹھ عدد سونے کی چوڑیاں، سونے کا تاج، ایکس انگوٹھیاں، نو پازیبیں، سونے کا پنجہ، دو عدد ناک کی نتھ، گلوبند اور...... اور نجانے کیا کیا چیزیں زمین پر سجائی ہوئی تھیں کہ جیسے آج ان کی نیلامی کا دن ہو۔ نوجوان اتنے قیمتی زیورات دیکھ کر حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا۔ اسے ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

’’بیٹا! یہ سب تیری امانت ہے یہ...... یہ دیکھ۔ یہ جو چوڑیاں ہیں نا، یہ تیری پیدائش پر تیرے باپ نے خوشی میں دی تھیں اور جب تک وہ زندہ رہے، ہر

سال ایک انگوٹھی دیتے رہے۔ بیٹا اب تم ہی میرا سہارا اور میری اُمنگوں کی نشانی ہو۔ میں صبح بھی یہ چیزیں تمہیں دے سکتی تھی، مگر چوری ہونے کا ڈر ہر وقت مجھ پر سوار رہتا ہے، اسی لیے میں نے تمہیں رات کے اس پہر تکلیف دی۔'' اس وقت نوجوان حیرت کا مجسمہ بنے ان زیورات کو تکتا رہا جو لالٹین کی مدھم سی روشنی میں جھل مل کر رہے تھے۔ تمام زیورات کے ڈبوں پر مٹی جمی ہوئی تھی۔ اس کے خیال میں یہ تمام زیورات تقریباً دس لاکھ روپے سے اوپر کے تھے۔ نوجوان نے رانی ہار کو اٹھا کر دیکھا اور دل ہی دل میں اپنی قسمت پر رشک کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ کوئی اپنی اولاد کی خاطر اتنا بڑا دھوکہ کھا سکتا ہے۔ تمام زیورات دکھا کر فریدہ خالہ نے تمام بنڈل بند کر دیے اور ایک بڑی سی گٹھڑی میں باندھ کر اس نوجوان کے سرہانے رکھ دیے۔ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر سورج نکلنے کے ساتھ ہی تینوں نے ناشتا کیا، پھر فریدہ خالہ نے وہ گٹھڑی نوجوان کے سپرد کرتے ہوئے بولیں۔

''بیٹا رقم ذرا بڑی ہو گی ذرا خیال سے لانا۔ دل تو کہتا ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں، مگر نسیمہ اکیلی رہ جائے گی اور ہاں ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا۔''

''اماں آپ میری ان چیزوں کو سنبھال کر رکھنا......''

نوجوان نے بے فکری سے کہا اور خود سے گویا ہوا۔

''ان دس بارہ لاکھ روپے کے زیورات کے آگے بھلا ان تین چار لاکھ روپے کے زیورات کی کیا اہمیت ہے اور اگر میں نے وہ کچھ بھی لے جانے کی کوشش کی تو ہو سکتا ہے کہ بڑھیا کو مجھ پر شک ہو جائے۔ یہ سوچتے ہوئے نوجوان نے اپنے چوری کے تمام زیورات کو چھوڑا اور فریدہ خالہ کو خدا حافظ کہتا ہوا باہر بازار کی جانب بڑھ گیا۔ دونوں ماں بیٹی انتہائی خوشی و مسرت سے اسے رخصت ہوتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ جب نوجوان کافی دور نکل گیا تو فریدہ خالہ کمرے میں چلی آئیں۔ ان کے پیچھے نسیمہ بھی چلی آگئی۔

''اماں......'' نسیمہ نے کہا۔

''جی میری بچی کہو......''

''آپ تو کہتی تھیں کہ میرا بھائی ایک پیر سے لنگڑا کر چلتا تھا! مگر......''

''ہاں بیٹی میں نے صحیح کہا تھا......'' فریدہ خالہ نے برجستہ جواب دیا۔

''مگر وہ تو بالکل صحیح تھا، پھر آپ نے اسے میرا بھائی جان کر اپنا سب کچھ کیوں دے دیا۔'' نسیمہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''تم یہی کہنا چاہ رہی ہو نا کہ میں نے اسے اپنا جان کر سب کچھ کیوں دے دیا، تو سُنو میری بچی...... وہ تمہارا بھائی نہیں تھا، بلکہ چور ہی تھا۔''

''ہیں...... ایں...... وہ چور تھا اس کے باوجود آپ نے اسے اپنے زیورات دے دیے مگر...... مگر کیوں......؟''

''اگر میں اسے پناہ نہ دیتی تو وہ تمام زیورات میرے ہاتھ سے نکل جاتے جو وہ چُرا کر لایا تھا اور جنہیں میں ایک ہی نظر میں دیکھ چکی تھی۔''

''مگر آپ نے اسے اپنے قیمتی زیورات کیوں دیے......؟''

''اری میری بچی! وہ اصلی زیورات تھوڑی ہی تھے، بلکہ ایک دو کے علاوہ وہ سب کے سب چاندی کے تھے، جن پر میں نے سونے کا پانی چڑھوا دیا تھا، اسی لیے میں نے اسے جانے دیا، کیوں کہ اصل زیورات وہ چالاک بننے کے چکر میں یہیں چھوڑ گیا ہے۔ اب بول سودا مہنگا رہا یا...... اور اب ذرا جلدی کرو، ہمیں ابھی ابھی یہ مکان خالی کرنا ہے۔'' فریدہ خالہ نے کہا اور گھبراتی اور مسکراتی ہوئی کمرے میں جا گھسی۔

☆......☆

ناولٹ

صائمہ حیدر

مریم فاطمہ

''تم نہیں جانتیں ڈیڈی کو! انہوں نے مجھے کس دلدل میں دھنسا دیا ہے۔ ایک طرف میری ماں ہے اور ایک طرف میری قربانی۔ نیلوفر کی خوشیوں کے بدلے میں انہوں نے میری ماں کی خوشیوں کا سودا کیا ہے۔'' اُس نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں۔ ''ہادی! تو پھر تم اس......

ایک دوشیزہ کی ثابت قدمی سے جڑا، ایک خاص ناولٹ

وہ نیچر سے محبت کرتی تھی اور فطرت میں چرند، پرند آسمان، انسان سب ہی شامل ہیں وہ بولتی تو

سامعین کو مجبور کر دیتی، لکھتی تو پڑھنے والے کو لگتا کہ سب کچھ اُس کے ساتھ، اُس کی نظروں کے سامنے ہو رہا ہے۔ وہ ساحر تھی یا کوئی جادوگر! مگر سادگی کے باوجود اُس کے حسن میں مقدس مریم کی جھلک تھی۔ پاک و پاکیزہ، دھلا دھلایا، صبیح چہرہ جو ہر وقت سوچتا اور مسکراتا رہتا تھا۔ وہ اپنے ہر غم کو چھپانے کی عادی تھی دوسروں کی تکلیفیں اُس سے برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ ایسے میں وہ مسیحا بن جاتی تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کے لیے بہت حساس دل رکھتی تھی اس لیے وہ محنت کی چکی میں پس کر کندن بننا چاہتی تھی تاکہ آنے والا کل خوش آئند ہو۔ (ابھی بھی وہ نیوز لائن کی ایڈیٹر نورین اظہر کے سامنے بیٹھی اور انہیں اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی)

''اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں ہے کہ 'وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ' مگر آج بھی ہمارے جیسے ترقی پذیر ملک میں ان کی خوبصورتی اور ان کے حقوق کچلے جا رہے ہیں۔ بہت

سارے معاملات میں اُن کے ساتھ ناانصافی برتی جارہی ہے۔ پاکستان میں حقوق کے حوالے سے آگاہی فراہم کرنے کے لیے تعلیم کو فروغ دینا ہوگا۔ اب تک نہ تو خواتین کو ان کے حقوق دیے جارہے ہیں اور نہ ہی معاشرے میں عزت واحترام اور تحفظ حاصل ہے۔ ہمیں اِس طرح کے موضوعات پر کام کرنا ہوگا۔'' نورین اظہر کے ماتھے پر چند بوندیں پسینے کی دکھائی دے رہی تھیں، پھر وہ مصلحتاً بولیں۔

''دیکھیں مریم فاطمہ! ہم جانتے ہیں آپ درست کہہ رہی ہیں۔ مگر اب وہی موضوعات پڑھے اور دیکھے جاتے ہیں جنہیں عورت کو مظلومیت کی تصویر بنا کر پیش کیا جاتا ہے یا پھر سجا سنوار کر پیش کیا جاتا ہے۔'' نورین اظہر نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

''عورت محض چہرہ تو نہیں ہے اُس کے پاس بھی دماغ ہے وہ بھی زندگی کی شاہراہ پر کامیابیاں حاصل کرنا چاہتی ہے۔ مگر یہ معاشرہ اُس کو اشتہاری ماڈل یا پاؤں کی جوتی سے زیادہ کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتا ہے۔'' مریم فاطمہ ابھی بھی اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔

''دیکھو مریم! اہم وجہ یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بھی اس اسلامی اور جمہوری ملک میں نہ تو عورت کو حقوق دیے گئے اور نہ ہی اُسے معاشرے میں باعزت مقام دیا گیا، جس کی وہ حقدار ہے۔ آج ہم اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا۔'' نورین اظہر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''آپ جانتی ہیں اس وقت ہمارا میڈیا! اس ضمن میں بہت ہی مثبت کردار ادا کرسکتا ہے۔ لوگوں کو آگاہی فراہم کرسکتا ہے، مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ پاکستان میں تعلیم کی شرح کم ہونے کی وجہ سے پاکستانی خواتین کو پتا ہی نہیں ہے کہ اُن کے حقوق کیا ہیں؟ کیوں؟ ایسا کیوں ہے؟ ہم اپنے پڑوسی ملک کی اندھی تقلید میں کیوں سرپٹ دوڑتے چلے جارہے ہیں؟ اپنے انجام سے بے خبر، عورت کی آج جو تصویر ہے، اگلے چند سالوں میں وہ اس سے بھی زیادہ بھیانک ہوجائے گی۔'' مریم جذباتی ہورہی تھی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم! یہ ہم سب کی ذمہ داری ہے، خاص طور پر میڈیا کی، کہ لوگوں میں شعور بیدار کرے کہ عورت بھی اُن ہی کی طرح انسان ہے۔ جب اِس ملک کی نصف سے زیادہ آبادی گھروں میں محصور کردی جائے گی، تو معاشرے کا کیا حال ہوگا؟ ہمیں معاشرے کی سوچ کو بدلنا ہوگا۔'' نورین اظہر نے مریم کی بات سے اتفاق کیا۔

''مجھے تو لگ رہا ہے تمہارا عورتوں کے حقوق پر لکھا جانے والا یہ فیچر بہت مقبول ہوگا۔'' کچھ توقف کے بعد نورین اظہر نے مریم فاطمہ کے فیچر کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔

''محنت تو کرتی ہوں، آگے اللہ کی مرضی ہے! میرے Dues کلیئر کروادیں۔ مجھے اپنے والد کے لیے دوائیں لینی ہیں۔ ہماری بحث تو ختم نہیں ہوگی۔'' مریم نے چائے کا گھونٹ بھرتے نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''Sure میں ابھی کرواتی ہوں۔'' نورین اظہر نے ایک چیک اُٹھا کر مریم کی طرف بڑھایا تھا۔

''پھر کب آؤ گی؟ تم سے بحث مباحثہ کرکے میری بھی Knowledge میں اضافہ ہوتا ہے۔'' نورین اظہر نے خوشدلی سے کہا۔

''بہت جلد!'' مریم فاطمہ مصافحہ کرتی ہوئی نورین اظہر کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

اُن دونوں کی جب بھی ملاقات ہوتی، کسی نہ کسی موضوع پر یونہی بحث شروع ہوجاتی تھی اور آخر میں

مریم فاطمہ اپنے مضبوط دلائل سے نورین اظہر کو قائل کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتی تھی۔ نورین اظہر اور مریم فاطمہ کا رشتہ، اتنا ہی پرانا تھا جتنے عرصے سے مریم نے نورین کے میگزین میں آرٹیکلز اور فیچرز لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مریم کی کئی تحریروں کے ناقابلِ اشاعت قرار دیے جانے کے بعد نورین اظہر اُس کی ثابت قدمی کی معترف ہوگئی تھی۔ وہ اپنی غلطیوں سے سیکھتی جارہی تھی اور اب یہ عالم تھا کہ نورین اظہر باقاعدہ اُس کو فون کر کے اُس سے لکھنے کا کہتی تھی اور مریم ہر مرتبہ کی طرح ایک نیا اور اچھوتا موضوع لے کر آتی اور میگزین میں اُسے جگہ مل جاتی۔ یہ کامیابی کی طرف بڑھتا ہوا اُس کا پہلا قدم تھا۔

☆......☆......☆

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آفس سے باہر آرہی تھی، تب ہی ایک کار اُس کے سامنے رُک گئی تھی۔ اُس نے ڈرائیونگ سیٹ پر نگاہ دوڑائی وہاں ہادی بیٹھا تھا۔ ہادی عباس اُس کی پھوپی کا بیٹا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اُس نے حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے کہا۔

''بیٹھو تو کیا ساری باتیں روڈ پر ہی کرلوگی؟'' ہادی نے فوراً فرنٹ ڈور کھولا۔

''یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟'' ہادی نے مریم کے بیٹھتے ہی بغور اُس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''بس کچھ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔'' مریم نے اپنا سر دباتے ہوئے کہا۔

''ماموں کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' اُس نے اسٹیئرنگ گھمایا۔

''پہلے سے بہتر ہے۔ مجھے اُن کے لیے دوائیں لینی ہیں، تم مجھے کسی میڈیکل اسٹور پر چھوڑ دو۔''

''دوائیں ہم لے لیتے ہیں۔ پھر گھر چلتے ہیں۔ مام تمہیں یاد کر رہی تھیں۔ وہاں چائے پی لینا، سر کا درد بھی صحیح ہو جائے گا۔'' ہادی نے اُسے مشورہ دیا۔

''نہیں! آج نہیں ہادی! پھر کبھی سہی۔ آج تو تم مجھے گھر پر ہی چھوڑ دو۔ تم اپنی سناؤ آج کل کیا کر رہے ہو؟'' مریم نے اپنی مجبوری سے ہادی کو آگاہ کیا۔

''کچھ نہیں، بس وہی کاروباری اُلجھنیں ہیں۔ ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھنے کا خواب ہے۔ کچھ خاص تو نہیں۔'' اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کتنی عجیب بات ہے ناں! ہر کسی کے اپنے اپنے خواب ہوتے ہیں۔ کسی کو اپنے خوابوں کی تعبیر بہت جلد مل جاتی ہے اور کچھ لوگ اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے اپنی ساری عمر اُن کے پیچھے بھاگتے ہوئے گنوا دیتے ہیں۔''

''ہونہہ! پھر مایوسی، تم کبھی ہنستی بھی ہو یا پھر یونہی ارسطو اور سقراط کی طرح فلسفہ بگھارتی رہتی ہو؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے؟'' اُس نے سوال داغا۔

''یہی کہ تم انتہائی نامعقول اور موڈی خاتون ہو۔'' ہادی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''شاید تم سچ کہہ رہے ہو؟ جو چیز آسانی سے ہاتھ لگ جائے اُس کے خاص ہونے کا احساس جاتا رہتا ہے۔'' مریم نے دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔

''میں خاص ہوں یا عام؟'' ہادی نے اپنے اندر اٹھنے والے طوفان کو دباتے ہوئے پوچھا۔

''It Demends On۔'' مریم نے رسانیت سے جواب دیا۔

''Me۔ ویسے ایک بات تو طے ہے، تمہارا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے۔'' ہادی نے غصیلے انداز سے

کہا۔

''میڈیکل اسٹور آگیا ہے لاؤ (نسخہ) Prescription دو۔ میں دوائیں لے آتا ہوں'' ہادی نے اپنی کار کو میڈیکل اسٹور کے سامنے روکا۔

''یہ لو نسخہ اور یہ ہیں پیسے۔'' مریم نے نسخہ اور پیسے ہادی کی طرف بڑھائے۔

''پیسے رکھو! پیسے ہیں میرے پاس۔''

''میں جانتی ہوں تم بہت پیسے والے ہو۔ پھر نسخہ بھی واپس کردو۔ میں دوائیں خود لے لوں گی۔''

''اچھا لاؤ دو، پتا نہیں کیا سمجھتی ہو اپنے آپ کو۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا دوائیں لینے اُتر گیا تھا۔

☆......☆......☆

مریم فاطمہ کے علاوہ اُس کی دو بہنیں اور تھیں۔ ایک بوڑھا بیمار باپ تھا اور ایک زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں جتی رہنے والی اُس کی ماں تھی۔

فاضل صاحب کی پنشن سے گزارہ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اُس کی ماں کلثوم جہاں اور ایک چھوٹی بہن فردیٰ شام میں ٹیوشن پڑھاتی تھیں۔ جبکہ وہ خود صبح ایک اسکول میں پڑھاتی تھی اور شام کو فیچرز اور مضامین لکھتی تھی۔ دوسری بہن ابیہا گھریلو اُمور سنبھالتی تھی۔ مریم کو اپنے آپ پر امید اور بھروسہ تھا کہ کبھی وہ بھی اِس معاشرے کی کامیاب عورت بن سکے گی اور اپنے خاندان کی کفالت کر پائے گی۔

مگر اپنے نظریات اور دشوار طلب خیالات کی پیروی کرتے رہنے کی شدید خواہش اُس کی رہنما تھی۔ وہ مجسم خودداری تھی، اپنی قدر و قیمت کا تخمینہ خود اُس کی نظر میں بہت تھا۔

مریم اور ہادی گھر پر اترے تو سامنے ہی لان میں اُن کی کزن نیلوفر کھڑی تھی۔ ہادی کو دیکھ وہ مسکرا اُٹھی۔

''کیا حال ہیں بھئی! آپ تو بڑے مصروف ہوگئے ہیں؟'' نیلوفر نے ہادی کو دیکھ کر سلام کرنے کے بعد کہا۔

''بڑے بُرے حال ہیں۔ نہ پوچھو! بڑی مشکل سے راستہ کٹا ہے۔'' ہادی نے مریم کو دیکھ کر بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''چلیں! میں آپ کو اچھی سی چائے پلاتی ہوں۔ مریم تم بھی آجاؤ، تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔'' نیلوفر نے اپنے ریشمی بالوں کی لٹ کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''نہیں! تم لوگ چائے پیو۔ میں ابا کو دوائیں دے دوں۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' مریم نے عذر پیش کیا اور اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

''ہادی! چلیں چائے پئیں۔''

''ہاں بالکل! میں تو پیوں گا، چائے ویسے مس پرفیکٹ کو آفر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' ہادی نے نیلوفر کو ہلکے سے ڈپٹا۔

''آپ بھی حد کرتے ہیں۔'' وہ مسکراتی، ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی ہادی کے ساتھ گھر کے اندرونی حصے کی طرف چل دی تھی۔

فاضل ہمدانی اور کمال ہمدانی دونوں سگے بھائی تھے جبکہ ہادی کی والدہ زینت خاتون اُن کی بہن تھیں۔ فاضل ہمدانی بڑے بھائی تھے، مگر بیماری کی وجہ سے اُن کے حالات بگڑتے ہی چلے گئے تھے اور وہ اپنا مکان بیچ کر اپنے والد کے گھر کے پچھلے پورشن میں اپنی تین بیٹیوں اور بیوی کو لے کر شفٹ ہوگئے تھے۔ کمال ہمدانی کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹی نیلوفر تھی جو اپنے نام کی طرح خوبصورت تھی اور اُن کا بیٹا آدرش ہمدانی بیرون ملک زیر تعلیم تھا۔ ہادی کی فیملی بھی اُسی علاقے کے ایک بنگلے میں رہائش پذیر تھی ہادی کے والد احسن عباس ایک بارسوخ

کاروباری شخصیت تھے۔ اُن کا بزنس دوسرے ممالک میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ گھر میں روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ احسن عباس اپنے گھریلو اور کاروباری معاملات میں اُس ضدی اور مطلق العنان شخص کی طرح تھے جو کسی کے مشورے کو نہیں مانتا۔ زینت خاتون کو کمال ہمدانی سے مراسم رکھنے کی اجازت تھی مگر احسن عباس اُن کو فاضل ہمدانی سے دور رہنے کا مشورہ دیتے تھے۔

مریم فاطمہ کی ماں کلثوم جہاں اور اُس کی بہن فروی صحن میں بیٹھے تخت کے سامنے ایک دری بچھا کر اُس پر بچوں کو ٹیوشن پڑھا رہی تھیں جبکہ دوسری بہن ایبہا کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھی۔

''جاذب اور نعمان جلدی جلدی ٹیبل یاد کرو پھر تم لوگوں کو اردو کے املا کی بھی تیاری کروانی ہے۔'' اُس کی بہن فروی نے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے ہوئے مخاطب کیا۔

''بیٹا! اِن کی ہوم ورک ڈائری بھی دیکھ لینا اِن کا Monday سے Test Week شروع ہونے والا ہے۔'' مریم فاطمہ کی والدہ کلثوم جہاں نے فروی کو مطلع کیا۔

''ٹھیک ہے امی آپ ابوذر اور علینہ کو دیکھ لیں، یہ دونوں بڑے Typical بچے ہیں۔ اِن کو کچھ یاد ہی نہیں ہوتا ہے، Duffors کہیں کے۔''

''نہیں بیٹا ایسے تھوڑا ہی کہتے ہیں۔ بچے تو اللہ کا سب سے خوبصورت تحفہ ہوتے ہیں۔ وہ تو پانی کی طرح ہوتے ہیں جس سانچے میں ڈالو ویسی ہی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ تم اِن کو پیار سے پڑھاؤ گی تو یہ بھی تمہاری عزت کریں گے۔'' کلثوم جہاں نے گویا بیٹی کو سمجھایا۔

کلثوم جہاں اور فروی کی باتیں کچن میں کھڑی ایبہا سُن رہی تھی پھر اُس نے مداخلت کی۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں امی! بچے تو واقعی میں بہت کیوٹ ہوتے ہیں اِس کو دیکھو علینہ کو بالکل 'فیری' لگتی ہے۔'' ایبہا نے علینہ کو گود میں بٹھا کر پیار کیا۔

''امی آج کھانے میں کیا بناؤں؟'' ایبہا نے ماں سے پوچھا۔

''امی آج چکن کڑاہی بنوالیں ناں، کتنے دن ہوگئے ہیں گوشت کھائے ہوئے۔'' فروی نے للچاتے ہوئے مشورہ دیا۔

''لو! اور سُنو اِس لڑکی کی! مہینے کا آخر ہے بیٹا ہم چکن کڑاہی ابھی کہاں Afford کر سکتے ہیں؟'' کلثوم جہاں نے بیٹی کو سمجھایا۔

''ایبہا! بیٹا تم ایسا کرو کوئی سی سبزی اور دال بنالو اور ہاں ایسا بنانا کے کل دوپہر تک پورا ہو جائے۔ بلکہ ایسا کرو مجھے سبزی دے دو میں تمہیں کاٹ کر دے دیتی ہوں اور ساتھ میں بچوں کو پڑھاتی رہوں گی۔''

ایبہا نے کچن سے جا کر بھنڈی کی ٹوکری ایک پیالہ اور چھری ماں کے آگے رکھ دیا تھا جبکہ فروی پڑھانے میں مصروف ہوگئی تھی۔ سبزی کاٹتے ہوئے کلثوم جہاں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! یہ مریم کہاں ہے نظر نہیں آرہی ہے؟''

''امی وہ ابا کے ساتھ بیٹھی کسی ادیب، شاعر یا کالم نگار پر تبصرہ کر رہی ہوگی یا پھر پاکستان کے حالات کے پیشِ نظر کچھ لکھنے بیٹھ گئی ہوگی۔ بس ہر وقت کام کام...... یہ لڑکی تھک نہیں جاتی اتنے کام سے۔'' ایبہا بڑبڑائی۔

''ہوں! ٹھیک کہا تم نے، خدا میری بچی کو کامیابی دے، بہت محنت کرتی ہے وہ ہم سب کے لیے دیکھنا ایک دن بہت کامیاب انسان بنے گی۔ جو دوسروں کے بارے میں سوچتے ہیں، اپنی زندگی اُن

کے لیے وقف کرتے ہیں، خدا اُن کے لیے ہر رکاوٹ کو دور کر دیتا ہے۔'' کلثوم جہاں نے آسمان کی طرف بھروسے سے دیکھتے ہوئے بیٹی کو دعا دی۔

☆......☆......☆

مریم فاطمہ ہاتھ میں چند کتابیں اور بیگ میں آرٹیکل لے کر تیزی سے قدم اٹھاتی اپنی پھوپی کے گھر کی طرف رواں دواں تھی۔ اُسے ہادی کا بس یہی جملہ یاد آرہا تھا۔'' مام تمہیں یاد کر رہی ہیں۔'' اُسے اپنی پھوپی کی مجبوری اور بے بسی کا احساس تھا۔ اُن پر پھوپا کی طرف سے پابندیاں تھیں اور وہ کسی نیک بیوی کی طرح اُن کی حکم عدولی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ گھر میں داخل ہوتے ہی زینت خاتون کو سلام کر کے اُن کے گلے سے لپٹ گئی تھی اور زینت خاتون اُس کی اچانک آمد پر خوشی سے مسکرا اٹھی تھیں۔

''اوہ میری گڑیا آئی ہے کیسی ہو؟ اتنے دنوں بعد پھوپی کی یاد آ ہی گئی ناں!'' زینت خاتون نے شکایت کی۔

''بس پھوپو آپ کو تو پتا ہے ناں میں کتنی بزی رہتی ہوں۔ پھر ابا کی بیماری ہم سب کی جان تو بس اُنہی میں اٹکی رہتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر اُداسی سی بکھر گئی تھی۔

''جانتی ہوں بیٹا میں تم سے شکایت تھوڑی کر رہی ہوں۔ بس کبھی کبھی آجایا کرو، میرا دل بہل جاتا ہے اور اسی بہانے بھائی کی طبیعت کا بھی پتا چل جاتا ہے۔''

''تو پھوپو! ہادی کے ساتھ آپ بھی کبھی آجایا کریں ناں۔'' اُس نے پھوپی کو مخلصانہ مشورہ دیا۔

''کیا بتاؤں بیٹا وہ بھی تو بہت مصروف رہتا ہے۔ پھر ایک گھر میں رہتے ہوئے ایک بھائی کے گھر جاؤں اور دوسرے کے گھر نہیں کچھ عجیب سا لگتا ہے۔''

''پھوپو آپ سے ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں پوچھو بیٹا!''

''جب یہ گھر دادی کا تھا تو پھر ابا اور چچا کا برابر کا حصہ ہوا ناں اُس گھر پر، پھر چچی نے ہمیں پچھلا پورشن کیوں دے رکھا ہے اور ہم سے ایسا برتاؤ کرتی ہیں جیسے یہ مکان وہ اپنے جہیز میں لے کر آئی ہوں۔''

''کیا کہہ سکتے ہیں! نادرہ کو شروع سے ہی اجارہ داری کا شوق رہا ہے۔ یہ ناانصافی ہے، مگر اُس کی زبان کی وجہ سے سب مجبور ہیں۔ خیر چھوڑو اِن باتوں کو یہ بتاؤ گھر میں سب کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہی ہیں۔'' اُس نے اُداسی سے جواب دیا۔

''پھوپا کیسے ہیں؟ کیا پھر کسی بزنس ٹرپ پر گئے ہوئے ہیں۔''

''ہاں اِس مرتبہ پورے دو ماہ کے لیے گئے ہیں۔ وہ ہوتے ہیں تو کون سا میرے پاس رہتے ہیں۔ کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر، پھر وہی تنہائی اور میں! ہادی صبح کا گیا رات کو آتا ہے۔ اگر شرفو بابا اور رضیہ نہ ہوں تو میں تو دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر ہی مر جاؤں۔'' زینت خاتون نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''نہیں پھوپو ایسا نہیں کہتے۔ ہم سب ہیں ناں آپ کے ساتھ۔'' مریم نے پھوپی کو گلے سے لگا لیا۔

''پھوپو! ہادی کہاں ہے؟ آج تو گھر پر ہوگا یا آج بھی کہیں نکل گئے ہیں حضرت!''

''نہیں نہیں آج تو گھر پر ہے۔ کمپیوٹر پر بیٹھا کچھ حساب کتاب کر رہا ہے، جاؤ تم مل لو اُس سے۔''

''ہاں میں جاتی ہوں۔'' مریم فاطمہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' مریم نے زور سے ہادی کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''ارے تم کب آئیں تمہیں کب سے سرپرائز دینے کا شوق ہوگیا ہے؟'' ہادی نے کمپیوٹر آف کرتے ہوئے کہا۔

''جب سے تم نے چھوڑا ہے۔''

''کیا ناراض ہو؟'' ہادی نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''میری اتنی جرأت!'' مریم نے اپنی اُداسی کو چھپاتے ہوئے جواب دیا۔ کچھ لمحوں تک دونوں خاموش رہے پھر ہادی نے قفل توڑا۔

کتنی دلکش ہے اُس کی خاموشی
ساری باتیں فضول ہوں جیسے

ہادی نے شعر پڑھا۔

''تم کچھ نہیں بتاؤ گی تو کیا میں کچھ سمجھ نہیں پاؤں گا۔''

''میں جانتی ہوں۔ تم میرے بنا کہے بھی سب کچھ سمجھ جاتے ہو۔ نیلو کے پاس گئے تھے؟''

''یہ کیسا سوال ہے؟'' ہادی چراغ پا ہوا۔

''اچھا چھوڑو یہ بتاؤ تم میرے لیے کتاب لائے؟''

''اوہ ہاں! میں تمہارے لیے کچھ بڑے جرنلسٹس کے کالمز کی کاپیز بھی لایا ہوں اور بڑی شخصیات سے کیے جانیوالے سوالات بھی ہیں تمہارا I.R تو مکمل ہوگیا ہے ناں؟''

''ہاں وہ تو ہوگیا ہے۔'' مریم نے خوشدلی سے جواب دیا۔

''ہادی! ThankYou۔'' مریم کی آنکھوں میں نمی سی اُتر آئی تھی۔

''تم مجھے کامیاب دیکھنا چاہتے ہو، تمہیں میرے اوپر بھروسہ تو ہے ناں؟''

''Of Course۔ بھروسہ ہے یار! بھروسہ نہیں بلکہ یقین ہے۔ تم ضرور ایک دن اپنا خواب پورا کرلوگی اور ہاں زندگی کے کسی بھی موڑ پر تمہیں کسی بھی مدد کی ضرورت پڑے تو ضرور مجھے آواز دے لینا۔ تم مجھے خود سے دور نہیں پاؤ گی۔'' ہادی نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔

''I Know ہادی۔''

☆......☆......☆

نیلوفر کی والدہ نادرہ خاتون ایک مشہورِ زمانہ فیشن ڈیزائنر تھیں اور ہادی کے والد احسن عباس کی سگی بہن تھیں۔ دونوں بھائی بہنوں کی فطرت میں یکسانیت تھی۔ دونوں ہی کاروباری فطرت کے تھے۔ نادرہ خاتون، فاضل ہمدانی کے خاندان کو کمتر ثابت کرنے کے لیے ہر حربہ آزماتی تھیں۔ مگر نیلوفر اُن سے یکسر مختلف تھی وہ سادہ مزاج اور پُر خلوص فطرت کی مالک تھی اور ہادی عباس کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ آج ہادی کی سالگرہ تھی وہ کافی دیر سے ہادی سے بات کر کے اُس کو وِش کرنا چاہ رہی تھی مگر دوسری طرف مستقل Engage کی ٹون آرہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا فون ہادی نے اٹھا ہی لیا تھا۔

''ہیلو میں تمہیں کال کر رہی تھی تمہارا نمبر بزی تھا۔'' نیلوفر نے جلتے سلگتے لہجے میں کہا۔

''اوہ مریم کا فون تھا وہ مجھے وِش کر رہی تھی۔''

''میں بھی تمہیں وش کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر خیر چھوڑو تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''تمہارا موڈ کیوں آف ہوگیا؟'' ہادی نے نیلوفر کے لہجے کی کڑواہٹ کو محسوس کیا تھا۔

''Leave It کہیں باہر چلیں؟'' نیلوفر نے تجویز پیش کی۔

''چلو مریم کو بھی لے لیتے ہیں۔'' ہادی نے

چہکتے ہوئے جواب دیا۔

''Sure اگر وہ راضی ہو جائے تب ناں!''

''ہو جائے گی۔ یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ فائنل ہونے پر میں تمہیں Text کرتا ہوں۔''

''اوکے!'' نیلوفر نے جبر کر کے مریم کے ساتھ جانے کی ہامی بھر لی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر نادرہ خاتون بیٹی کی گفتگو سن رہی تھیں۔

''کس کا فون تھا بیٹا؟'' نادرہ خاتون نے نیلوفر کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''ہادی تھا مما! مجھے جانا ہے ہادی کے ساتھ ڈنر کے لیے!''

''ہوں..... جاؤ بیٹا تم دونوں اکیلے جا رہے ہو ناں؟''

''نہیں وہ کہہ رہا ہے مریم کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔''

''وہ تم دونوں کے بیچ میں کیا کرے گی؟ ہادی سے کہو اگر وہ جائے گی تو تم نہیں جاؤ گی۔ یہ دو ٹکے کی لڑکی میرے بھتیجے کو پھانس رہی ہے۔'' نادرہ خاتون نے زہر خند لہجے میں کہا۔

''نو مما! ہادی کو یہ بات پسند نہیں آئے گی اور مریم ہرگز ایسی نہیں ہے۔''

''کیا تم چاہتی ہو وہ تمہارے ساتھ جائے؟'' نادرہ خاتون نے تیز آواز میں کہا۔

''نہیں مما میں تو صرف ہادی کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔''

'' اچھا تم تیار ہو جاؤ پنک اور وائٹ ایمبرائڈری والا سوٹ پہن لو اور اچھا سا میک اپ بھی کر لو۔ مریم نہ جائے یہ میں سنبھال لوں گی۔'' ماں کی بات سن کر نیلوفر مسکراتی ہوئی اپنی وارڈ روب کی طرف چل دی تھی۔

☆......☆......☆

مریم فاطمہ اپنے والد اور والدہ کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ پھر مریم نے اپنے دل کی بات اپنے والد سے کہی۔

''ابا عمرانہ توصیف نے آج پھر میری بنائی ہوئی رپورٹ کو ریجیکٹ کر دیا ہے۔''

''تو کوئی بات نہیں بیٹا! گرتے ہیں شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں۔ آج کی ناکامی ہی تمہیں کامیابی کا سبق سکھائے گی۔ دوبارہ لکھو اور ہمت نہ ہارو، بڑھتی رہو اس امید پر کہ ایک نہ ایک دن تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گی۔'' فاضل ہمدانی نے بیٹی کو سمجھایا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تمہارے ابا۔ مایوسی کفر ہے اور جو ڈر گیا سمجھو وہ مر گیا۔'' کلثوم جہاں نے بھی بیٹی کی ہمت بڑھانے کی کوشش کی۔

''اماں فروئی کی فیس کا انتظام ہوا؟''

''ہو جائے گا بیٹا! تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ تمہارے ابا کی پنشن آ گئی تھی میں نے سب سے پہلے اُس کی یونیورسٹی کی فیس جمع کروا دی تھی۔'' ماں نے گویا بیٹی کے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔

''ہاں راشن کی کہو! وہ بھی آ جائے گا بیٹا، فروئی کے اور میرے ٹیوشن کے پیسے آ گئے ہیں۔ اُس سے ہم راشن لے آئیں گے۔''

''ٹھیک ہے اماں! میری سیلری بھی آنے والی ہے پھر اُس سے ہم ضروری اخراجات پورے کر لیں گے۔ ابا کی دوائیں بھی ختم ہو گئی ہوں گی ناں!''

''ہاں دوائیں آپ کی کب تک کی ہیں؟'' کلثوم جہاں نے فاضل صاحب سے پوچھا۔

''ابھی دو دن کی ہیں بیٹا! تم کیوں فکر مند ہو رہی ہو۔ اللہ بہتر کرے گا۔ میں سوچتا ہوں کاش میں بیمار ہو کر بستر پر نہ لگتا تو میری بیوی اور بیٹیوں کو اتنی تکلیفیں نہ اٹھانی پڑتیں۔ ایک بوجھ بن کر رہ گیا ہوں

میں اور کچھ نہیں۔'' فاضل ہمدانی نے ایک سرد آہ بھری۔

''نہیں ابا! کیسی باتیں کررہے ہیں آپ؟ اللہ آپ کا سایا ہم پر ساری زندگی قائم رکھے۔ آپ کو صحت تندرستی دے۔ آپ نے بھی تو بچپن میں اپنی ضروریات کو پسِ پشت رکھ کر ہمیں پروان چڑھایا ہوگا، اب سمجھیں کہ ہماری باری ہے۔'' مریم فاطمہ نے باپ کو تسلی دی۔

''میری پیاری بیٹی۔'' فاضل ہمدانی نے مریم فاطمہ کے گال تھپتھپائے۔

''بیٹا تم چینل گئی تھیں جہاں بھابی نے بتایا تھا؟''

''ہاں اماں گئی تھی مگر وہاں وہ صاحب ہی نہیں تھے جن سے چچی نے مجھے ملنے کو کہا تھا۔ دو گھنٹے انتظار کرتی رہی، مگر وہ صاحب نہیں آئے۔ کل اتنا میرا ٹائم ویسٹ ہوا ہے ناں کہ بس! اور ہادی الگ ناراض ہوگیا ہے۔ کل اُس کا Birthday تھا۔ اُس نے مجھے ڈنر پر Invite کیا تھا اور میں آفس میں بور ہوتی رہی۔''

☆......☆......☆

احسن عباس اور زینت خاتون ٹی وی لاؤنج میں خوشگوار موڈ میں بیٹھے تھے۔ ٹیبل پر پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکرے رکھے ہوئے تھے۔ احسن عباس اور زینت خاتون کو دیکھ کر اندازہ ہورہا تھا کہ دونوں ہی بہت خوش ہیں۔ جب ہادی آفس سے گھر میں داخل ہوا تو اُس نے سوالیہ نظروں سے دونوں کی طرف اور ٹیبل پر رکھی مٹھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''خیریت تو ہے؟ یہ مٹھائی کس سلسلے میں رکھی ہے؟''

''بھئی ہادی کو مٹھائی کھلاؤ آخر کو اِس کی شادی طے ہوگئی ہے۔'' احسن عباس نے ہادی کو جھٹکا دیا۔

''شادی طے ہوگئی ہے؟ کس سے؟ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟'' اُس پر حیرتوں کے کئی پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

''تمہیں اِن الجھنوں میں پڑنے کی ضرورت

نہیں ہے۔ اپنی نیلوفر ہی تو ہے۔'' احسن عباس نے ایک اور دھماکہ کیا۔

''کیا؟ لیکن میں تو کسی اور کو! میرا مطلب ہے نیلوفر کو تو میں نے کبھی بھی اِس نظر سے نہیں دیکھا ہے۔ میں تو مریم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اِس مرتبہ احسن عباس کو شاک لگا۔

''مریم سے! ہوش میں تو ہو؟ اُس کا اور تمہارا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے تمہاری شادی ہوگی تو صرف اور صرف نیلوفر سے...... صرف وہی اس گھر کی بہو بننے کی اہل ہے۔ سمجھا دو زینت اپنے بیٹے کو ویسے بھی یہ ادلے بدلے کا معاملہ ہے۔ اگر میری بہن کو تکلیف پہنچی تو سمجھ لو تمہاری ماں بھی خوش نہیں رہ پائیں گی اِس گھر میں۔'' احسن عباس دونوں ماں بیٹے کو سوچوں کے گرداب میں اُلجھا ہوا چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوگئے تھے۔

ماحول پر ایک سوگواری سی چھاگئی تھی۔ دونوں ماں بیٹے کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ہادی کے دماغ میں اپنے باپ کے خلاف احتجاج کی لہریں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں۔ وہ اس گھر سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ تب ہی اُس کو مریم کی یاد آئی اور وہ اُس سے اپنی تکلیف شیئر کرنے پہنچ گیا۔

☆......☆......☆

مریم فاطمہ اور ہادی عباس چھت پر بیٹھے افق پر پھیلے ہوئے سیاہ بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھ رہے تھے۔ ایبہا نے ہادی کی تواضع پکوڑے، ہرے دھنیا اور ہری مرچ کی چٹنی اور دھواں نکلتی ہوئی چائے سے کی تھی، مگر ہادی کے چہرے پر خوشی کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔ اُس کی آنکھوں میں جو ہر وقت اُمید کی ایک لو جلتی تھی وہ کچھ ماند سی دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ کسی سے جھگڑا کر کے آ رہے ہو؟ اتنے دُکھی کیوں لگ رہے ہو؟'' مریم نے پکوڑوں کی پلیٹ ہادی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' ہادی نے پکوڑا اُٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے مریم کے معصوم چہرے کو دیکھا۔

''تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں اور تمہارا ڈپریشن بھرا لہجہ کہ یقیناً کچھ گڑبڑ ہے۔''

''ہوں! کچھ نہیں بہت گڑبڑ ہے۔'' اُس نے اُداسی سے ٹھنڈی آہ بھری۔

''کیا مطلب؟ کچھ بتاؤ گے بھی یا پہیلیاں بجھواتے رہو گے۔'' مریم متجسس تھی۔

''ڈیڈی نے میری شادی طے کردی ہے۔'' اُس نے مریم پر دھماکہ کیا۔

''ارے واہ تو اِس بات سے تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ کس سے طے کردی ہے؟'' مریم نے اپنے دل کا درد چھپایا۔

''نیلوفر سے!'' مریم پر بجلیاں سی گریں۔

''ک......ک......کیا؟ اپنی نیلوفر سے! چلو اچھا ہی ہوا اب تم فضول لڑکیوں کے پیچھے بھاگنا بند کردو گے۔''

اُسے لگا تھا کہ اس سے وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی ہے۔ زمین بوس ہوگئی ہے۔ مگر وہ یونہی ثابت قدم، مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ہادی کو دیکھ رہی تھی۔

''تو اِس میں کون سی نئی بات ہے ہر لڑکے اور لڑکی کو ایک دن گھر بسانا ہی ہوتا ہے پھر پھوپا نے تمہارے لیے کچھ اچھا ہی سوچا ہوگا۔''

''انہوں نے اس مرتبہ بھی خود غرضی اور کاروباری ہونے کا پورا ثبوت دیا ہے۔ انہیں میرے جذبات کا بالکل بھی احساس نہیں ہے۔'' ہادی کا لہجہ پُر درد تھا۔

''بعض اوقات ہمیں اپنے بڑوں کی خاطر اپنی

خوشیوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ تمہیں اس طرح پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں یقین رکھنا چاہیے کہ آنے والے دن اچھے ہیں۔'' مریم نے پھر اُسے سمجھایا۔

''تم نہیں جانتیں ڈیڈی کو! انہوں نے مجھے کس دلدل میں دھنسا دیا ہے۔ ایک طرف میری ماں ہے اور ایک طرف میری قربانی۔ نیلوفر کی خوشیوں کے بدلے میں انہوں نے میری ماں کی خوشیوں کا سودا کیا ہے۔'' اُس نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں۔

''ہادی! تو پھر تم اِس وقت پھوپا کی بات مان لو۔ پھوپو اِس رشتے سے خوش ہیں؟''

''ہاں پہلے تو وہ بہت خوش تھیں مگر اب شاید وہ بھی ناخوش ہیں۔ کیونکہ میں اس رشتے کے لیے آمادہ نہیں ہوں۔''

وہ دونوں کرسیوں پر آمنے سامنے اسی طرح بہت دیر تک خاموش بیٹھے ہر طرف کھلی ہوئی چاندنی کا منظر دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد مریم نے خاموشی توڑی۔

اب تم جاؤ ہادی! اگر چچی جان اور نیلوفر کو پتا چلے گا کہ تم یہاں میرے ساتھ ہو تو انہیں بُرا لگے گا۔ تم جاکر کھانا کھاؤ پھر سکون سے سو جاؤ، رات آرام کرلو۔''

''میں بہت تھک گیا ہوں مریم!'' ہادی نے اپنا سر ہاتھوں سے تھاما۔

''پریشان مت ہو! جاؤ، سو جاؤ۔ یوں سمجھو تمہاری پریشانیاں میں نے لے لی ہیں۔''

ہادی تھکے تھکے قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کے لیے نکل گیا تھا مگر مریم فاطمہ کے اندر چھوٹے بڑے دھماکے بڑے تواتر کے ساتھ ہو رہے تھے۔ وہ زخمی اور شکست خوردہ سی اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی تھی۔ آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اُس نے سوچا اِس دولت میں بڑی طاقت اور چمک ہوتی ہے۔ رشتے بھی دولت کے ترازو میں تولے جاتے ہیں۔ کاش! وہ بھی نیلوفر کی طرح خوش قسمت ہوتی۔ جس کو ظاہری حسن اور دولت کے بل پر زمانے بھر کی خوشیاں خود بخود مل جاتی ہیں۔ وہ رات بھر کروٹیں بدلتی رہی۔ اُس کے دماغ میں ہادی اور نیلوفر کے چہرے بار بار اُبھر رہے تھے پھر اُسے اپنی پھوپی کا خیال آگیا جو مجبوریوں کی وجہ سے پابندِ سلاسل تھیں، پھوپا اپنے آگے ان کی ایک نہیں سنتے تھے۔ اس مرتبہ وہ غربت کی صلیب پر مصلوب کردی گئی تھی اور کسی کو اُس کی روحانی موت کا اندازہ بھی نہیں ہوا تھا۔

☆......☆......☆

مریم فاطمہ چینل ڈی پرنیوز ایڈیٹر عمرانہ توصیف کے سامنے بیٹھی تھی۔ انہوں نے مریم کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ تھکی ہوئی لگ رہی ہو خیریت تو ہے؟''

''ہاں بس صبح اسکول، شام میں رائٹنگ پھر کبھی میگزین کے آفس، کبھی اخبار کے اور پھر کبھی چینل کے چکر لگانے سے کچھ تھک سی جاتی ہوں۔'' مریم نے گویا اپنے تھکا دینے والے شیڈول سے عمرانہ کو آگاہ کیا۔

''یہ تو تمہاری روز کی ہی روٹین ہے۔ مگر آج کچھ اور بات ہے۔ تم بڑی اُداس اور مضمحل سی لگ رہی ہو۔ خیریت تو ہے۔ تمہارے والد کیسے ہیں؟'' عمرانہ نے مریم کے دل کے تار چھیڑے۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ابا بھی ٹھیک ہیں۔'' مریم نے اپنا درد چھپانا چاہا۔

''مگر اب زیادہ اُداس ہونے کی ضرورت نہیں ہے تمہارا اپوائنٹمنٹ لیٹر آگیا ہے۔''

''کیا واقعی؟'' مریم خوش محسوس ہوگئی۔

"Thanks God۔"

''ہمیں تمہاری جیسی قابل لڑکی ہی کی ضرورت ہے۔ جو تعلیم یافتہ اور مہذب بھی ہو اور جس کی رائٹنگ Skill بھی زبردست ہو اور جو دوسروں کا درد اپنا سمجھ کر اُس کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔'' عمرانہ توصیف نے لیٹر مریم کی طرف بڑھاتے ہوئے خوشدلی سے کہا۔

''اچھی بات ہے۔ اب میں اپنی فیملی کے لیے کچھ کر پاؤں گی۔ بہت سے خواب ہیں میرے اُن سب کے حوالے سے۔'' مریم نے اپنے دل کی بات کہی۔

''تم ہمارے ملک کی ایک قابلِ فخر بیٹی ہو۔ تم یہ ثابت کر رہی ہو کہ ضروری نہیں کہ بیٹا ہی اپنی فیملی کو Support کرسکتا ہے بلکہ ایک مضبوط ارادے کی لڑکی بھی اپنی فیملی کا سرمایہ ہوتی ہے۔''

''Thank You عمرانہ! آپ سب کی حوصلہ افزائی سے ہی میں اس مقام تک پہنچ پائی ہوں۔'' اُس کا لہجہ شیریں تھا۔

''یہ تو تمہاری انکساری ہے ورنہ تم بھی ہماری ملالہ سے کم نہیں ہو۔'' عمرانہ توصیف کے اس ریمارک پر مریم مسکرا اٹھی تھی۔

''عمرانہ! آپ نہیں جانتیں اس وقت آپ نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد اس خوشی کو اپنی فیملی کے ساتھ Celebrate کروں۔''

''Sure! Why Not تم جاؤ اور فیملی کے لیے مٹھائی ضرور لے جانا تاکہ تمہارے کام کا آغاز میٹھا میٹھا ہو۔''

''ٹھیک ہے عمرانہ Thank You Once Again اب اجازت ہے؟'' مریم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''بالکل اجازت ہے۔ Wish You All The Best۔''

☆......☆......☆

وہ خوشی خوشی گھر میں مٹھائی کا ڈبہ، کیک اور سموسے لے کر داخل ہوئی تھی مگر گھر میں سب کے چہروں پر اُداسی کا راج تھا۔ اُن کے لٹکے ہوئے چہرے دیکھ کر اُس کی خوشی کچھ معدوم سی ہوگئی تھی۔

''کیا ہوا بھئی کیا بات ہے۔ سب اتنے اُداس کیوں لگ رہے ہیں؟'' اُس نے سامان سے بھرا ہوا تھیلا ابیہا کو دیتے ہوئے کہا۔

''پہلے تم بتاؤ یہ سب کس خوشی میں لائی ہو؟'' ابیہا نے سامان لیتے ہوئے اُلٹا سوال کر ڈالا۔

''مجھے چینل ڈی پر اسسٹنٹ نیوز ایڈیٹر کی جاب مل گئی ہے۔'' اُس کی خوشی دیدنی تھی۔

''بس اب ہماری مشکلات ختم ہونے والی ہیں۔ اب میں ابا کا اچھے سے علاج کرواؤں گی۔ گھر کی مرمت کراؤں گی۔ تمہاری اور فروی کی شادی کراؤں گی۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتی گئی۔

''اور اپنی شادی کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟ چچی جان اور نیلوفر آئی تھیں ہادی اور نیلوفر کی منگنی ہورہی ہے اور ہم سب بھی Invited ہیں۔'' ابیہا نے اُسے ہرٹ کر ڈالا۔

''بیٹا! آج ہادی اور نیلوفر کی منگنی ہے اور تمہیں نہیں معلوم؟ تم سے تو وہ دونوں ہر بات شیئر کرتے ہیں ناں!'' کلثوم جہاں کو بھی حیرت کا جھٹکا سا لگا تھا۔

''امی مجھے کیا معلوم؟ پھوپا نے اپنی اور نادرہ چچی کی مرضی سے اُس کی بات طے کر دی ہے۔ ویسے بھی پھوپو کی کوئی حیثیت تو ہے نہیں اُس گھر میں۔ پھوپا نے ہادی کے لیے کوئی Option ہی نہیں رکھا ہے سارے راستے اُس کے لیے بند کر دیے ہیں۔''

اس مرتبہ مریم نے اپنے جذبات پر بندھا بند توڑ ڈالا تھا۔

''ہائے یہ کیسا ظلم ہے! خدائی اندھیر ہے۔ یہ دنیا کس طرف جا رہی ہے، میری تو فہم سے باہر ہے۔'' کلثوم جہاں کو ضبط کا یارا نہ رہا۔

''امی آج ہم لوگ وہاں نہیں جائیں گے۔'' فروئی نے بہن کا درد محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارے پاس نہ اچھے کپڑے ہیں اور نہ اچھی جیولری ہم کیسے وہاں Adjust کریں گے۔ نادرہ چچی کے گھر والے تو بہت فیشن ایبل لوگ ہیں۔''

''جی نہیں! ہم سب جائیں گے، کیوں نہیں جائیں گے۔ ہم انہیں دکھائیں گے کہ ہم اُن کی خوشی میں کتنے خوش ہیں! کیوں بیٹا؟'' کلثوم جہاں نے مریم سے پوچھا۔

''جی امی مگر ابا کے پاس کون رہے گا؟ میں سوچ رہی ہوں کہ میں ابا کے پاس رہ جاؤں گا۔'' مریم نے جواب دیا۔

''نہیں بیٹا میں اکیلا بھی رہ سکتا ہوں۔ تم لوگ جاؤ ورنہ زینت کو اچھا نہیں لگے گا اور احسن اور نادرہ کو باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے ابا جیسی آپ کی مرضی، مگر اللہ ہم کو خوشیاں بھی غموں کی چادر میں لپیٹ کر کیوں دیتا ہے؟ وہ ہمارے ساتھ اتنی ناانصافی کیوں کرتا ہے؟ صرف اس لیے کہ ہم غریب ہیں؟'' مریم فاطمہ اس لمحے اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پائی اور لرزیدہ قدموں اور آبدیدہ آنکھوں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

اُس کی جاب بہت اچھی جا رہی تھی اور وہ تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ اُس کی محنت اور صلاحیت، اُس پر سے ذہانت کا تڑکہ اُسے اور بھی مقبول بنا رہا تھا۔

اب وہ اپنے نیوز چینل پر ایک ایسی شخصیت بن کر ابھر رہی تھی جس کے بغیر کام کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جب سے ہادی اور نیلوفر کی منگنی ہوئی تھی۔ اُس نے ہادی سے ملنا اور اُس کی کالز اٹینڈ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ نیلوفر کو بھی نادرہ خاتون کی جانب سے مریم سے گھلنے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ یوں بھی وہ حد درجہ مصروف ہوگئی تھی اور اب اُس نے قائداعظم کے اِس فرمان کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا تھا۔ کام، کام اور صرف کام۔

☆......☆......☆

گھر میں شادی کے ہنگامے عروج پر تھے۔

نیلوفر اور ہادی شادی کے بعد U.S.A شفٹ ہوگئے تھے جبکہ نادرہ خاتون اور احسن عباس بھی U.S.A مستقل بنیادوں پر شفٹ ہونا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ڈاکومینٹیشن جاری تھی پھر ایک دن نادرہ خاتون نے آکر ایک دھماکہ کردیا تھا۔

''بھابی ہم U.S.A موو کر رہے ہیں۔'' نادرہ خاتون نے مطلع کیا۔

''اچھا مبارک ہو بھئی! یہ بتاؤ کہ ہادی اور نیلوفر کیسے ہیں؟ خیر سے سال ہونے کو ہے۔'' کلثوم جہاں نے خوشدلی سے حال احوال دریافت کرنا چاہا۔

''ہاں بالکل خیریت سے ہیں۔ اللہ انہیں نظر بد سے بچائے۔'' نادرہ خاتون نے ایک انداز سے کلثوم جہاں کو دیکھتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

''میں یہ مکان بیچنا چاہ رہی ہوں۔ میں یہی آپ لوگوں کو بتانا چاہ رہی تھی۔''

''مگر تم یہ مکان کیسے بیچ سکتی ہو۔ ہم کہاں جائیں گے؟'' اس مرتبہ فاضل ہمدانی نے مداخلت کی۔

''کہیں بھی جائیں بھائی صاحب! یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ ویسے بھی اب مریم اچھا خاصا کمانے لگی

ہے۔آپ کے حالات بدل گئے ہیں، پھر کیا پریشانی ہے؟'' نادرہ خاتون نے نخوت سے گھر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ کچھ توقف کے بعد فاضل ہمدانی نے کہا۔

''تو پھر تم لوگ اس مکان کو بیچ کر رقم کا آدھا حصہ ہمیں دے دو۔ ہم اُس سے کوئی چھوٹا موٹا فلیٹ خرید لیں گے۔''

''بھائی صاحب! آپ تو جانتے ہیں کمال کا کاروبار کتنا گھاٹے میں جا رہا ہے۔ میرا کام بھی نہیں چل رہا ہے۔ وہاں آدرش نے شادی کر لی، اپنا کاروبار سیٹ کر لیا ہے۔ اسی لیے تو ہم وہاں جا رہے ہیں۔'' نادرہ خاتون نے توجیہہ پیش کی۔

''ٹھیک ہے! مگر ہمیں ہمارا حصہ ملنا ہی چاہیے، ویسے تو اتنی جلدی اس مکان کا بکنا بھی مشکل ہے۔'' مریم فاطمہ نے پہنچ کر نادرہ خاتون کو جواب دیا۔

''تو پھر ہمارے والے حصے کی Payment کر دو اور یہ مکان پورا تم لوگ اپنے نام کرالو۔'' نادرہ خاتون نے جچتے ہوئے Option پیش کیا۔

''چچی جان ہم مشورہ کر کے آپ کو بتائیں گے۔'' مریم فاطمہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

نادرہ خاتون سب کو شش و پنج میں مبتلا کر کے چلی گئی تھیں۔ اُن کی آمد ہمیشہ ہی فاضل ہمدانی کے خاندان پر قہر بن کر نازل ہوتی تھی۔ اِس وار سے سب ہی گھر والے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ مگر حل نہیں تلاش کر پا رہے تھے۔ انہوں نے چال ہی ایسی چلی تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

☆......☆......☆

تین ماہ کی طویل جدوجہد کے بعد بھی مکان کوئی خریدنے کو راضی نہ تھا۔ وہ جتنی مالیت کا مکان تھا جلد بازی میں اُس کا آدھا بھی نہیں مل رہا تھا۔ ملک کے سیاسی اور معاشرتی حالات ویسے بھی دگرگوں تھے۔

کمال ہمدانی اور نادرہ خاتون نے مکان کو بیچنے کی بات دو سال بعد ہونے والی آمد پر ٹال دی تھی اور فاضل ہمدانی کے سپرد کر کے U.S.A چلے گئے تھے۔ یوں بھی نادرہ خاتون کون سا گھاٹے کا سودا کرنے والی تھیں۔ مگر مریم کو اِن کا Option بہت پسند آیا تھا۔ وہ سخت جدوجہد میں لگی تھی کہ کسی طرح اُس کے پاس اتنی رقم ہو جائے کہ وہ گھر اپنے والد کے نام کروا سکے۔ ابھی احسن عباس اور کمال ہمدانی کی فیملیز کو گئے سال بھر ہوا ہی تھا کہ مریم نے اپنے والدین کو خوشخبری سنائی۔

''ابا میں نے بینک سے لون اپلائی کیا تھا اور دیکھیے Approve ہو گیا ہے کچھ رقم میرے پاس ہے۔ کچھ ہم بینک سے لے لیں گے اور چچی جان اور چچا جان کو بھیج دیں گے۔'' مریم فاطمہ کے چہرے سے خوشیوں کی توس و قزح پھوٹ رہی تھی۔

''واہ بھئی! میری بیٹی نے تو کمال کر دیا۔ جو کام میں نہ کر سکا۔ وہ میری بیٹی نے کر دکھایا۔'' فاضل ہمدانی مسکرا کر بولے۔

''مگر بیٹا ہم نے ایبا اور فروئی کی شادی کی تاریخ دے دی ہے۔ اگر ہم اس وقت گھر لے لیں گے تو اُن کی شادیوں کا کیا بنے گا، یہ سوچا ہے تم نے؟'' کلثوم جہاں نے اپنے دل میں اٹھنے والے خدشات کا ذکر کیا۔

''وہ بھی ہو جائے گا اماں۔ جہیز تو ان کا سارا بنا ہوا ہے۔ شادی ہم نے ایک ہی دن تو کرنی ہے لہٰذا ایک ہی Recepjon دینا پڑے گا۔ بس آپ فکر نہ کریں، میں سب سنبھال لوں گی اور مجھے اپنے چینل کی طرف سے جو صحافیوں کو پلاٹ دیا گیا تھا، وہ میں اپنے سینئر صحافی مسٹر فاروقی کو سیل کر رہی ہوں۔ اس لیے آپ بالکل پریشان نہ ہوں، ابھی تو میں جا رہی ہوں بینک سے رقم چچی جان کے اکاؤنٹ

میں ٹرانسفر کروانے۔'' مریم فاطمہ نے والدین کو لاجواب کر دیا۔

'' مگر بیٹا پہلے مکان کے کاغذ تو سائن کروالتیں۔'' فاضل ہمدانی نے مشورہ دیا۔

'' ابا وکیل سے بات ہوگئی ہے چچی جان کے جو قانونی وکیل ہیں۔ وہ کل آکر آپ سے دستخط کروالیں گے۔ آج میں کتنی خوش ہوں ابا! میں آپ کو بتا نہیں سکتی ہوں۔''

'' بالکل! اللہ زندگی دے۔ زمانے کی ہر خوشی تمہارے دامن میں ڈال دے۔ جس طرح تم نے اپنے معذور باپ کو سہارا دیا ہے خدا تمہیں ہر قدم پر سہارا دے۔'' ماں باپ کی دعاؤں سے مریم سرشار سی ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

مریم فاطمہ کی شہرت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اُس کو عورتوں کے حقوق کے حوالے سے کام کرنے پر اقوامِ متحدہ کی تنظیم نے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر بنا دیا تھا۔ اب اُس کے پاس سب کچھ تھا، گھر جس کا کبھی وہ خواب دیکھتی تھی، ایک لمبی گاڑی، والدین کے ہنستے مسکراتے چہرے، غرض زندگی کی ہر سہولت اُس کے پاس تھی۔ مگر کچھ خالی پن تھا، جس کو وہ محسوس کرنے لگی تھی۔ ایک ساتھی کی کمی جس سے وہ پرسنلی اپنی ہر بات ڈسکس کر سکے۔ وہ اپنے گھر میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ تب ہی اُس کا سیل فون بجا۔ دوسری طرف جو آواز تھی وہ کچھ شناسا سی تھی۔

'' ہیلو...... کیا میں؟''

'' ہیلو کون؟'' وہ حیرت سے بولی۔

'' میں ہوں مریم! ہادی! کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟''

'' میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔ تم سناؤ وہاں سب خیریت تو ہے ناں۔'' مریم نے ہادی کی آواز کی کپکپاہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔

'' مریم! نادرہ آنٹی اور نیلوفر ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گئیں۔''

'' کیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' مریم کو دکھ ہوا۔

'' میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ دو ماہ اسپتال میں موت اور زیست کی کشمکش کے بعد نیلوفر کا انتقال ہوگیا۔ نادرہ آنٹی تو اُسی وقت وفات پا گئی تھیں۔''

'' میں ممی اور ڈیڈی کے ساتھ واپس پاکستان آرہا ہوں۔'' ہادی نے ایک اور دھماکہ کیا۔

'' اور چچا جان وہ کہاں رہیں گے؟'' اُس کو چچا کی فکر دامن گیر ہوئی۔

'' وہ بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔ آدرش نے یہاں جس عورت سے شادی کی تھی اُس نے نادرہ آنٹی اور کمال انکل کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ خاص طور سے نادرہ آنٹی کی زندگی جہنم بنا دی تھی۔ نادرہ آنٹی اور انکل تنگ آکر ہماری طرف آگئے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی تمام پونجی آدرش کے کاروبار میں لگا دی تھی۔ وہ بالکل ہی دست ہوگئے تھے۔'' ہادی تیزی سے بولتا جارہا تھا۔

'' اور احسن انکل اور پھوپو کیسے ہیں؟'' مریم فاطمہ کے دل میں سوال اٹھ رہے تھے۔

'' ڈیڈی نے لالچ کا جو جال بنا تھا وہ خود اُس کا شکار ہوگئے تھے۔ اُن کو U.S.A کے کاروباری اسرار و رموز کا اندازہ نہیں تھا۔ انہیں بھی پے در پے نقصانات ہوتے گئے اور وہ اب بستر سے لگ گئے ہیں۔ ممی ہر وقت تم لوگوں کو یاد کرتی ہیں۔ وہ تو شکر ہے ہم نے اپنا گھر Sale نہیں کیا تھا۔ ورنہ اس وقت ہم کہاں جاتے؟''

'' تم سب پر قیامت گزر گئی اور ہمیں اب بتا رہے ہو۔ بہر حال جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے تم لوگ آؤ۔ ہمارے گھر کے دروازے

ہمیشہ تم لوگوں کے لیے کُھلے رہیں گے۔'' مریم فاطمہ نے ہادی کو تسلی دی۔

''اور دل کے دروازے؟'' ہادی نے سوال کیا۔

''وہ بند کب ہوئے تھے ہادی! مجھے نیلو اور چچی جان کا بہت افسوس ہے۔''

''میں جانتا ہوں! تمہاری نیک نیتی تمہیں اپنے دشمنوں سے بھی نفرت کرنے سے باز رکھتی ہے۔''

''اور میں کیا کر رہا ہوں؟ تم نے یہ نہیں پوچھا؟''

''مجھے پتا ہے تم ایک کاروباری دماغ کے انسان ہو، تمہیں وہاں بھی کامیابیاں ہی ملی ہوں گی۔ ویسے بھی ہر شے تو تم لوگوں کو بنا محنت کیے مل جاتی ہے۔''

''جی نہیں میں نے بہت محنت کی ہے۔ آؤں گا تو بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے خدا حافظ اپنا خیال رکھنا اور پھوپو کو میری طرف سے ضرور پوچھ لینا۔ میں امی ابا کو بتاتی ہوں۔'' دوسری طرف سے سیل آف کر دیا گیا تھا اور وہ یہی سوچ جارہی تھی کہ یہ مکافاتِ عمل ہے یا اُس کی ماں کی بددعاؤں کا نتیجہ۔ جو ہر لمحے ذلت سہنے پر اُن کے دل سے نکلتی ہوں گی۔ مگر ہادی اُس سے کیا اُمید رکھتا ہے؟ کیا وہ ابھی بھی یہی سوچ رہا ہے کہ میں اُس کو اپنالوں گی؟''

☆......☆......☆

مریم فاطمہ نے اپنے والدین کو اطلاع کر دی تھی۔ گھر میں ایک سوگ کی فضا طاری تھی۔ یوں بھی ایبہا اور فروی کی شادیوں کے بعد گھر سُونا سُونا لگتا تھا۔ جب وہ دونوں ویک اینڈ پر آتیں تو گھر گھر لگتا تھا۔

مریم رات بھر سو نہیں سکی۔ وہ رات بھر ہادی کے بارے میں سوچتی رہی کچھ دنوں بعد ہادی آجائے گا۔ وہ یقیناً اُس کی طرف ہاتھ تو بڑھائے گا۔ تو کیا وہ اُس کے ہاتھ کو جھٹک پائے گی؟ لیکن نہیں اُس کو ہادی کو نہیں اپنانا چاہیے۔ جس وقت اُسے اس کی ضرورت تھی اُس وقت تو وہ اُسے تنہا چھوڑ کر دیارِ غیر جا بسا تھا۔ مگر اُس نے ابھی تک اپنا گھر کیوں نہیں بسایا تھا کس کی اُمید پر؟ اُس کے دماغ میں سوالات کی بھرمار تھی۔ تمام پرانے زخم تازہ ہو رہے تھے۔ اُس نے اپنے دماغ سے بُرے اور غلط خیالات ویسے ہی جھٹکنے چاہے جیسے کوئی رات بھر کی گندی ہوا کو صبح کھڑکی کھول کر باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ سوچتے سوچتے اُس کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں مگر کہیں سے کوئی حل نہیں مل پا رہا تھا۔ وہ یونہی بوجھل دل اور قدموں کے ساتھ آفس کے لیے روانہ ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

ہادی اپنے والدین کو لے کر واپس پاکستان آگیا تھا۔ ہادی کے گھر کی صفائی ستھرائی مریم کی والدہ نے بڑی خوش اسلوبی سے کروادی تھی۔ گھر میں کھانا وغیرہ بھی تیار کر دیا تھا۔ وہ لوگ تو آرام کی غرض سے مریم کے گھر نہیں آئے تھے مگر ہادی! ہادی! آیا اُسی اضطراب کے ساتھ جو کسی مبتلائے محبت میں ہوتا ہے مگر مریم کو اُسے دیکھنے یا اُس سے ملنے کی خواہش نہیں تھی۔ اُس کی سمجھ جیسے جواب دے گئی ہو۔ وہ تھکی تھکی سی تھی اور مفلوج سی۔

مریم نے ہادی کا سوال چھت پر کھڑے ہو کر سُنا۔

''وہ کہاں ہے؟'' اور اماں کا جواب بھی۔

''چھت پر۔'' مریم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر وہ بے حس و حرکت لان کی طرف دیکھتی رہی۔ لان شام کی روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھولوں پر شہد کی مکھیاں گھوم رہی تھیں، مہکتی ہوا پودوں کی پتیوں میں سرسرا رہی تھی۔ مریم سنہری دھوپ میں بُت سی

بنی کرسی پر بیٹھ گئی۔
ہادی کے قدموں کی آہٹ قریب آئی اور قریب اور قریب...... پھر وہ کہتا گیا اور مریم ہونٹوں پر قفل ڈالے سنتی رہی۔ محض چند سوال تھے جو اُس نے کیے باقی سب ہادی نے کہا۔ اُس نے بھیگے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''تم واپس کیوں آگئے ہادی؟ کس کے لیے؟ جب مجھے تمہاری ضرورت تھی تو مجھے تنہا چھوڑ گئے تھے۔'' آخر شکوہ لبوں پر آ ہی گیا۔
اُسے دیکھ کر ہادی کے دل میں درد اُٹھا یہ محض درد نہیں تھا اُس کا دل اس طرح دھڑ کا، اس میں اس طرح ٹیس اٹھی جیسے اس میں بہت سے تند و خشک کانٹے چبھ گئے ہوں۔
مضطرب اور پریشان مریم نے کچھ اس طرح سوال کیا جیسے وہ اب روئی اور اب روئی۔
''تم مجھے جانتے ہو؟ اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' مکمل خاموشی، اُس کے ہونٹوں سے ایک لفظ نہ نکل پایا۔ یادیں...... یادیں...... یادیں...... یادوں کا ایک آبشار، ہادی کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے ہادی نے پھر پوچھا۔
''کیا تم مجھ سے خفا ہو؟'' دونوں کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل پایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا بہت دیر تک دیکھتے رہے پھر ہادی بولا۔
''مریم تم تو میری زندگی ہو۔ میں تم سے خفا ہوا تو سمجھو مر جاؤں گا۔ تم جانتی ہو جب میں نے نیلو سے شادی کی تو وہ ماں بننے والی تھی اُس کا Rape ہوا تھا۔ اِس مصیبت کے وقت میں انسانیت کے ناتے مجھے اُس کا ساتھ دینا تھا یہ راز سوائے میرے، پھوپو نادرہ اور نیلو کے کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر میرے اور اُس کے درمیان آج تک میاں بیوی والا کوئی تعلق قائم نہ ہوسکا۔ اُس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی میں تم کو دن رات یاد کرتا تھا۔ تمہاری کامیابیوں کے لیے دعائیں مانگتا تھا۔''
''چچا جان کہاں ہیں؟ اور وہ بچہ میرا مطلب ہے نیلو پھر ماں بنی؟''
''وہ بھی نیلو کے ساتھ اِس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ تم نے کبھی سوچا نہیں کہ ہم یہاں سے U.S.A کیوں شفٹ ہوگئے۔ میری مجبوریاں بھی ہوسکتی ہیں مگر مجھے معلوم ہے تم مجھے بے وفا گردانتی ہوگی۔'' اُس کا لہجہ دُکھی تھا۔
''نہیں! میں نے تمہیں کبھی بے وفا نہیں جانا۔'' مریم نے گلوگیر لہجے میں جواب دیا۔
''کمال ماموں مکہ معظمہ چلے گئے ہیں۔ اُن کے خیال میں وہ وہاں رہ کر عبادت کر کے اپنی غلطیوں کا ازالہ کرسکیں گے۔''
''تو کیا اب کبھی یہاں نہیں آئیں گے چچا جان؟''
''جب دل چاہے گا، آجائیں گے، ویسے بھی کس منہ سے تم لوگوں کا سامنا کریں گے۔ دانستگی یا نادانستگی میں انہوں نے تم لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ اب وہ اس پر شرمندہ ہیں۔''
''مگر ہم نے تو کبھی ایسا نہیں سوچا؟''
''میں جانتا ہوں تم اپنی فطرت سے مجبور ہو۔ تم کسی کے لیے بھی غلط کرنا تو کیا غلط سوچ بھی نہیں سکتیں۔''
پھر وہ دونوں بھیگی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر ایسا مسکرائے کہ جیسے کبھی جدا نہ ہوئے ہوں۔
دھیرے دھیرے سورج چھپ گیا۔ سیاہی چاروں طرف پھیل گئی اور انہوں نے اپنے والدین کی رضامندی سے ہمیشہ کے لیے ایک ہونے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

نسرین اختر بھٹی

اِس راہِ وفا میں

گلی میں مکمل اندھیرا ہو رہا تھا، صرف موم بتیوں کے جلنے سے روشنی ہو رہی تھی۔ دولہا کا گھر گاؤں میں ہی تھا۔ گلیوں میں سے گزرتے ہوئے یہ لوگ مہندی لگانے کے لیے جا رہے تھے۔ راستے میں ہی چوہدری حیدر کا گھر تھا اور چوہدری بھی مہندی دیکھنے کے لیے......

زیست کی پُر پیچ مسافت پر چلنے والوں کی کتھا، ناولٹ کی صورت

کچے آنگن میں دوپہر کی تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ نیم کا درخت اس گھر کے تمام نفوس کو پناہ دیے ہوئے تھا۔ اینٹوں کا بنا ہوا ایک کمرہ تھا جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا برآمدہ بنا ہوا تھا۔ گرمی اور دھوپ جسم کو جھلسانے والی تھی۔ نوراں کے ساتھ اس کے دونوں چھوٹے بیٹے بھی بان کی ایک چارپائی پر سوئے ہوئے تھے۔ نوراں کی بڑی بیٹی شادو، اپنی چھوٹی بہنوں جو چوتھے اور پانچویں نمبر پر تھیں، ان کو قرشیے پر جھالریں بنانا سکھا رہی تھی۔

شادو کبھی دھاگے کو انگلی پر لپیٹتی تو کبھی دوسرے ہاتھ سے قرشیے چڑھاتی اُتارتی۔ دونوں چھوٹیاں اس کی انگلیوں کی حرکت کو بغور دیکھتیں اور شادو ساتھ ساتھ انہیں بتاتی بھی جاتی تھی۔ شادو سے چھوٹی نازو چارپائیوں کے ساتھ ایک چھوٹا سا ٹاٹ بچھا کر اس پر بیٹھی تھی۔ وہ بھی رومال پر کڑھائی کر رہی تھی۔ نیم کے درخت کا اتنا ہی سایہ تھا جس میں یہ سات افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ گرمیوں کی دوپہر کو اس گھر کے سارے مکین یہاں نیم کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہی بیٹھتے تھے۔ نوراں کی پانچ بیٹیاں تھیں، پر نوراں اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں سے بہت زیادہ پیار کرتی تھی، نہ جانے کیوں اسے بیٹیاں ایک بوجھ کی طرح لگتی تھیں۔ نوراں دوپہر کی روٹی کھا کے سوئی تھی، لیکن اب سایہ ڈھل گیا تو اور نوراں کے منہ پر دھوپ پڑنے لگی تھی۔ جب نوراں کو گرمی لگی تو وہ ہائے ہائے کرتی اُٹھی، دوپٹے کے ساتھ منہ سے بہتے ہوئے پسینے کو پونچھا اور ایک نظر نازو کو دیکھا، پھر دوسری چارپائی پر شاداں کے ساتھ بیٹھی لڑکیوں کو دیکھا۔

''نی کڑیوں تہاڈا پیو ئیں آیا؟'' (لڑکیوں تمہارے والد ابھی تک نہیں آئے) نوراں نے پوچھا؟

چاروں لڑکیوں نے گردنیں موڑ کر دیکھا، پھر نازو نے ماں کو جواب دیا۔

''نہیں اماں، ابا اجے نہیں آیا۔'' (نہیں، اماں، ابا ابھی نہیں آئے)

''نی مینوں پانی دا گلاس لا دے۔'' (مجھے پانی

کا گلاس لادو) نوراں نے چھوٹی سے کہا۔ وہ برآمدے میں پڑے گھڑے میں سے پانی لے کر آرہی تھی جب دروازہ بجا۔ چھوٹی نے دروازہ کھولا تو کرم دین اندر داخل ہوا۔ وہ چلتا ہوا ادھر ہی آیا جدھر وہ سب بیٹھے ہوئے تھے۔

کرم دین کو شاداں نے اُٹھ کے جگہ دی تو وہ ادھر ہی بیٹھ گیا۔ کرم دین کے سارے کپڑے پسینے سے گیلے ہو رہے تھے، ساتھ ہی چہرے پر پریشانی کے آثار بھی تھے۔

''توبہ! توبہ! آج تاں بڑی گرمی اے۔'' (توبہ ،توبہ! آج تو بہت گرمی ہے)

کرم دین نے کہتے ہوئے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔

''اپنے ابے نوں وی پانی لادے۔'' (اپنے ابا کو بھی پانی پلاؤ) گلاس پکڑتے ہوئے نوراں نے چھوٹی سے کہا۔

وہ کاغذ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''ایہہ کی اے؟'' (یہ کیا ہے؟)

''ایہہ شہروں چٹھی آئی اے'' (یہ شہر سے خط آیا ہے) کرم دین کے بتانے پر نوراں نے کہا۔

''شہروں چٹھی آئی ہے، پر کس نے کلی اے؟'' (شہر سے خط آیا ہے، لیکن کس نے بھیجا ہے؟)

''اپنی بہن ظاہرہ نے کلی اے'' (میری بہن ظاہرہ نے بھیجا ہے) کرم دین نے بتایا۔

ظاہرہ، کرم دین کی چچازاد بہن تھی۔ شاداں اسے جانتی تھی، اس لیے اس نے پوچھا۔

''ابا پھوپی نے کیہ لکھیا اے'' (ابا پھوپی نے کیا لکھا ہے؟)

''پتر اُنے لکھیا اے۔ اوہ بیمار اے۔'' (بیٹا اُس نے لکھا ہے وہ بیمار ہے) ان کرم دین نے جواب دیا۔

''ہن فیر توں کیہ سوچیا اے؟'' (پھر تم نے کیا سوچا ہے) نوراں نے پوچھا؟

''میں شہر جاواں گا۔'' (میں شہر جاؤں گا)

کرم دین نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

☆......☆......☆

''ہاشم کیا تم اسے چھوڑ نہیں سکتے؟''

''سبین تمہاری خاطر جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔'' ہاشم نے جواب دیا۔

وہ دونوں سبین کے دفتر میں بیٹھے تھے، سبین ایزی چیئر پر بیٹھی تھی، اس کے سامنے ٹیبل کی دوسری طرف ہاشم بیٹھا تھا، وہ آیا اس دفتر میں ملازم کی حیثیت سے تھا، مگر سبین کی اس پر نظر کرم تھی کہ اب وہ اس دفتر کا مالک بننے والا تھا۔

''ہاشم میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ عامر نے مجھے طلاق اس وجہ سے دی تھی کہ میں ماں نہیں بن سکتی تھی، اس لیے اگر تم اپنے بیٹے کو ساتھ رکھنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''اوہ تھینکس! میں خود بھی یہی کہنے والا تھا۔ اصل میں مجھے اپنے بیٹے سے بہت پیار ہے۔''

''اسی لیے تو کہا ہے، تم جتنی جلدی تیاری کر سکتے ہو کرلو۔ میں بھی انگلینڈ جانے کا بندوبست کرتی ہوں۔'' سبین نے کہا تو ہاشم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اوکے! تم جیسا چاہوگی ویسا ہی ہوگا۔ اب میں چلتا ہوں کل پھر آؤں گا۔ تم دیکھتی جاؤ میں کیا کرتا ہوں؟''

''اوکے!'' سبین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہاشم دروازے سے نکل کر گیا تو سبین اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ہاشم نظروں سے اوجھل ہو گیا تو سبین نے سر کو چیئر کی پشت سے ٹکایا اور آنکھیں بند کرلیں۔ خوشی اس کے چہرے سے

عیاں تھی۔ ہاشم آفس سے نکل کر سیدھا گھر کی طرف جارہا تھا۔ وہ جانتا تھا ظاہرہ اس وقت گھر پر نہیں ہوگی۔ ظاہرہ اسکول ٹیچر تھی اور اسے گھر پہنچنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ ہاشم کے پاس سبین کی دی ہوئی گاڑی تھی اور ظاہرہ کے پوچھنے پر ہاشم نے جھوٹ بولا تھا کہ یہ گاڑی میرے دوست کی ہے جو خود انگلینڈ میں رہتا ہے۔ ہاشم ظاہرہ کے والد کے گھر میں رہتا تھا، ظاہرہ کے والد نے اچھے دنوں میں یہ گھر بنایا تھا۔ چوں کہ ظاہرہ ان کی ایک ہی بیٹی تھی، اس لیے ان کی وفات کے بعد اس گھر کی مالک بھی وہی تھی۔ ہاشم نے گاڑی کو پلے گراؤنڈ میں کھڑا کردیا۔ یہاں سے آگے گلی تنگ تھی اور اس تنگ گلی میں ہی ان کا گھر تھا، ہاشم گلی میں جاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ''ظاہرہ صرف ایک گھر کی مالک ہے، جبکہ سبین کروڑوں کی جائیداد کی مالک ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ میرے بیٹے کو اپنا بیٹا بنا کر رکھے گی، اس طرح وہی سبین کی جائیداد کا مالک بھی ہوگا۔''

دروازے کے پاس پہنچ کر ہاشم نے جیب سے لاک کھولنے کے لیے دوسری چابی نکالی مگر دروازے پر تالا نہیں تھا، وہ بیل بجاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ''شاید آج ظاہرہ اسکول کو نہ گئی ہو۔'' تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا، سامنے ظاہرہ ہی کھڑی تھی۔ ظاہرہ نے الجھی ہوئی نظروں سے ہاشم کی طرف دیکھا کہ ہاشم کو تو اس وقت آفس میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ مسکراتا ہوا گویا ہوا۔

''حیران ہورہی ہو کہ آج میں جلدی کیسے آگیا'' ہاشم نے اندر داخل ہوتے ہوئے ظاہرہ سے کہا۔

''آج تم بھی اسکول نہیں گئیں اور میں بھی جلدی آگیا ہوں، یہ اتفاق کی بات ہے۔''

میری آج طبیعت خراب تھی اس لیے چھٹی کی ہے۔ ظاہرہ نے پیچھے آتے ہوئے بتایا، تو ہاشم ڈرائنگ روم میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا اور ظاہرہ سے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھتے ہوئے بولا۔

''اب کیسی طبیعت ہے'' ظاہرہ بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

''پوچھوگی نہیں کہ میں آج کیوں خوش ہوں؟'' وہ قدرے مسکراتے ہوئے بولا، تو ظاہرہ نے کہا۔

''وہ تو آپ کئی دنوں سے ہیں۔''

وہ کافی دنوں سے محسوس کررہی تھی کہ وہ آج کل بڑا خوش خوش رہتا ہے۔ اس کے کہنے پر ہاشم قدرے خفیف تو ہوا پھر فوراً ہی سنبھلتے ہوئے بولا۔

''یار بات ہی ایسی ہے۔'' ''تمہیں میں نے بتایا تھا تاکہ میرا ایک دوست انگلینڈ میں ہوتا ہے۔'' ظاہرہ نے سوالیہ نظروں سے ہاشم کی طرف دیکھا۔

''اسی نے ہمارے لیے ویزا بھیجا ہے۔''

''ہمارے لیے؟'' ظاہرہ نے پوچھا تو ہاشم کہنے لگا۔

''ہاں! میرے اور ممنون کے لیے! تم فکر نہ کرو میں وہاں پہنچتے ہی تمہارا بھی ویزا بھجوادوں گا۔''

ہاشم خوشی سے بتا رہا تھا، مگر ظاہرہ پریشان ہوگئی کہ اتنی دور وہ اپنے بیٹے کو کیسے بھیجے گی۔ ہاشم نے اس کی پریشانی بھانپ لی۔ اُسے فکر تھی کہ کہیں ظاہرہ ممنون کو ساتھ بھیجنے سے انکار نہ کردے، اس لیے بولا۔

''دیکھو ظاہرہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ہم سب وہاں جائیں گے۔ دیکھو نا اگر میں خود بھی وہاں جاتا تو میرا دل وہاں کیسے لگتا؟ اس لیے میں نے اپنے دوست سے کہہ رکھا تھا کہ میں اپنی فیملی کے ساتھ وہاں سیٹل ہونا

چاہتا ہوں۔ اس کا کوئی مسئلہ تھا، ورنہ ہم تینوں اکٹھے ہی جاتے اور ابھی وہاں ممنون کا ایڈمیشن بھی وہ کرائے گا۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟''
ہاشم نے ظاہرہ کو قائل کرنے کی از حد کوشش کی اور وہ اس کی باتوں پر قائل ہو بھی گئی، تب ہی سر کو ہاں میں ہلا دیا۔
مگر دل پر ایک بوجھ سا آ گیا تھا اور آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی، لیکن پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔
''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی، لیکن پلیز جلدی، وہاں بلا لیجیے گا میں ممنون کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''
ہاشم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے تسلی دی اور کہا۔
''چلو اب مجھے زبردست سی ایک کپ چائے پلاؤ۔'' اور وہ کچن میں اس کے لیے چائے بنانے چلی گئی اور ہاشم آئندہ کا پلان بنانے لگا۔

☆......☆

شہینہ کو اس گھر میں آئے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے، مگر پھر بھی اس کا دل کسی کے ساتھ نہ لگتا تھا۔ اس گھر میں کتنے ہی افراد تھے، مگر یہ سب کچھ اسے عجیب سا لگتا۔ ابھی بھی وہ اندر کمرے میں پڑی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اور چھت پر رینگتے ہوئے پنکھے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ وقفے وقفے سے آنسو اُس کی آنکھوں سے پھسلتے اور گالوں پر بہتے ہوئے بالوں اور قمیص کی آستین میں جذب ہو جاتے تھے۔
وہ بچپن کے پانچ سال بھی یہاں گزار گئی تھی۔ یہ اس کا اپنا گھر تھا، اپنے بہن بھائی تھے، لیکن وہ اس گھر کو کیسے بھول جاتی، جس گھر میں اس نے پندرہ سال گزارے تھے۔ اس کے سامنے بار بار اس مہربان عورت کا چہرہ آ جاتا تھا، جسے وہ اپنی امی کہتی تھی۔ اس گھر کی تمام یادیں اس سے وابستہ تھیں۔ شہینہ کو اپنی اسکول اور کالج کی دوستیں بھی یاد آتی تھیں جو اس کے گھر میں اس سے ملنے آتی تھیں۔ کتنا پیار تھا اس کی زندگی میں، اس کی ہر چیز کا خیال رکھا جاتا تھا۔ وہ اچھا کھاتی تھی، اچھا پہنتی تھی۔ امی اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھتی تھیں۔ وہ گھر لیٹ آتی تو امی پریشان ہوتی تھیں، مگر اب وہ سب کچھ چھوڑ آئی تھی۔ یہاں سے جب وہ پہلی دفعہ گئی تھی تو بہت جلد سب کچھ بھول گئی تھی۔ اسے تو کبھی یہاں کی کوئی بھولی بسری یاد بھی نہ آتی تھی کہ وہ وہاں اپنی پڑھائی میں مصروف تھی، وہی اس کا گھر تھا اس کی امی تھی۔ وہاں کا ماحول یہاں سے یکسر مختلف تھا، مگر اچانک اس کی قسمت نے پلٹا کھایا اور اس کا سب کچھ چھین لیا۔ پورے دو ہفتے ہو گئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے۔ یہاں کے ماحول سے اُس کا دم گھٹتا تھا۔ پہلے دن وہ جب یہاں آئی تو یہاں کے سب لوگ اسے ہمدردی سے پیش آئے۔ اس کے چھوٹے بھائی بہنیں اس کے اردگرد منڈلاتے، ابّا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔
''شفو پتر یہی تیرا گھر ہے۔'' اماں نے اسے جب روتے ہوئے چپ کرانا چاہا تو کہنے لگی۔
''پتر تُوں فکر نہ کر اَسی ہی تیرے ماں پیو آں۔''
پر وہ کیسے مان لیتی، وہ اپنی اس عظیم ہستی کو کیسے بھلا دیتی۔ جب امی نے اس سے کہا تھا کہ ''آج سے تم اپنے اصل والدین کے پاس جا رہی ہو۔'' تو وہ کچھ بھی نہ بول سکی تھی۔ اب وہ حقیقت کو بھی نہیں جھٹلا سکتی تھی، اس نے اپنے والدین کو پہلی دفعہ یہاں آ کر دیکھا تھا۔ امی کی وفات کے بعد وہاں کوئی بھی تو نہیں تھا جس کے پاس وہ رہتی۔ یہاں اس کے اپنے بہن بھائی تھے، وہ کبھی خواہش کرتی تھی کہ اس کی بھی کوئی بہن ہو، مگر اب جب اس کی بہنیں اس کے

پاس تھیں تو اسے کوئی خوشی نہ ہوئی تھی۔

وہ پانچ سال کی تھی جب یہاں سے گئی تھی اور اب پورے 20 سال کی ہوگئی تھی جب دوبارہ یہاں آئی تھی۔ امی کے مرنے سے پہلے اُسے کسی بات کا علم نہ تھا۔ وہ انہیں ہی اپنی ماں کہتی اور سمجھتی تھی۔ یہاں آنے کے بعد وہ اکثر روتی تھی، مگر اس سے کیا ہوتا؟ شہینہ دیر تک پنکھے کی طرف دیکھتی رہی تو اس کی آنکھیں دھندلا گئیں، آنکھوں کو بند کرتے ہوئے شہینہ نے اپنے گال صاف کیے اور کروٹ بدل کر سونے لگی۔ شام کو اس کی آنکھ کھلی تو باہر سے کافی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اُٹھ کر اپنے کمرے سے باہر آئی۔ سب ہی اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے، اس کی دونوں چھوٹی بہنیں ابا کے ساتھ بھینسوں کے لیے چارا کاٹ رہی تھیں۔ شہینہ حیران ہوکر انہیں دیکھنے لگی کہ وہ دونوں اتنی چھوٹی سی تھیں پھر بھی اتنی مہارت سے کام کررہی تھیں۔ گھر چوں کہ خاصا بڑا تھا، اس لیے ایک طرف بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ اماں تندور پر روٹیاں پکارہی تھیں اور شاداں باجی ہانڈی پکارہی تھی، جبکہ نازو برتن دھونے میں مصروف تھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ سب سارا دن کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ اس گھر میں بہت سے افراد ہیں مگر سب مصروف ہوتے ہیں۔

اچانک وہ چونکی، اس کو کہنی پر گیند لگا تھا۔ اس نے دیکھا تو دونوں چھوٹے بچے اس کے پاس کھڑے تھے اور ایک کہہ رہا تھا۔

”باجی گیند جیدی نے مارا ہے۔“ بچے کے بولنے پر اماں نے مڑکر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”اُٹھ گئی ہو پتر“ وہ نلکے پر منہ ہاتھ دھونے کے لیے جانے لگی تو نوراں پھر کہنے لگی۔

”شنو پتر ایتھے دھیاں اینیاں نہیں سوندیاں۔ تیرا ابا وی پچھ رہیاں سی کہ شنو سارا دن سوندی اے۔ پُتر شہر دی گل ہور سی پر ایہہ پنڈ اے۔“ (شنو بیٹی یہاں لڑکیاں اتنا نہیں سوتیں، تیرا ابا بھی پوچھ رہا تھا کہ شنو سارا دن سوتی ہے بیٹا شہر کی بات اور ہوتی ہے لیکن یہ گاؤں ہے) شہینہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو منہ ہاتھ دھونے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ واقعی میں دوپہر کو سوئی اور اب اُٹھی ہوں۔ کوئی اچھی بات تو نہیں اور اماں بھی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ میں آئندہ ان کے ساتھ کام کروں گی آخر جو بھی ہے مجھے اب یہیں رہنا ہے۔ وہ ہاتھ دھوکر آئی تو شاداں باجی کے پاس بیٹھ گئی، پھر سب اپنے اپنے کام سے فارغ ہوکر ادھر ہی آئے تو نازو اُٹھ کر چارپائیاں لگانے لگی تو وہ بھی اس کے ساتھ لگ گئی، شہینہ نے سب کے ساتھ مل کر روٹی کھائی، شاداں باجی اور نازو سب کو روٹی دے رہی تھیں، وہ جب سے یہاں آئی تھی آج پہلی دفعہ اس نے سب کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھائی تھی، اس سے پہلے وہ گرمی میں بھی کمرے میں بیٹھی رہتی تھی اور نازو اسے وہاں ہی روٹی دے آتی تھی، باہر کا موسم اسے اچھا لگا تھا، اب وہ آہستہ آہستہ روٹین پر آرہی تھی۔ شاداں باجی کی شادی کو صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ وہ سب کے ساتھ مل کر تھوڑا بہت کام کرواتی تھی اور اب وہ اس کی عادی ہوتی جارہی تھی۔ شادی پر پہننے کے لیے اماں نے اسے دو سوٹ دیے تھے۔ اماں شاداں باجی کے جہیز کے کپڑے بنارہی تھی۔ کام آج کل بہت بڑھ گیا تھا اور وہ ان کے ساتھ مل کر دن میں کام کرواتی تھی۔ شام کو وہاں محلے کی لڑکیاں آجاتی تھیں اور رات گئے تک ان کے صحن میں رونق لگی رہتی تھی۔ وہ اب پہلے کی طرح نہیں تھی، بلکہ مصروفیت کی وجہ سے کچھ کچھ سنبھل گئی تھی۔ نازو کے ساتھ بھی اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ اسے یہاں کے بارے میں پوری تفصیل بتاتی۔ اسے بہت دُکھ ہوا جب نازو نے اسے بتایا کہ یہاں

کی لڑکیوں کو نہیں پڑھاتے اور اس کی چاروں بہنیں بھی اَن پڑھ تھیں۔ شبینہ نے سوچا وہ یہاں بچیوں کو پڑھائے گی۔ امی بھی تو اسکول سے آنے کے بعد بچیوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھیں۔ آج اسے کافی دنوں بعد پھر امی کی یاد آئی تھی۔ امی کی بیماری کے دوران وہ اکثر بچیوں کو پڑھاتی تھی اور یہ سب اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ مصروفیت کی نئی راہ سوچ کر مطمئن ہوگئی۔

☆......☆......☆

گھر میں کافی مہمان جمع ہوگئے تھے۔ شاداں باجی نے مایوں والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ محلے کی ساری لڑکیوں اور رشتے دار لڑکیوں نے پیلے لباس زیب تن کر رکھے تھے۔ نازو اور شبینہ کا سوٹ بالکل ایک جیسا تھا۔ نازو نے اسے بتایا کہ میں نے بہت شوق سے یہ سوٹ تمہارے لیے اپنے جیسا بنوایا ہے، تو مجبوراً اسے بھی پہننا پڑا، ورنہ وہ تنگ اور درمیانہ لباس پہنتی تھی۔ اسے اتنا کھلا اور ڈھیلا لباس اچھا تو نہ لگ رہا تھا، مگر کیا کرتی، جب اس نے وہ کپڑے پہنے تو اماں نے بھی اس کی تعریف کی اور باقی سب لڑکیوں نے بھی۔ ساری اسے کہہ رہی تھیں کہ تم تو بالکل حور لگ رہی ہو، حالاں کہ ہم نے بھی ایسے ہی کپڑے پہن رکھے ہیں۔ شبینہ نے اپنے گھنے اور لمبے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا اور باریک ریشمی دوپٹے سے بھی اس کے بال نظر آرہے تھے۔ ساری مہمان خواتین بھی اس کی تعریفیں کر رہی تھیں۔ اسے خود بھی اپنے بال بہت پسند تھے۔ امی اکثر اسے کہتی تھیں۔

”بیٹا بال باندھ کر کالج جایا کرو کہیں نظر نہ لگ جائے“ اور وہ ہمیشہ ہنس کر کہتی تھی۔

”امی بھلا بالوں کو کیوں نظر لگے گی وہ تو ہوتے ہی کالے ہیں اور امی مسکراتی رہتی تھیں۔ آج اسے کسی نے بھی بال باندھنے کے لیے نہیں کہا تھا، صبح شاداں باجی کی رخصتی تھی، شبینہ آکر ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ گاؤں کی ساری لڑکیاں اُسے شنو کہتی تھیں اور گھر والے بھی اسے شنو کہتے، اسے بڑا عجیب لگتا، کیوں کہ بچپن سے اب تک اس کی امی اور دوستیں سب ہی اسے شبینہ کہہ کر پکارتی تھیں۔ وہ شاداں باجی سے باتیں کر رہی تھی، جب نازو نے اسے بلایا تو ساری لڑکیاں کھڑی تھیں۔ وہ اپنی اپنی باتوں میں مصروف مہندی کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھیں۔

نازو نے شبینہ کو بتا رکھا تھا کہ یہاں لڑکے والے لڑکی کو اور لڑکی والے لڑکے کے مہندی لگاتے ہیں اور وہ سمجھ گئی کہ یقیناً ساری لڑکیاں بھی اسی لیے کھڑی ہیں، ان کے ہاتھوں میں پلیٹیں تھیں؟ جن میں مہندی رکھی ہوئی تھی اور موم بتیوں کو جلایا جا رہا تھا۔

شبینہ بھی ان کے پاس آگئی۔ صرف چند ایک لڑکیاں شاداں باجی کے پاس رہ گئی تھیں۔ کسی لڑکی نے اسے بھی پلیٹ پکڑائی اور وہ حویلی کے دروازے سے ان کے ساتھ باہر آگئی۔ گلی میں بالکل اندھیرا تھا۔ عورتیں بھی ان کے ساتھ جا رہی تھیں۔ ایک عورت نے انہیں کچھ ہدایات دیں۔ شبینہ کو چند ایک باتوں کی سمجھ آگئی تھی۔ لڑکیوں کی دو قطاریں تھیں، چوں کہ نازو اور شبینہ دلہن کی بہنیں تھیں، اس لیے ان کو اگلی قطار کے درمیان میں کھڑا کیا گیا تھا۔ اتنے میں ڈھول اور باجے والے بھی آگئے اور لڑکیاں ہاتھوں میں مہندی کی پلیٹیں پکڑے ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں۔

گلی میں مکمل اندھیرا ہو رہا تھا، صرف موم بتیوں کے جلنے سے روشنی ہو رہی تھی۔ دولہا کا گھر گاؤں میں ہی تھا۔ گلیوں میں سے گزرتے ہوئے یہ لوگ مہندی لگانے کے لیے جا رہے تھے۔ راستے میں ہی چوہدری حیدر کا گھر تھا اور چوہدری بھی مہندی دیکھنے

کے لیے چھت پر کھڑا تھا۔ اس نے ان لڑکیوں میں سے شمینہ کو دیکھا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکا۔ وہ پہلی بار اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ چوہدری حیدر کو شمینہ بالکل پری لگی تھی۔ پہلی لائن کے درمیان میں چلتے ہوئے موم بتیوں کی روشنی سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ چوہدری حیدر کو بھاگئی تھی۔ لڑکیاں مہندی لگانے کے لیے آگے چلی گئیں، مگر چوہدری حیدر وہاں کھڑا ہوا اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ چوہدری حیدر کی بیوی ہر وقت بیمار رہتی تھی اور وہ اکثر دوسری شادی کے بارے میں سوچتا تھا۔ وہ اس گاؤں کا چوہدری تھا، حیدر علی کا باپ اچھا انسان تھا۔ یہاں کے لوگ اس کے باپ کی بہت عزت کرتے تھے اور اس کے مرنے کے بعد وہی خود مختار تھا۔ آدھے سے زیادہ لوگ اس کی جگہ پر گھر بنا کے بیٹھے تھے، ان ہی میں سے ایک کرم دین کا بھی گھر تھا۔ چوہدری مختار جو کہ چوہدری حیدر علی کا باپ تھا، اس نے ہی انہیں یہ زمین دی تھی، حیدر نے واپسی پر اپنی نوکرانی کو بلایا۔ جب ساری لڑکیاں گزریں تو اس نے اس لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ نوکرانی نے اسے بتایا کہ یہ کرم دین کی بیٹی ہے۔ جو شہر میں رہتی تھی مگر اب واپس آگئی ہے۔ چوہدری حیدر نے سوچ لیا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

☆......☆

ظاہرہ ساری رات روتی رہی تھی۔ کوئی ایک پل بھی ایسا نہیں تھا کہ وہ یہاں سے اٹھی ہو۔ اس کی آنکھیں شدت گریہ سے سرخ ہوگئی تھیں ہونٹ خشک ہوچکے تھے۔ سر دُکھ رہا تھا۔ درد کی ٹیسیں پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھیں، لگتا تھا ظاہرہ کا پورا جسم مردہ ہو۔ کل سے بھوکی تھی وہ۔ کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ گھر میں کھانے پینے کے لیے بھی کوئی چیز نہیں تھی، بلکہ اُسے خود ہی کھانے کا ہوش نہیں تھا۔ وہ کھاتی بھی کیسے جب اس کے دل میں ہی سکون نہیں تھا۔ وہ روتی نہ تو اور کیا کرتی؟ اس سے اس کا پیارا پیارا بیٹا بچھڑ گیا تھا۔ شوہر نے دھوکہ دیا تھا، زندگی کی واحد خوشی اس سے چھن گئی تھی۔ وہ مکمل بکھر گئی تھی۔ کوئی بھی تو اُس کا یہاں نہیں تھا، جو اسے سنبھالتا۔ ہاشم نے اُس سے اُس کا بیٹا بھی چھین لیا تھا۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو ظاہرہ اپنے بیٹے کو کبھی اُسے نہ دیتی، مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ بہت دور سات سمندر پار تھا۔ درد کی ایک تیز لہر اس کے جسم سے اُٹھی۔ ایسی حالت میں اُسے بخار ہوگیا تھا، مگر اسے اپنی پروا کب تھی۔ ظاہرہ نے اپنے بیٹے کی تصویر کو اٹھا کر چوما اور ایک دفعہ پھر ہاشم کا بھیجا ہوا لیٹر اُٹھا کر پڑھا۔ ہاشم نے لکھا تھا۔

''ظاہرہ مجھے معاف کر دینا۔ میں جانتا ہوں کہ تم بہت دُکھی ہوگی، مگر ممنون کو میں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے سبین سے شادی کرلی ہے۔ میں جس کمپنی میں کام کرتا تھا۔ وہ سبین ہی کی تھی ہم دونوں شادی کے بعد یہاں سیٹل ہوگئے ہیں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں طلاق بھجواؤں تو اس نمبر پر فون کر کے مجھے بتا دینا۔ نیچے نمبر لکھا ہوا تھا۔ اور بھی بہت کچھ لکھا تھا، مگر ظاہرہ کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ وہ ایک دفعہ پھر پھوٹ کر رو دی۔ ہاشم اور ممنون کو گئے ہوئے ایک مہینہ ہونے والا تھا۔ جب کل صبح وہ اسکول گئی تھی تو ناشتا کر کے گئی تھی، مگر واپسی پر اُسے یہ خط ملا۔ ظاہرہ خوش ہوگئی تھی کہ ہاشم نے اسے بلوایا ہے، مگر خط پڑھ کر اس کے حواس باختہ ہوگئے تھے۔ ہاشم نے جو کچھ لکھا تھا وہ اس کے ہوش و حواس اُڑانے کے لیے کافی تھا۔ رات بھر وہ رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر روتی رہی تھی۔ یہاں بیٹھ کر اس نے خط پڑھا تھا، مگر پھر اس کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ وہ یہاں سے اُٹھے۔ ممنون کی تصویر بھی ٹیبل پر رکھی تھی۔

وہ کبھی تصویر کو دیکھتی تو کبھی خط پڑھتی۔ آخر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس نمبر پر فون ضرور کرے گی۔ ظاہرہ بامشکل وہاں سے اُٹھی۔ اُسے لگا کہ ابھی گر جائے گی، مگر وہ بیڈ تک گئی دراز میں سے گولیاں نکالیں اور کچن کی طرف جانے لگی۔ کچن زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ کمروں کے سامنے والی جگہ ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتی تھی، جہاں تین چار کرسیاں اور ایک گول میز بچھی ہوئی تھیں اور اُس سے آگے کچن تھا، اس گھر میں صرف دو ہی کمرے تھے، ایک کمرہ ممنون کا، جبکہ دوسرا ظاہرہ اور ہاشم کا تھا۔ دونوں کمرے ایک ساتھ تھے۔ ظاہرہ کو اچانک چکر آ گیا، مگر اُس نے کرسی کا سہارا لیا، پھر خود کو سنبھالتے ہوئی وہ کچن کے اندر آ گئی۔ فریج سے پانی نکال کر پیا، چولہے پر چائے کا پانی رکھ کر دو توس گرم کیے۔ اتنے میں چائے بن گئی تو وہاں بیٹھ کر ہی ناشتا کرلیا اور پھر چائے کے ساتھ گولیاں لیں۔ وہ اب خود کو قدرے بہتر محسوس کر رہی تھی۔ ظاہرہ کمرے میں آ کر سوگئی۔ چار گھنٹے نیند لینے کے بعد وہ اُٹھی تو اسے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ ظاہرہ نے اپنے لیے کھانا بنایا اور کھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ میں ہاشم سے طلاق نہیں لوں گی۔ میں اپنے بیٹے کی نظروں میں نہیں گرنا چاہتی۔ وہ ایک دن ضرور میرے پاس آئے گا۔ ہاشم سے کہوں گی فون پر میرے بیٹے کو مجھ سے بات کرنے دیا کرے۔ اب مجھے حالات سے سمجھوتا کرنا ہوگا، پھر وہ اندر گئی اور وہ پرچہ اٹھالائی جس پر نمبر لکھا ہوا تھا۔ ہاشم کا نمبر ملانے کے لیے فون کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

☆......☆......☆

ہاشم اور سبین کی شادی کو پورا ایک ماہ گزر گیا تھا، مگر ممنون سبین کو آنٹی ہی کہتا تھا۔ جب وہ لوگ پاکستان سے آئے تھے، ہاشم اور سبین کا نکاح پہلے ہی ہو چکا تھا، سبین ان دونوں سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکی تھی۔ جب وہ دونوں یہاں پہنچے تو ہاشم نے ممنون کو سبین کے بارے میں بتایا کہ یہ تمہاری نئی امی ہے، مگر ممنون اپنے ابو سے ناراض ہوگیا تھا کہ آپ نے مجھے پاکستان میں کیوں نہیں بتایا کہ آپ شادی کر چکے ہیں، وہ بضد ہوگیا تھا کہ ''میں واپس جانا چاہتا ہوں۔'' وہ کوئی چھوٹا بچہ بھی نہیں تھا کہ سمجھ نہ سکتا، اس کی عمر آٹھ سال تھی۔ یہاں آ کر اسے سب کچھ ملا تھا مگر اس کی ماں نہیں تھی۔ ہاشم شروع میں تو مصروف رہا۔ سبین نے اپنا بزنس یہاں شروع کر دیا تھا۔ سبین کو کوئی خاص تجربہ نہ تھا اس لیے تو اس نے ہاشم جیسے بندے کو چنا تھا۔ پہلے اس کے والد بزنس سنبھالتے تھے، مگر وہ سبین کی طلاق کا صدمہ نہ سہ سکے۔ ان کی وفات کے بعد سبین نے بزنس کو دیکھنا شروع کر دیا، مگر پھر ہاشم سے ملنے کے بعد اس سے شادی کی خواہش مند ہوگئی۔ ہاشم اس کی پہلی طلاق کے بارے میں جانتا تھا۔ اس لیے سبین نے اُسے پرپوز کر دیا تو وہ تیار ہوگیا۔ ہاشم خوب صورت اور ہینڈسم تھا۔ اس کا اپنا بیٹا بھی آٹھ سال کا تھا، مگر سبین کو اس کی فکر نہیں تھی۔ وہ صرف ہاشم کو چاہتی تھی اور اس کے بیٹے کو بہت پیار کرتی تھی، مگر ممنون کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ سبین نے ممنون کو کچھ کہنے کے لیے بیٹا کہا تو وہ کہنے لگا۔

''میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں انڈراسٹینڈ''

ہاشم یہ سن رہا تھا۔ وہ آج گھر پر ہی تھا۔

''ممنون ادھر آؤ بیٹا'' اس نے ممنون کو بلایا۔ سبین کمرے میں چلی گئی تو وہ اس کے سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

''بیٹا ان کے ساتھ بدتمیزی کیوں کی ہے؟''

ممنون اکھڑے لہجے میں بولا۔

''اس لیے کہ ان کی وجہ سے میری امی مجھ سے

دور ہیں۔ ہاشم جانتا تھا کہ ممنون آج کل ظاہرہ کو مس کر رہا ہے۔'' وہ اُٹھ کے اس کے پاس آ کے بیٹھ گئے۔

ہاشم نے ممنون کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بیٹا آپ اتنے بڑے ہو کہ میری بات سمجھ سکو۔'' ممنون نے ان کے چہرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''بیٹا میں چاہتا ہوں کہ تمہارا مستقبل اچھا ہو۔ گھر، گاڑی، پیسا سب کچھ سبین کا ہے۔ آپ اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہو اور کیا چاہیے آپ کو؟''

''مگر امی؟'' ممنون نے کہا تو ہاشم کہنے لگا۔

''یار وہی مرغے کی ایک ٹانگ! بات تو مکمل سن لو۔ وہ تمہاری امی سبین کے بارے میں جانتی ہیں۔ دیکھو نا اگر سبین نہ ہوتی تو ہم یہاں عیش نہ کر رہے ہوتے، اس لیے پڑھائی کی طرف دھیان دو اور آئندہ مجھے شکایت نہ ملے۔ ہاشم نے ممنون کو سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ اس شرط پر مان گیا کہ وہ اپنی امی سے رابطہ رکھے گا۔ ممنون کو انہوں نے سبین سے سوری کرنے کے لیے کہا تو وہ ان کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ہاشم کی کل ہی ظاہرہ سے بات ہوئی تھی۔ ظاہرہ نے خود ہی فون کیا تھا اور روتے ہوئے ہاشم سے ریکوسٹ کی تھی کہ ''مجھے طلاق نہیں چاہیے مجھے صرف ممنون سے بات کرنی ہے۔'' تو ہاشم نے کہا تھا کہ ٹھیک ہے مگر ایک شرط ہے کہ تم ممنون کو اپنے پاس آنے کے لیے نہیں کہو گی، بلکہ اسے سمجھاؤ گی کہ وہ یہاں رہ کر پڑھے لکھے اور بڑا آدمی بنے۔ ظاہرہ نے حامی بھرلی، فون کی بیل بجنے پر ہاشم نے نمبر دیکھا تو کال پاکستان سے ظاہرہ کی تھی۔ ہاشم نے ممنون کو بلوا کر ظاہرہ سے اس کی بات کروائی۔ بات کرتے ہوئے ظاہرہ کا گلا آنسوؤں سے رندھ گیا۔ ظاہرہ نے ممنون کو تسلی دی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور ممنون کو پڑھنے کی تلقین کی۔ وہ کہنے لگا۔

''امی آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ ٹھیک ہیں، مگر میں یہاں بیٹھ کر بھی آپ کو بتا سکتا ہوں کہ آپ رو رہی ہیں۔ آپ کی آواز بتا رہی ہے۔'' ظاہرہ نے تر گالوں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دل پر پتھر رکھ کر کہا۔

''نہیں بس تم پہلی دفعہ اتنی دور گئے ہو، اس لیے، ورنہ میں بہت خوش ہوں کہ تم اتنی اچھی تعلیم حاصل کر رہے ہو۔''

وہ اسے کیا بتاتی کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے، ظاہرہ سے بات کرنے کے بعد ممنون کچھ نارمل ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ واقعی امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ وہ اکثر اپنی امی سے فون پر بات کرتا۔ اس لیے پڑھائی میں لگ گیا، سبین نے کبھی ممنون کو کچھ نہ کہا۔

☆......☆......☆

شہینہ کو نازو نے ہی بتایا تھا کہ دوسرے گاؤں میں ایک پرائیویٹ اسکول ہے۔ شہینہ نے شاداں کی شادی کے بعد چند بچوں کی ماؤں کو انہیں پڑھانے کے لیے کہا۔ وہ نخرے کرنے لگیں۔ شاداں کے بعد اب نازو پر سارا بوجھ تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ کام کرواتی، مگر یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ صرف چائے بناتی یا پھر اوپر کے چھوٹے موٹے کام کرتی۔ اس نے نوراں سے بات کی کہ ''میں پڑھانا چاہتی ہوں؟'' مگر نوراں نے اسے منع کر دیا کہ ہمارے ہاں لڑکیاں نہ پڑھتی ہیں نہ نوکری کرتی ہیں، تم یہ باتیں اب بھول جاؤ، مگر شام کو نازو نے آپا کو بتایا تو وہ کہنے لگے۔

''ہاں تاں ایہدے وچ کیہ حرج اے۔ شنو پتر پوری چوداں جماعتاں پاس اے اگر اوہ نوکری کرنا چاہندی اے تاں اوہنوں کرن دیو۔'' شہینہ خوش

ہوگئی۔ وہ صبح اٹھی تو کرم دین نے اسے کہا۔
''شنو پتر تیار ہوجا آج میں تینوں اسکول لے جاواں گا۔'' مگر نوراں نے اسے کہا۔
''تیری تاں مت ماری گئی اے، جہڑا جوان کڑی نوں دوسرے پنڈ گھمن لئی تیار ہوگیا اے۔''
''میں تاں اہدے وچ حرج ای کیہ ہے۔ فارغ رہن نالوں تاں چنگا اے۔'' نوراں سے کرم دین سے کہنے کے لیے کوئی جواب نہ بن پڑا تو چپ ہوگئی، شہینہ بھی جلدی سے تیار ہونے کے لیے اندر گئی۔ ہلکے فیروزی کلر کے کاٹن کے سوٹ کے ساتھ میچ ٹاپس اور انگوٹھی پہنی۔ وہ ابھی دوپٹہ کرنے ہی لگی تھی کہ نازو بھی کمرے میں آگئی۔
''شہینہ توں تاں سچی مچی استانی لگ رہی اے'' نازو کہنے لگی، وہ جواباً مسکرادی۔ لمبے بالوں کی چوٹی کمر پر جھول رہی تھی اور نکھرتے ہوئے رنگ پر یہ کلر اسے بہت جچ رہا تھا، اس نے ہلکے پنک کلر کی لپ اسٹک ہونٹوں پر لگائی تھی، جب وہ کالج جاتی تھی تو اسے کبھی تیار ہوتے ہوئے اتنا اچھا نہیں لگتا تھا، لیکن وہ آج کتنے عرصے بعد کہیں جانے کے لیے تیار ہورہی تھی، اسے عجیب سی خوشی کا احساس تھا۔
نازو نے شہینہ کو ایک بڑی سی چادر نکال کر دی تو اس نے اچھی طرح سے لپیٹ لی کہ کہیں باہر نکلنے پر اماں اسے پھر کچھ کہنے نہ لگ جائیں، کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اگر کبھی وہ اپنے یہ کپڑے جو وہ شہر میں رہتے ہوئے پہنتی تھی، کبھی اب پہن لیتی تو اماں تو کئی باتیں کرتی اور اماں کا حکم تھا کہ وہ یہاں کے رواج کے مطابق کھلے شلوار قمیض پہنے، آج اس نے اپنی پسند کا سوٹ پہنا تھا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر آفندی نے اچانک دروازہ کھولا تو وہ چونک گیا۔
''کیا ہوا برخوردار کس سوچ میں گم ہو۔'' انہوں نے اس کا چونکنا اچھی طرح محسوس کیا تھا۔
''کچھ نہیں سر۔'' ڈاکٹر ممنون ہاشم نے جواباً کہا۔
''یار یہ سر والا لفظ کچھ ہضم نہیں ہوتا اور تم یہ مجھے سر ہی کیوں کہتے ہو، جبکہ میں تمہارا انکل بھی تو ہوں۔'' انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا اور ممنون نے ان کی طرف ہنستے ہوئے دیکھا۔
وہ کہنے لگا۔
''اچھا چلیں ٹھیک ہے آئندہ میں آپ کو انکل ہی کہوں گا۔'' آفندی صاحب نے ایک بلند آواز میں قہقہہ لگایا۔
''یہ ہوئی نا بات۔'' آفندی صاحب اس کے پاپا کے بہت گہرے دوست تھے، اب پاکستان آنے کے بعد وہ ان کے اسپتال میں ہی کام کررہا تھا۔
ممنون ہاشم ان دنوں صرف ایک ایسی ہستی کے لیے یہاں رکا ہوا تھا جس کا صرف ذکر ہی سن رکھا تھا، دراصل وہ جس لڑکی کی تلاش میں تھا اس کے بارے میں امی نے ہی اسے بتایا تھا، اس کے بعد طاہرہ کے پاس صرف وہی چھوٹی سی لڑکی تھی جسے وہ اپنے کزن کے گاؤں گئی تو ساتھ لائی تھی، طاہرہ اور وہی تھیں جن کی خاطر وہ پاکستان آیا تھا، وہ چھوٹی لڑکی اب بڑی ہوگئی تھی۔ ممنون کو اس لڑکی سے ملنے کا تجسس تھا۔
ممنون ہاشم اپنی تعلیم کی وجہ سے کبھی پاکستان نہ آیا تھا اور نہ ہی اسے یہاں آنے کی اجازت کبھی ملی تھی، لیکن اب وہ خود بھی ایک پچیس، چھبیس سالہ خوبرو نوجوان تھا اور جب وہ میڈیکل کے آخری سال میں تھا اور اس کے امتحان ہورہے تھے تو اچانک اسے امی کا فون گیا۔ طاہرہ ان دنوں خاصی بیمار تھی۔ فون پہ انہوں نے اسے آنے کے لیے کہا تھا۔ طاہرہ نے ممنون کو مزید یہ بھی کہا کہ وہ اس کی شادی اس لڑکی

سے کرنا چاہتی ہیں جس کا وہ بچپن سے ذکر کرتی آرہی تھی۔ ان کی بھی خواہش تھی کہ وہ مرنے سے پہلے ممنون کو مل لیں، مگر جب وہ یہاں پہنچا تو اس کی امی ظاہرہ اس کے آنے سے پہلے ہی مرگئی تھیں اور وہ لڑکی بھی یہاں نہیں تھی، ممنون ہاشم اس دن اپنی ماں کے کمرے میں گیا تو اسے ساری چیزیں ویسی ہی لگیں، جیسی وہ بچپن میں یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ یہاں سے گیا تھا تو اس کی ماں بہت روئی تھی، مگر آج وہ ان کی تصویر سامنے رکھے رو رہا تھا۔ وہ تو کب سے انہیں ملنے کا خواہش مند تھا، مگر ظاہرہ نے خود ہی اسے یہاں آنے سے منع کر رکھا تھا اور جب بلایا بھی تو انتظار کیے بغیر ہی چلی گئی تھی۔ ممنون ہاشم بلک بلک کر رو رہا تھا، جیسے وہ اب بھی چار پانچ سال کا چھوٹا بچہ ہو۔ اتنا تو وہ اس وقت بھی نہ رویا تھا جب اس کے والد نے اس کو ماں سے علیحدہ کر دیا تھا اور واپسی کی راہ بند کر دی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش جب پاپا مجھے ساتھ لے کے جا رہے تھے تو میں ضد کر کے امی کے پاس رہ جاتا، مگر اب سوائے افسوس کے وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا، امی کی ڈائری بھی اس نے دیکھی تھی جوان کے ماضی کی یادگار تھی۔ کتنی ہی جگہوں پر انہوں نے اس لڑکی کو اپنی بہو بنانے کی خواہش لکھی تھی۔ ممنون ہاشم نے ڈائری کے آخری صفحات پر لکھا تھا۔

''شاید میری یہ خواہش نہ پوری ہو۔''

ان کی ڈائری کا لکھا ہوا ایک ایک حرف پڑھنے کے بعد ممنون ہاشم نے دل کی گہرائیوں سے فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنی ماں کی یہ خواہش ضرور پوری کرے گا۔ ''اس لڑکی سے شادی ضرور کروں گا جو میری ماں کی پسند ہے جس کے بارے میں انہوں نے اس کے بچپن سے اب تک کی تمام باتیں لکھ رکھی تھیں۔

ممنون اپنے بیڈ روم میں بھی گیا تھا، جو کبھی اس کا ہوا کرتا تھا، مگر اس کے بعد اس لڑکی کا جو اس کے گھر

آوازیں

میں زندہ ہوں
تمہاری نغمگی محسوس کرتا ہوں
وہ زندہ آوازیں
جو ہیں میری سماعت میں'
مجھے سونے نہیں دیتیں
تمہارے خواب کا حصہ
مجھے ہونے نہیں دیتیں

شاعر۔ حامد علی سید

میں رہتی تھی، جس کی تمام چیزیں وہاں رکھی تھیں اور پھر ممنون وہاں سے انکل آفندی کے گھر آیا تو انہوں نے اسے آفر کر دی کہ وہ ان کے اسپتال میں کام کرے۔ انہیں یقین تھا کہ ممنون ہاشم ایک کامیاب ڈاکٹر ہے۔ انکل آفندی کا روّیہ ممنون کے ساتھ بالکل دوستانہ تھا۔ وہ تھے بھی خاصے خوش مزاج اور ممنون ہاشم کو بالکل اپنا بیٹا سمجھتے تھے، جبکہ ممنون ہاشم بہت سنجیدہ طبیعت کا تھا اور یہ سنجیدگی اس کی طبیعت کا خاصہ تھی، انکل آفندی پاپا کے کلاس فیلو تھے اور پھر وہ جب بھی انگلینڈ جاتے ان ہی کے ہاں رہتے تھے۔

☆......☆......☆

شہینہ کو اسکول جاتے ہوئے آج تیسرا چوتھا دن تھا۔ وہ بہت ایکسائیٹڈ تھی، مگر واپسی پر اسے اماں کے تیور کچھ بدلے بدلے سے لگے تھے، مگر اس نے اس کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا تھا۔ چوں کہ وہ تھک کر آئی تھی، اس لیے بھی، مگر شام کو نازو نے اسے جو خبر سنائی تھی وہ اس کی ساری خوشی غارت کرنے کے لیے کافی تھی۔ نازو نے بتایا کہ ابا اور اماں نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔ یہ سن کر وہ خاصی دل گرفتہ ہوئی کہ اس کو بتائے بغیر انہوں نے یہ سب کیسے کرلیا ہے۔

جب مزید اس پر انکشاف ہوا کہ چوہدری پہلے سے شادی شدہ ہے اور اس کے بچے بھی ہیں تو وہ بہت دکھی ہوئی کہ اس کی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ ہوگیا اور اسے اب بتایا جارہا ہے، وہ ساری رات سو بھی نہ سکی آج بار بار اسے امی یاد آتی رہی کہ ''اگر وہ ہوتی تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ کہنے کو تو یہ میرے ماں باپ ہیں مگر مجھے خود ہی کنویں میں دھکیل رہے ہیں۔'' شہینہ سوچ رہی تھی۔ صبح نہ سونے کے باوجود بھی وہ اسکول جانے کے لیے تیار۔ ہوگئی، کیوں کہ اسکول میں اس کا دل لگ گیا تھا۔ وہ باہر نکلنے لگی تو اماں نے منع کردیا۔ ''کہ آج کے بعد تم اسکول نہیں جاؤ گی اور اگلے ہفتے نکاح کا بھی بتایا تو شہینہ کے تو جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں اتنی جلدی شادی کہ حق میں نہیں ہوں۔ شہینہ بغیر سمجھے اماں کو قدرے بلند آواز میں کہہ گئی، یہی کچھ کہنے کی دیر تھی کہ اماں تو تو پھٹ پڑیں۔

''اچھا فیر توں ساری زندگی بیٹھ کر ہمارے سینوں پر مونگ دلنا۔''

اماں نے اسے وہ کھری کھری سنائی کہ وہ پیچ و تاب کھا کے رہ گئی۔ شہینہ کیا کرتی وہ رونا شروع ہوگئی تھی۔ چوہدری حیدر کو بھی شادی کی جلدی تھی۔ وہ ایک ہفتے میں نکاح کرنا چاہتا تھا اور یہ ہی ہوا تھا ۔نوراں اور کرم دین نے اسے تاریخ دے دی اور کسی نے شہینہ سے پوچھنے کی بھی رحمت نہ کی۔

چوہدری حیدر کے گھر سے رشتہ ہونے کی خوشی میں ڈھیر ساری مٹھائی آئی تھی، جسے نوراں اس رشتے داروں اور محلے میں بانٹ رہی تھی۔ شہینہ نے کیا سوچا تھا اور کیا ہورہا تھا۔ آج ہر کوئی خوش تھا، مگر اس کے دل پر تو جیسے چھریاں چل رہی تھیں۔ کسی کو بھی فکر نہیں تھی، ایک نازو ہی تھی جسے شہینہ سے ہمدردی تھی اور وہ شہینہ کو سمجھانے لگی تھی کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا، اس لیے تم پریشان نہ ہو یہی ہم سب کے لیے بہتر ہے۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر ممنون ہاشم ہر چیز کو مکمل فراموش کر کے اپنا فریضہ انجام دے رہا تھا، حتیٰ کہ وہ اس لڑکی کو بھی بھول چکا تھا جس کے لیے یہاں رکا ہوا تھا۔ انکل آفندی بھی بہت خوش تھے کہ ان کا اسپتال جو انہوں نے شہر کے قریب ایک گاؤں میں بنوایا تھا وہ اب اچھا خاصا چل رہا تھا۔ ڈاکٹر ممنون ہاشم بھی یہیں رہتا تھا۔ اکثر ہی وہاں دور قریب کے تمام گاؤں سے مریض آتے تھے اور یہی واحد گاؤں تھا جو اسکول اور اسپتال جیسی نعمتوں سے مزین تھا۔ اگرچہ دونوں پرائیوٹ تھے مگر پھر بھی یہاں کے لوگ خوش تھے، ورنہ تو دوسرے گاؤں میں تو یہ بھی نہ تھے۔ ڈاکٹر ممنون ہاشم گھر جانے کے لیے نکل رہا تھا جب انکل آفندی نے اسے قریبی گاؤں میں ایک مریض کو چیک کرنے کے لیے کہا۔ وہ خود مصروف تھے اس لیے ممنون ڈاکٹر ممنون ہاشم کو جانا پڑا۔ ویسے تو مریض خود ہی یہاں آتے تھے، مگر انکل آفندی کا کہنا تھا کہ یہ کوئی خاص مریض ہے۔ ممنون ہاشم نے گاڑی کو بیک کر کے دوسری طرف موڑا اور اب وہ چاہتا تھا کہ جلد ہی وہاں سے واپسی ہوجائے، کیوں کہ اسے گھر بھی پہنچنا تھا۔

☆......☆......☆

نوراں باہر عورتوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ جب نازو اماں کی آنکھ بچا کر چلی آئی تھی، اماں نے اسے کچھ کام کہا تھا، لیکن وہ جانتی تھی کہ شہینہ اب بھی کمرے میں بیٹھی رو رہی ہوگی۔ جب سے اس کا رشتہ چوہدری حیدر کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ ہر وقت پریشان رہتی یا پھر چھپ چھپ کر رونے لگتی۔ نازو کو اس پر ترس بھی آتا کہ وہ ان

چیزوں کی عادی نہیں تھی، لیکن وہ خود بھی مجبور تھی۔ شادی میں صرف ایک دن رہ گیا تھا، بلکہ شادی بھی کیا صرف نکاح ہی تھا۔ نازو اسے سمجھانے لگی، شہینہ کے رونے میں اور بھی تیزی آ گئی کہ نازو کتنی آسانی سے کہہ رہی تھی۔

''تو چوہدری کے گھر میں عیش کرے گی۔ دیکھو نا شاداں باجی کا شوہر بھی چوہدری کا نوکر ہی ہے پر ٹوں تو رانی بن کر رہے گی۔''

وہ اسے کیسے بتاتی کہ میں اپنا جیون ساتھی کس روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں، لیکن جب نازو نے کہا۔ ''اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو بہت خوش ہوتی۔'' تو شہینہ کے بہتے آنسوؤں پر جیسے کسی نے بند باندھ دیا ہو۔

''کیا واقعی اگر تمہاری شادی چوہدری حیدر سے ہو جائے تو تمہیں خوشی ہوگی۔''

شہینہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے نازو سے کہنے لگی۔

''ہاں تو اور کیا؟'' کیا ہوتا اگر میں اس کی بیوی بنتی، پتا ہے مجھے تو چوہدری حیدر بہت اچھا لگتا ہے۔ پورے پنڈ میں اس جیسا کوئی بندہ نہیں ہے۔ شہینہ کو تو جیسے کوئی روشنی کی کرن میں مل گئی۔

''کیا واقعی اگر میں تمہاری شادی اس سے کرا دوں تو؟''

وہ نازو کو بغور کھوجنے والے انداز میں دیکھنے لگی، لیکن نازو افسردہ لہجے میں کہنے لگی۔

''یہ نہیں ہو سکتا، کیوں کہ چوہدری نے تمہیں خود پسند کیا ہے اور وہ شادی بھی تم سے ہی کرے گا۔''

شہینہ اب بالکل سنجیدہ تھی اور اسے کہہ رہی تھی۔

''کوئی تو حل سوچو کہ تمہاری بھی خوشی تمہیں مل جائے اور میری پریشانی بھی ختم ہو جائے۔''

''دیکھو یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم یہاں نہ ہو تو مجھے وہ مل جائے اور دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے ہوتے ہوئے یہ ناممکن ہے۔'' نازو نے کہا تو شہینہ کہنے لگی۔

''ٹھیک ہے میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

وہ تو پہلے سے ہی سوچ بیٹھی تھی کہ اگر ''مجھے یہاں سے فرار بھی ہونا پڑا تو بھی ایسا کر گزروں گی۔'' لیکن اب جب نازو نے اسے کہا کہ تمہارے نہ ہونے کی صورت میں وہ مجھے مل سکتا ہے تو وہ اپنی اس سوچ کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے تیار ہو گئی۔

''مگر تم جاؤ گی کہاں۔'' نازو نے پوچھا تو اس نے کہا کہ اپنے گھر جہاں میں پہلے رہتی تھی۔ وہاں میری دوستیں بھی ہیں، بس تم صرف میرا ساتھ دو، تو نازو کچھ سوچتے ہوئے تیار ہو گئی، کیوں کہ چوہدری کو وہ شروع سے ہی پسند کرتی تھی، مگر اب اسے پانے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ وہ کیوں پیچھے ہٹتی۔ کوئی تو حل ہو؟ شہینہ کہہ رہی تھی۔

''ہاں ہمارے پاس صرف آج کا دن ہے اور یہ سب کچھ آج رات ہی کرنا ہے۔'' اور پھر وہ اسے یہاں سے نکلنے کا راستہ بتانے لگی۔

شہینہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ جس گاؤں میں وہ پڑھانے جاتی ہے، وہاں پہنچنا ہے اور وہ راستہ اسے اچھی طرح یاد بھی تھا۔ وہاں سے آگے شہر پہنچنا تھا۔ جو اس گاؤں سے آگے آسانی سے وہ پہنچ سکتی تھی اور پھر وہ دونوں مکمل منصوبہ بندی کرنے لگی۔

☆......☆......☆

چوہدری حیدر غصے کی حالت میں ٹہل رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسے ہو سکتا ہے، سارا گاؤں جانتا تھا کہ آج اس کی شادی کرم دین کی بیٹی سے ہے، مگر کرم دین کو گھور گھور کر دیکھتا اور پھر ہاتھ کا مکا بنا کر دوسرے ہاتھ پر مارتا اور دوبارہ ٹہلنے لگتا۔ کرم دین اس کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا

کہ اب شہینہ کے ساتھ بہت بُرا کرے گا۔ چوہدری، چوہدری کے بندے ہانپتے ہوئے آئے اور اسے بتانے لگے کہ دور تک اس کا نشان نہیں ملا۔ چوہدری کو اپنی بے عزتی پر غصہ تھا، اس نے کرم دین کو گھر بھیج دیا اور اپنے بندوں کو دوبارہ تلاش کرنے کے لیے بھیج دیا، مگر جب دوبارہ کرم دین آیا تو اس نے اپنی بیٹی نازو کا نکاح کرنے کے لیے کہا۔ چوہدری حیدر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''ٹھیک ہے اگر اس طرح لوگوں کے منہ بند ہو سکتے ہیں تو یہ ہی ٹھیک ہے، لیکن میں اس کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔ وہ میری دلہن نہیں بنی تو زندہ بھی نہیں رہے گی اور پھر نازو کا نکاح چوہدری سے کر دیا گیا۔ نازو بھی کوئی شہینہ سے کم نہیں تھی، لیکن شہینہ چوہدری کے لیے خاص تھی۔ نازو نے جیسا چاہا بالکل ویسا ہی ہوا تھا، وہ جانتی تھی کہ شہینہ کے جانے کی صورت میں چوہدری کے ساتھ اس کا ہی نکاح ہوگا۔

☆......☆......☆

اچانک سامنے سے بھاگتے ہوئے کوئی آ رہا تھا۔ ''گاڑی کے ٹائر چرچرانے کی آواز کے ساتھ وہیں رک گئے۔ ڈاکٹر ممنون ہاشم گھبرا گئے تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھا اچانک اتنی تیزی سے سامنے آیا تھا کہ گاڑی کو بریک لگانے کے باوجود بھی ٹکرا گیا تھا اور لڑکھڑاتے ہوئے دور زمین پر جا گرا تھا۔ ممنون ہاشم تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا، سامنے ہی ایک لڑکی بے سدھ پڑی تھی۔ ممنون نے غور سے دیکھا۔ وہ کوئی لڑکی تھی اور اب بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ممنون ہاشم کے تو جیسے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جلدی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور اسے اٹھا کر سیٹ پے لٹا دیا۔ وہ بہت تیزی سے گاڑی کا دروازہ بند کر کے گھوما اور اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہی گاڑی زن سے اُڑا لے گیا۔ اسپتال میں پہنچ کر سب سے پہلے اس کے سر پر پٹی باندھی اور پھر اس کو ہوش میں لانے کے لیے جت گیا۔ انکل آفندی کو بھی اس نے انفارم کر دیا تھا۔ وہ بھی وہاں آ گئے۔ ممنون ہاشم حیران بھی تھا اور پریشان بھی کہ آخر یہ لڑکی کون ہے جو اچانک سامنے آ گئی تھی۔ چوٹیں زیادہ تو نہیں لگی تھیں مگر سر میں لگنے والے گہرے زخم اور خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ لڑکی انکل آفندی کی منتیں کرنے لگی کہ ''آپ مجھے شہر چھوڑ آئیں۔'' لیکن آفندی انکل پریشان ہو گئے، پھر انہوں نے اس پیار سے ساری بات پوچھی تو اس نے سب کچھ بتا دیا، جسے سن کر وہ پریشان ہو گئے کہ معاملہ بہت زیادہ سیریس تھا، کیوں کہ ہاشم کے بندے بھی وہاں تک پہنچ گئے تھے اور اب اسے ساتھ لے کر جانے کا کہہ رہے تھے۔ انکل آفندی نے اسے ساتھ بھیجنے سے انکار کر دیا تھا اور اب وہ دھمکیوں پر اُتر آئے تھے۔ انکل آفندی نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔

ممنون بھی پریشان تھا، ساری رات وہ سو بھی نہ سکا تھا۔ چوہدری کو اطلاع ملی تو وہ بھی وہاں آ گیا۔ اُس نے کہہ دیا، ٹھیک ہے ہم اُسے گولی نہیں مارتے، وہ ہمارے گاؤں کی عزت ہے مگر ہماری ایک شرط ہے کہ اگر اس کے ساتھ کوئی شادی کرے، ورنہ دوسری صورت میں ہمارے حوالے کر دے اور پھر ہم اپنی مرضی کریں گے۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ کم از کم گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا اور دوسری طرف انکل آفندی اس لڑکی کی زندگی بچانے کے لیے ممنون کو اس کے ساتھ شادی کرنے کے لیے مجبور کرنے لگے اور وہ مسلسل انکار کیے جا رہا تھا۔ شہینہ اب بہت زیادہ خوف زدہ تھی اور وہ رو رہی تھی۔

اگر یہاں سے بچ کر نکل جاتی تو شاید بچ جاتی

مگراب زندگی کا فیصلہ کسی اور کے ہاتھ میں تھا اور یہ ہی وہ وقت تھا جب شاید روتے ہوئے اللہ نے اس کی سن لی اور انکل آفندی کے بار بار کہنے پر وہ اس کے ساتھ شادی کرنے کے لیے مان گیا، تب اس کا نکاح شہینہ کے ساتھ کر دیا گیا۔ چوہدری حیدر بہت غصے میں تھا، کیوں کہ اس کا تیر نشانے پر نہیں لگا تھا، مگر پھر نازو کا سوچ کر وہ واپس چلا گیا اور شہینہ ممنون کی بیوی بن کر اس کے ساتھ چلی گئی۔

شہینہ اپنے بیڈ پر لیٹے سوچ رہی تھی کہ حالات ایسے بھی ہو جاتے ہیں میں جس گھر کی تمنا کرتی تھی وہی مجھے ملا ہے، لیکن یہ شخص ممنون ہاشم کیا ہے؟ جس نے مجھ پر ترس کھا کر شادی تو کر لی ہے لیکن اب اس کا رویہ؟ اسے جھرجھری سی آ گئی اور گزری ہوئے پندرہ دنوں کی ایک ایک بات اس کے ذہن میں کسی فلم کی مانند چلنے لگی۔ اس شخص کی ہر ہر ادا سے میرے لیے ناپسندیدگی جھلکتی ہے، اچانک جیسے ایک نقطے پر آ کر وہ ٹھہر سی گئی۔

''اوہ! میرے خدایا'' وہ اُٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئی، سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا، آنسوؤں کی ایک قطار روانی سے بہنے لگی، کتنا کٹھور ہے یہ شخص۔ صبح نکلتے وقت وہ کتنے آرام سے کہہ گیا تھا۔

''تم جیسی لڑکیاں اپنی عیاشی کے لیے سب کچھ کر لیتی ہیں۔ تم اگر یہاں رہنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے، میں تو کچھ دنوں بعد یہاں سے واپس جا رہا ہوں اور دوسری صورت میں اگر تم طلاق چاہو گی تو وہ بھی دے دوں گا، کیوں کہ میں اپنے والدین کو تمہارے بارے میں کوئی بھنک بھی نہیں پڑنے دینا چاہتا۔''

''اوہ میرے خدا! اتنی تحقیر، اتنی نفرت، اس سے تو بہتر تھا میں اسی شخص حیدر علی کی بیوی ہوتی۔ وہ ابھی انہی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک چونک گئی۔ وہ شخص کمرے سے باہر کسی لڑکی سے باتیں کر رہا تھا اور وہ اس لڑکی کی آواز کو بھی اچھی طرح پہچانتی تھی۔ شہینہ چلتی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔ تھوڑا سا دروازے کو نیم وا کر کے وہ ان کی باتیں سننے لگی۔ وہ اس کی فرینڈ ثانیہ تھی، جو ممنون سے کہہ رہی تھی۔

''بہت افسوس ہوا آپ کی والدہ کا۔''

وہ ایکچوئلی میں اپنے فادر کے ساتھ دبئی گئی ہوئی تھی، کل ہی واپسی ہوئی ہے اور آج میں اسی سے ملنے آئی ہوں، مگر آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ یہاں نہیں رہتی۔

''شاید اس کے والدین اسے واپس لے گئے ہیں۔'' ممنون ہاشم نے اس لڑکی کو بتایا اور شہینہ کے حلق میں جیسے آنسوؤں کا گولہ سا پھنس گیا ہو۔

''کاش میں نہ گئی ہوتی۔ کاش! آہاں!'' شہینہ سوچ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ممنون ہاشم نے شادی کے بعد اس لڑکی سے بالکل قطع تعلق کر رکھی تھی بلکہ جس دن وہ اسے اپنے گھر میں لایا تھا، بالکل خاموش تھا اور آتے ہی اپنے کمرے میں چلا گیا تھا، جو پہلے امی کا تھا۔ جاتے وقت صرف اتنا کہا تھا کہ ''محترمہ آپ اس کمرے میں جا کر سو جائیے۔'' مگر شہینہ کافی دیر چیئر پر بیٹھے رہنے کے بعد خود ہی اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی جو کبھی اس کا ہی تھا۔

ممنون ہاشم یہ سمجھتا رہا کہ یہ اَن پڑھ گاؤں کی لڑکی ہے جو اپنی غلطی کی وجہ سے میرے سر تھوپ دی گئی تھی۔ ایسے ہی دن رات گزر رہے تھے۔ وہ اس لڑکی سے مکمل کنارہ کشی کیے ہوئے تھے۔ اپنے لیے ناشتا بھی خود تیار کرتا تھا اور اسپتال چلا جاتا تھا۔ واپسی اس کی شام کو ہوتی تھی۔ وہ اس سے بات کرنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ پتا نہیں کیوں شہینہ کی خاموشی کو وہ کیا رنگ دے بیٹھا تھا۔ شہینہ کو ویسے تو یہاں کوئی

مشکل نہیں تھی۔ اپنے کھانے پینے کا انتظام وہ خود کر لیتی تھی، مگر آج وہ اتنے دنوں بعد اس کے پاس آیا تھا۔ وہ برتن دھونے کے لیے اُٹھنا ہی چاہ رہی تھی، جب وہ اپنا فیصلہ سنا گیا۔ ایک دفعہ پہلے شہینہ نے اُس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ سنی اَن سنی کر گیا۔ تھا وہ سوچ رہی تھی کہ یعنی اس شخص کی زندگی میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ شہینہ نے ہچکیوں سے روتے ہوئے ابھی ابھی صوبیہ آنٹی کو اپنے بارے میں ساری باتیں بتائی تھیں۔ وہ آج یہاں آئیں تو انہوں نے شہینہ کو دیکھا تب ہی اس کے پاس بیٹھ کر اس سے حال احوال پوچھنے لگیں۔ انہوں گزرے دنوں کے بارے میں پوچھا تو شہینہ ایک ایک بات بتائی چلی گئی۔ صوبیہ آنٹی ساری بات سن کر مسکرا دیں۔

پگلی تو تم اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔ اب وہ بچارہ کیا جانے کہ اس کی بیوی وہ ہی جسے وہ بنانا چاہتا تھا۔

''کیا مطلب۔'' شہینہ نے کہا۔

''مطلب یہی ہے بیٹا کہ تمہارے جانے کے بعد جب وہ یہاں آیا تو میرے پاس آیا تھا اور تم لوگوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے اُسے تمہاری دی ہوئی چابیاں پکڑائیں اور ساتھ ہی ظاہرہ کی وفات کا بھی بتایا تھا، لیکن پھر کچھ روز بعد آ کر وہ تمہارے بارے میں پوچھنے لگا اور اگر میرے پاس تمہارا ایڈریس ہوتا تو میں اُسے ضرور دیتی۔ صوبیہ آنٹی کوئی غیر نہیں تھیں، وہ ظاہرہ کی بہت اچھی دوست تھیں اور شہینہ کو لگا جیسے ان کے ساتھ اپنا دُکھ شیئر کر کے وہ ہلکی پھلکی ہو گئی ہو۔ کتنے دنوں بعد کوئی اپنا ملا تھا جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ روئی تھی اور صوبیہ آنٹی کی شفقت اور پیار سے سمجھانے سے وہ کافی حد تک نارمل ہو گئی تھی۔ پھر تو جیسے روٹین بن گئی۔ آنٹی صوبیہ اکثر یہاں آ جاتیں یا وہ ان کے گھر چلی جاتی۔ ان کا گھر بالکل ساتھ ہی تھا۔ چھٹی کے دن بھی وہ زیادہ تر ادھر ہی گزارتی۔ ممنون ہاشم بھی حیران تھا کہ گاؤں کی عام سی لڑکی کتنی جلدی یہاں کے ماحول میں گھل مل گئی ہے اور پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات بھی قائم کر بیٹھی ہے اور تو اور اس کی یہاں کافی دوستیں بھی بن گئی ہیں، شہینہ نے ایک دفعہ سوچا بھی کہ اسے اپنے بارے میں بتا دے لیکن پھر اس کا رویہ یاد آتا تو...... اور اب وہ جیسے اس کی طرف سے بالکل بے نیاز تھی۔ اس شخص نے قطع تعلق کی تھی تو وہ بھی اس سے بالکل کٹ کر رہ گئی تھی اور ممنون ہاشم کو اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا۔

''ٹھیک ہے اگر وہ یہاں اکیلے رہنا چاہتی ہے تو اس کی مرضی۔ ویسے بھی یہ گھر خالی ہی ہے۔ یہ سوچ کر وہ جیسے مطمئن سا ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

ممنون ہاشم واپسی کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے اپنے کپڑے نکال کر ''سوٹ کیس'' میں رکھے اور الماری سے امی کی ڈائری نکالنے لگا تو دوسری طرف اسے تصویروں کا ایک البم رکھا نظر آیا، جسے پہلے اُس نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل کتابوں کی ایک سائیڈ پر پڑا ہوا تھا۔ ممنون وہ البم لیے بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا اور ایک ایک کر کے تصویریں دیکھنے لگا۔ سب سے پہلی تصویر اس کی اپنی ہی تھی، پھر امی کی ابو کی اور مختلف تصویریں جو اس کی امی ابو کے ساتھ کھنچی ہوئی تھیں، پھر اچانک ایک پانچ سال کی لڑکی کی جو امی کے ساتھ تھی اور اگلی ہر تصویر میں وہ لڑکی امی کے ساتھ تھی، پھر اس لڑکی کی مختلف تصویریں اسکول کالج میں تھیں اور وہ اس لڑکی کو پہچان گیا تھا۔ وہ تصویریں شہینہ ہی کی تھیں۔

ممنون ہاشم پہلے تو اس کی تصویر کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا، مگر اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

وہ جس لڑکی کو بھول چکا تھا کہ اسے تلاش کرنا ہے، وہ تو اس کے بہت قریب تھی۔ ممنون کچن کے دروازے پر آ کر رک گیا، سامنے وہی لڑکی تھی۔ اس نے وہی سوٹ پہن رکھا تھا جو ایک تصویر میں بھی پہنا ہوا تھا، وہ کتنی مطمئن اور پرسکون کھڑی چائے بنارہی تھی، ہلکے پنک کنٹراسٹ میں سوٹ تھا۔ بالوں کو چوٹی میں باندھے ہوئے تھے اور لمبے بالوں کی چوٹی پشت پر جھول رہی تھی۔ ممنون کو ایک دم ہی وہ لڑکی اپنی لگی۔ اسے لگا جیسے یہی میری منزل ہے اور جس کی تلاش میں، میں راستہ بھول گیا تھا۔ شہینہ کی چوں کہ اس کی طرف پشت تھی، اس لیے وہ اسے نہ دیکھ سکی تھی اور وہ کتنی ہی دیر اس لڑکی کو دیکھتا رہا تھا، پھر ہلکے سے کھنکارا۔

''ہوں! تو چائے تیار ہے۔'' وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے شروع سے ہی ایسا ہو۔

شہینہ تیزی سے پلٹی تو سامنے وہی دشمن جاں تھا۔ آنکھوں میں شرارت لیے، اس کے ہونٹوں پر پر اسرار مسکراہٹ تھی۔ شہینہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ تو بالکل ایک الگ ممنون لگ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''تم تو دلہن بنے بغیر اتنی پیاری لگ رہی ہو اور جب دلہن بنو گی تو پھر۔''

وہ کانوں کو کھجاتے ہوئے اس کی طرف سرشار ہو جانے والے انداز میں دیکھنے لگا۔ شہینہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، پھر بھی وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''پتا ہے شہینہ میں چاہتا ہوں کہ ہم بہت جلد شادی ڈکلیئر کریں، پاپا لوگوں کو میں انفارم کر رہا ہوں، اس سے پہلے تیاری بھی تو کرنی ہے۔ اب تم بتاؤ کہ کیا کریں۔''

''شہینہ یہی سمجھی کہ آنٹی نے اسے ساری بات بتادی ہے۔ تب ہی وہ مڑ کر سنجیدگی سے کہنے لگی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

''آپ کو پتا ہے کہ میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہوں۔'' ابھی وہ کچھ اور بھی کہتی اُسے اپنی بے عزتی یاد آنے پر غصہ آ رہا تھا، مگر ممنون نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں۔ تم صرف میری بیوی ہو اور آئی ایم سوری، آئی ایم ریئلی ویری سوری۔ میں نے تم سے بہت زیادتی کی ہے۔'' وہ واقعی اپنے کیے پر نادم تھا۔ اور پھر وہ شہینہ کی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی نرم پوروں سے صاف کرنے لگا۔ شہینہ تو جیسے اس کی محبت کے لیے ترسی ہوئی تھی۔ وہ اپنے تمام دکھ، ساری رنجشیں بھلا کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''شہینہ اگر مجھے ذرا سا بھی پتا ہوتا نا کہ تم وہی ہو، جو نہ صرف میرا خواب تھیں بلکہ میری امی کا بھی خواب ہو، تو ایسا کبھی بھی کچھ نہ ہوتا۔ اب میں وہ غلطی نہیں دہراؤں گا، جو میرے پاپا نے کی تھی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''پتا ہے آج امی زندہ ہوتیں تو وہ ہمیں ایک جگہ دیکھ کر کتنا خوش ہوتیں۔ آج نہ صرف ان کی روح خوش ہو گی، بلکہ میں خود بھی بہت خوش ہوں کہ کہیں انجانے میں تمہیں کھو نہیں بیٹھا۔ ہم دونوں ایک ہیں۔''

یہ سب سُن کر شہینہ بھی ہولے سے مسکرادی۔ زندگی کی ساری کلفتیں یکدم ہی خوشیوں میں ڈھل گئی تھیں اور دونوں کے چہروں پر محبت کے رنگ دمکنے لگے تھے۔

☆☆......☆☆

خواہشوں، امیدوں اور ہر پل رنگ بدلتی زندگی سے آباد، ناول کی اکیسویں قسط

خلاصہ

رفیق احمد اور نفیس احمد دو بھائی ہیں جن کے درمیان بہت محبت اور رکھ رکھاؤ ہے۔ رفیق احمد کے دو بچے عرفان اور زرقون ہیں، جبکہ نفیس احمد کے دو بیٹے احمد، فراز اور ایک بیٹی مریم ہے۔ مریم ایک سلیقہ شعار اور درمیانی صورت وشکل کی کم پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ مریم کی منگنی عرفان سے ہوگئی ہے۔ عرفان سے مریم بے انتہا محبت کرتی ہے، جبکہ زرقون، جو بے حد خوب صورت، خوش اخلاق اور زندہ دل لڑکی ہے، یونیورسٹی سے ماسٹر کررہی ہے۔ اس کا رشتہ اپنا تایازاد فراز کے ساتھ طے ہے۔ فراز اور زرقون ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں۔ رفیق احمد کی بیوی فہمیدہ بیگم ایک سلجھی ہوئی خدمت گزار خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے میکے پر بے حد جان چھڑکتی ہیں۔ میکے میں اُن کی بھاوج رقیہ بیگم بے حد حسین عورت ہیں۔ رقیہ بیگم کو ہمیشہ سے اپنی نند، فہمیدہ بیگم سے حسد ہے کہ وہ کس قدر آسودہ اور پرُتعیش زندگی بسر کرتی ہیں اور اُن کے میاں انہیں کس قدر چاہتے ہیں لیکن وہ اپنا حسد کبھی ظاہر نہیں کرتیں۔ حالات خراب ہونے کے باعث عرفان چند دن رقیہ بیگم کے گھر میں گزارتا ہے، جہاں وہ ثمینہ (جو اُس کی ماموں زاد ہے) کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے اور مریم سے منگنی توڑ دیتا ہے۔ مریم کو منگنی ٹوٹنے کا گہرا صدمہ ہوتا ہے اور وہ بیمار ہوجاتی ہے۔ ثمینہ سے شادی کے لیے فہمیدہ بیگم، بیٹے کا ساتھ دیتی ہیں جس کی وجہ سے رفیق احمد کے دل میں بیوی کی طرف سے بال آجاتا ہے۔ فہمیدہ بیگم کو اُمید ہوتی ہے کہ اُن کی بھتیجی آکر سب کا دل جیت لے گی۔ فطرتاً وہ دل کی نرم ہوتی ہیں، اس لیے انہیں مریم کی تکلیف کا بھی احساس ہوتا ہے اور وہ دل میں عہد کرتی ہیں کہ وہ مریم کے لیے اچھا سا رشتہ خود تلاش کریں گی۔ جہاں آرا بیگم جو نفیس احمد کی بیوی ہیں، مریم کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد رفیق احمد اور اُن کے گھروں سے سخت ناراض ہوجاتی ہیں۔ ثمینہ اور عرفان کی شادی ہوجاتی ہے۔ عرفان بہت خوش، فہمیدہ بیگم مطمئن اور رفیق احمد اور زرقون اُداس ہوتے ہیں۔ شادی کے دوسرے دن جب زرقون اپنی کزنز کے ساتھ دلہن کو لینے جاتی ہے تو رقیہ بیگم، ثمینہ کو بھیجنے سے انکار کردیتی ہیں۔ نفیس احمد اس بات کو سُن کر چراغ پا ہوجاتے ہیں۔ فہمیدہ بیگم چاچی زلیخا کے ساتھ ثمینہ کو لینے جاتی ہیں، جہاں اُن کو رقیہ بیگم ایک دوسرے ہی روپ میں ملتی ہیں۔ چاچی زلیخا یہ خبر جہاں آرا بیگم کو سُنانے پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں آرا بیگم ایک رات کی دُلہن کے میکے بیٹھ جانے کا سُن کر دل ہی دل میں خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران رہ جاتی ہیں۔ زرقون کو اپنی مامی کے رویے کا بہت دُکھ ہوتا ہے۔ اُس کے دُکھ پر فراز محبت کے پھائے رکھتا ہے۔ آفتاب احمد جو ایک بہت بڑی کمپنی کے ایم ڈی ہیں، وہ نرگس جو زرقون کی دوست ہے اور جس کا مڈل کلاس سے تعلق ہے، اُس کو بے حد پسند کرنے لگتے ہیں، لیکن نرگس اُن کی پسندیدگی سے ناواقف ہے۔ عرفان اور ثمینہ کی شادی سے رفیق

احمد ناخوش ہونے کے باوجود زرقون کو سمجھوتہ کرنے کو کہتے ہیں۔ رفیق احمد ایک رکھ رکھاؤ والے خاندانی آدمی ہیں۔ اُن کے گھر کے کچھ اصول ہیں۔ ثمینہ اُن اُصولوں کی پروانہیں کرتی۔ جس پر اُن کو اعتراض ہوتا ہے۔ ثمینہ پھوپو کے گھر کو سسرال ہی سمجھتی ہے۔ اور وہ سسرال والوں کو تنگ کرنے کا کوئی موقع نہیں گنواتی۔ مریم روز...... روز کے رد کیے جانے کی وجہ سے چڑچڑی اور بیمار رہنے لگی ہے۔ نفیس احمد اور جہاں آرا بیگم بیٹی کی بدلتی ہوئی کیفیت سے بہت پریشان ہیں۔ نفیس احمد دیکھ رہے ہیں کہ حالات تیزی سے کروٹ بدل رہے ہیں، لہٰذا وہ زرقون کا جلد از جلد فراز کے ساتھ بیاہ کردینا چاہتے ہیں۔ فراز، زرقون کو بے حد چاہتا ہے۔ رقیہ بیگم چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر فہمیدہ بیگم سے سوال جواب کرنے کھڑی ہوجاتی ہیں اور ایسے موقعوں پر ثمینہ مظلومیت کی شاندار اداکاری کرتی ہے۔ عرفان، ثمینہ کا دیوانہ ہے۔ اُن دنوں جب عرفان کے سر پر ثمینہ کی محبت سوار ہوتی ہے، ایک خوب صورت، خوش مزاج لیڈی ڈاکٹر کا عرفان کی دکان پر آنا جانا شروع ہوجاتا ہے۔ ثمینہ نے اپنے رنگ دکھانے شروع کردیے ہیں۔ اُس کو فراز اور زرقون سے عجیب سا حسد محسوس ہونے لگا ہے۔ جہاں آرا کے مزاج میں رفیق احمد اور اُن کے گھر والوں کے لیے تلخی بڑھ رہی ہے۔ وہ فراز کو اُن کے گھر جانے سے منع کردیتی ہیں۔ رفیق احمد کی آنکھوں میں کالا پانی اُتر آیا ہے۔ اُن کی آنکھوں کا آپریشن ناکام ہوجاتا ہے۔ عرفان ڈاکٹر تابندہ کو کاروبار کے لیے سونا دے دیتا ہے۔ مریم بہت ساری نفسیاتی اُلجھنوں سے نکل کر آخر زندگی کی طرف قدم بڑھادیتی ہے۔ زرقون آفتاب کا نمبر حاصل کرکے اُس کو فون کرتی ہے۔ وہ دراصل یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ آیا وہ نرگس سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ جہاں آرا بیگم نے کھل کر رفیق احمد کے گھرانے، زرقون اور فراز کے رشتے کی مخالفت شروع کردی ہے۔ اس ساری صورت حال سے فراز بہت پریشان رہنے لگا ہے۔ زرقون سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ لیکن اُس کو سوائے اللہ کے آگے گڑگڑانے کے کچھ نظر نہیں آرہا۔ اِدھر ثمینہ نے ہنگامہ کھڑا کردیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ جلد از جلد الگ ہوجائے۔ مریم کا رشتہ ایک متوسط طبقے سے آتا ہے۔ جہاں آرا بیگم مریم کے رشتے سے بہت خوش ہیں لیکن زرقون اور رفیق احمد کے تمام گھر والوں کے ساتھ اُن کا رویہ بہت سرد ہوجاتا ہے۔ وہ فراز کو رفیق احمد کے گھر جانے سے منع کرتی ہیں۔ فراز بہت پریشان ہے لیکن نفیس احمد اُس کو حالات کو سنبھالنے کی اُمید دلاتے ہیں۔ زرقون جہاں آرا بیگم کے رویہ سے بہت دل برداشتہ ہے۔ ثمینہ ایک بیٹے کو جنم دیتی ہے۔ ثمینہ اور رقیہ بیگم نے سارے خاندان میں بدگمانیاں پھیلادی ہیں۔ فہمیدہ بیگم کے سارے رشتے دار اُن کی مخالفت کررہے ہیں، جس کا اُن کو بہت صدمہ ہے۔ عرفان نے ثمینہ کو بہت جلد الگ گھر لینے کی اُمید دلائی ہے۔ مرتضیٰ اور شیری کے جھگڑے دن بدن بڑھ رہے ہیں۔ شیری ایک مکمل امریکن عورت کا روپ دھار رہی ہے اور مرتضیٰ اس بات سے سخت نالاں ہے۔ وہ چاہتا ہے اللہ اُس کو اولاد دے دے۔ شاید اس طرح شیری کو گھر داری کا شوق پیدا ہوجائے۔ آفتاب اور نرگس کی محبت خوب صورت جذبوں کے ساتھ پروان چڑھ رہی ہے۔ لیکن زرقون اور فراز کی محبت تیز آندھیوں کی زد میں ہے۔ اللہ نے ثمینہ کو بیٹے سے نوازا ہے، فہمیدہ بیگم بہت خوش ہیں لیکن رقیہ بیگم ثمینہ کو اپنے ساتھ گھر لے گئیں اور روک لیا۔ اب ان کا مطالبہ ہے کہ ثمینہ کو الگ گھر لے کر دیا جائے۔ وہ چاہتی ہیں کہ فہمیدہ اپنا برسوں کا بسا بسایا گھر بیچ کر عرفان کو ورثہ دے دیں۔ فہمیدہ بیگم ان کے مطالبے سے بہت پریشان ہیں، رقیہ بیگم نے ان کے اور ان کے تمام گھر والوں کے خلاف پورے خاندان والوں کو بدگمان کردیا ہے، جس کا فہمیدہ بیگم کو بہت صدمہ ہے۔ مریم کا رشتہ طے ہوگیا ہے۔ جہاں آرا بیگم جہاں مریم کے رشتے سے خوش ہیں وہیں پرانے طے کردہ رشتوں کے بارے میں وہ بہت کچھ سوچ چکی ہیں۔ فراز جہاں آرا بیگم کے رویے کے بارے میں پریشان ہے لیکن نفیس احمد اس کو تشفی دیتے ہیں کہ جہاں آرا کا غصہ وقتی ہے۔ لیکن فراز مطمئن نہیں ہے۔ زرقون کے دل کو بھی اپنی تائی اماں کے سرد رویے کی وجہ سے عجیب سی بے چینی ہے۔ وہ فراز سے کہتی ہے، لیکن فراز اُس کو اطمینان دلاتا ہے۔ مریم اب بہت بدل گئی ہے۔ اُس میں ہونے والی ناخوش گوار تبدیلیاں جہاں آرا بیگم کے لیے اطمینان کا باعث ہیں۔ فہمیدہ بیگم اپنے میکے والوں کے رویے پر بہت دلبرداشتہ ہوجاتی ہیں وہ زرقون اور مریم سے اپنے دل کی حالت بیان کرتی ہیں اُن کی باتوں کا کچھ حصہ رفیق احمد بھی سُن لیتے ہیں۔ اُن کو احساس ہوتا ہے انجانے میں وہ بھی فہمیدہ بیگم کے ساتھ زیادتی کررہے ہیں وہ دل ہی دل میں فہمیدہ بیگم کو معاف کردیتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ وہ بھی اُن سے معافی مانگ لیں گے۔ لیکن کسی معافی تلافی کے بغیر فہمیدہ بیگم ایک رات جو سوتی ہیں تو سوتی ہی رہ جاتی ہیں...... وقار...... کو جہاں آرا بیگم کاروبار کے لیے پیسا دیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ انہوں نے بیٹی کے لیے سُکھ خرید لیے، لیکن وقار کا شکی مزاج مریم کو ہر وقت ڈستا رہتا ہے اور مریم کے مزاج میں چڑچڑاپن آجاتا ہے...... اِدھر آفتاب نرگس کے لیے اپنے والدین سے بات کرتا ہے...... اُس کے والد کہتے ہیں کہ انہوں نے اُس کے رشتے کے لیے اپنے دوست جنید سے اُن کی بیٹی حیا کے لیے بات کررکھی ہے۔ آفتاب یہ سن کر حیران رہ جاتا ہے...... جہاں آرا بیگم کے ساتھ ساتھ مریم بھی فراز کے ساتھ زرقون کی شادی کے خلاف ہے کیوں کہ مریم کا خیال ہے اگر اس کی شادی عرفان سے ہوجاتی تو اُس کو دن رات وقار کے طعنے تو سُننے کو نہ ملتے...... زرقون کے لیے فراز کی محبت سے اُس کو حسد ہونے لگتی ہے۔ جہاں آرا بیگم نے زرقون کے خلاف ایک محاذ کھڑا کررکھا ہے کیونکہ مریم نہیں چاہتی زرقون کی شادی فراز سے ہو۔ زرقون اور فراز بدلتے حالات

کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ زرتون فراز سے کہتی ہے کہ وہ وعدے کرے کہ وہ اُس کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ تو وہ ساری زندگی اُس کا انتظار کرنے کے لیے تیار ہے۔ رفیق احمد، رقیہ بیگم سمیت فہمیدہ بیگم کے سارے خاندان کو اپنے گھر آنے سے منع کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ثمینہ اور عرفان پر کوئی پابندی نہیں وہ جب جس کے گھر جانا چاہیں جا سکتے ہیں، لیکن اُن کے گھر کوئی نہیں آئے گا۔ مرتضیٰ اپنی ماں کے سمجھانے پر شیری سے ایک بار پھر سمجھوتے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ آفتاب حیا کو نرگس کے بارے میں بتاتا ہے وہ چاہتا ہے حیا اِس رشتے سے انکار کر دے۔ وہ حیا کو چائے پر لے کر جاتا ہے لیکن حیا کوئی جواب دیے بغیر اُٹھ کر چلی جاتی ہے۔ آفتاب پریشانی سے سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ثمینہ کو فہمیدہ بیگم کے بعد بہو ہونے کے ناتے گھر کی ذمے داری سپرد کی جاتی ہے۔ لیکن وہ حد سے زیادہ لاپروائی اور بے حسی کا مظاہرہ کرتی ہے اور یوں اُس کا اور زرتون کا پہلا جھگڑا ہوتا ہے۔ فراز اور زرتون کا رشتہ ختم کرانے کے لیے رقیہ بیگم، ہنو خالہ کے ساتھ مل کر ایسا چکر چلاتی ہیں کہ جہاں آرا بیگم فوری طور پر رفیق احمد کی بیٹی سے فراز کو دور کر دیتی ہیں اور فراز کا رشتہ مریم کی پسند سے طے پا جاتا ہے۔ نرگس کی شادی آفتاب احمد سے ہو جاتی ہے اور وہ لندن چلی جاتی ہے۔ مرتضیٰ، شیری کو کسی گورے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہے اور اسی وقت اسے طلاق دے دیتا ہے۔ موی کا رشتہ رفیق احمد نے طے کر دیا ہے اور اب وہ اس کی شادی کی تیاریوں میں مگن ہے۔ ڈاکٹر تابندہ عرفان کو د... چونا لگا کر رفو چکر ہو جاتی ہے اچانک......

(اب آپ آگے پڑھیے)

احمد کمال کو ایسا لگا جیسے ساری خوشیاں، اُس کی مٹھی سے نکل گئی ہوں لیکن اُس کے لب ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ ضوفی تو ایک شائستہ مزاج لڑکی تھی اور احمد کمال نے اُس کی آنکھوں میں رضا، آمادگی اور خوشی کے رنگ دیکھے تھے۔ جس طرح ایک عورت اپنے اوپر پڑنے والی ہر نظر کو پہچان لیتی ہے اسی طرح مرد عورت کی سپردگی اور محبت کو بھانپ لیتا ہے اور اس نے اُس کی خوشی کو محسوس کیا تھا جبھی تو ضوفی کو چھونے کی تمنا کی تھی۔ ضوفی جو اُس کی منگیتر تھی، وہ منگیتر جس کے لیے اُس نے اماں ابا سے ضد کی اور شاید زندگی کی آخری ضد......اور رقیہ کہہ رہی ہے کہ محبت لاحاصل رہے گی۔ ضوفی خوش نہیں ہے۔ لیکن کیوں؟

مجھے ایک دفعہ ضوفی سے بات کرنی چاہیے تھی۔ پوچھنا چاہیے تھا، میں نے غلطی کی، مجھ سے غلطی ہوگئی۔

''کیا آپ میری بات ضوفی سے کرواسکتی ہیں؟'' رقیہ جو بہت شاطر نگاہوں سے رفیق احمد کمال کو سوچوں کے بھنور میں ڈوبتے اُبھرتے دیکھ رہی تھی۔ جو اپنا تیر نشانے پر لگنے پر مسلسل اپنے آپ کو شاباش دے رہی تھی۔ رفیق احمد کمال کے سوال پر جیسے واپس حقیقت میں آ گئے۔

''بات!!'' رقیہ نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر سوچتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

''جی بات۔'' رفیق احمد کمال کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

''آپ رہے پڑھے لکھے ماڈرن سے لڑکے اور ضوفی......ضوفی کو تو آپ جانتے ہیں، لہسن ادرک کی خوشبو میں نہائی ایک کم پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ اُس میں نہ تو آپ کی طرح کانفیڈینس ہے اور نہ ہی بات کرنے کا طریقہ لیکن چلیے میں پھر بھی کوشش کرتی ہوں کہ وہ اپنے منہ سے آپ کو بتا دے کہ وہ کیوں خوش نہیں ہے۔'' دل ہی دل میں اپنے آپ کو شاباش دیتے ہوئے، چہرے پر حد درجہ سنجیدگی سجائے رقیہ نے احمد کمال کے دل میں شک کا ایک اور کانٹا بو دیا۔

سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے۔ سب خوش اور مگن تھے۔ رقیہ بھی مہمانوں میں موجود تھی۔ احمد کمال جب ہنستا تو اُس کے موتی کی لڑی جیسے دانت اُس کے دل پر بجلیاں سی گراتے، اُس کی سرمئی آنکھیں بہت کشادہ اور حسین لگتیں۔ آج وہ لوگ رفیق احمد کمال کی رسم کرنے آئے تھے۔ ایک دن پہلے ضوفی کی رسم ادا کی گئی تھی۔

سرخ بنارسی قمیض شلوار اور پھولوں کے زیور میں لدی ضوفی کا روپ رقیہ کے دل میں پھانس کی طرح چبھ گیا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک ایک پھول کو انگارہ بنا دے اور اُن انگاروں کی تپش سے ضوفی کا دہکتا بدن جل جائے۔ جل کر راکھ ہو جائے۔

''میں! میں کیسے اُن سے بات کر سکتی ہوں۔ رُقی تم جانتی تو ہو۔'' جب رُقی نے آ کر ضوفی (فہمیدہ) سے کہا کہ رفیق احمد کمال اُس سے تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ تو اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ کیوں نہیں بات کر سکتی، پھنسا کر شادی کرنے جا رہی ہے۔ ایسے زبردست لڑکے کو اپنے آگے جھکا لیا اور ایسی ننھی بن رہی ہے۔ کمبخت، ذلیل، منحوس کہیں کی، رقیہ نے ضوفی کی بات سُن کر دل ہی دل میں اُس کو بُرا بھلا کہتے ہوئے گالیوں سے نوازا، لیکن بس اتنا ہی کہا

''تم صحیح کہہ رہی ہو ضوفی، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میں نے رفیق بھائی سے کہا بھی تھا، لیکن اُن کا موڈ کافی خراب تھا۔ میرے خیال سے اِس رشتے میں اُن کی مرضی شامل نہیں ہے۔ ہر بات میں یہی کہہ رہے تھے کہ ہمارے ابا کسی کی کب سنتے ہیں۔ میرے خیال سے تمہارے ابا اور اُن کے ابا دوست ہیں نا، تو انہوں نے دوستی کی وجہ سے رشتہ ڈال دیا اور بیٹے سے نہیں پوچھا۔ کل جب ہم لوگ رسم کرنے گئے تھے تو تم بتول سے پوچھو کیسا منہ بنائے بیٹھے تھے دولہا میاں۔''

''اللہ تو بتو (بتول) نے بھی نوٹ کر لیا کہ اُن کا موڈ خراب ہے۔'' ضوفی کو ایک عجیب سی شرمندگی نے آن گھیرا۔

''اُن کا۔'' رقیہ کے منہ میں کڑواہٹ گھلی۔

''لو، ایک بتو کیا، عظمیٰ، سلمیٰ، بسمہ اللہ خالہ سب ہی نے نوٹ کیا۔ سب ہی کانا پھوسی کر رہے تھے۔'' رقیہ نے لہجے کو حد درجہ میٹھا کر کے، جانے والے رشتہ داروں کے نام ضوفی کو گنوائے۔

''اچھا چھوڑو یہ سب باتیں، بتاؤ اُن سے ملاقات کرو گی ویسے یہ سوچ لو، اگر ایک دفعہ بھی اُن سے فون پر یا ویسے ہی بات کر لو گی، تو وہ یہ سوچیں گے کہ تم بہت بے حیا ہو اور ملنے آ گئیں۔ ہماری امی کہتی ہیں مرد اکثر لڑکیوں کو آزماتے ہیں۔'' رقیہ اِس غلط فہمی کو بڑھاوا دینا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ غلط فہمی، بدگمانی میں بدل جائے، سو ضوفی کو جُزبُز دیکھ کر اُس نے جلدی سے بات اور لہجہ دونوں ہی بدلا۔

''تم صحیح کہہ رہی ہو رُقی۔ ظاہر ہے تم میری دوست بھی ہو، اور بہن بھی۔ تم میرے لیے بھی غلط سوچ ہی نہیں سکتیں۔ تم صحیح کہہ رہی ہو، شادی سے پہلے مجھے اُن سے بات نہیں کرنی چاہیے۔'' ضوفی کا لہجہ اور لفظ دونوں ہی معصوم تھے۔

☆......☆......☆

''میں کیا کرتی جناب! میں نے تو بہت ضد کی لیکن ضوفی نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے ضد کی تو رونے لگی۔ کہنے لگی ایک تو میں ویسے ہی اِس رشتے پر خوش نہیں ہوں اوپر سے اُن کی یہ فرمائش...... بھئی اب میں کیا کر سکتی ہوں۔ وہ تو رائی برابر بھی خوش نہیں ہے اور نہ ہی آپ کو پسند کرتی ہے۔ اب بس صبر و شکر کے ساتھ کسی اور کی محبوبہ کو نکاح کے تین بولوں میں باندھ کر لے جایئے گا اور کوشش کیجیے گا کہ اُن موصوف کا راج ضوفی کے دل پر سے ختم کر دیں، ورنہ پھر بہت ساری لڑکیوں کی طرح وہ بھی یہی کرے گی کہ دل میں کوئی اور بستر پر کوئی اور......'' رقیہ نے اپنی بات کا جواب طلب کرتے، رفیق احمد کمال کے دل میں جلتے شک کے انگارے کو دہکایا۔

اور پھر محبت، کو شک کی آندھیوں نے بجھا دیا۔ بتول اور رقیہ دونوں خوش تھیں ۔ رفیق احمد، صوفی کو بیاہ کر تو لے گئے لیکن شک کی سلگتی آگ نے صوفی کے ساتھ ساتھ اُن کی خوشیوں کو بھی چھین لیا۔
شادی کی پہلی رات شک کے بیج نے محبتوں کے اظہار کے سامنے تناور درخت کھڑا کر دیا اور صوفی اُس شخص کی سرد مہری ساری رات سہتی رہی جو اُس کا دیوانہ تھا۔ جو اُس کو بہت محبتوں سے بیاہ کر لایا تھا۔ جو اُس کو چاہتا تھا ، چاہنے والوں کی طرح۔
اور پھر شادی کی دوسری صبح ،صوفی کے اُترے چہرے نے رقیہ کے کلیجے میں ٹھنڈک ڈال دی اور جس وقت صوفی اُداس چہرہ اور غمگین آنکھیں لیے اپنے آپ کو خوش ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی بتول نے مسکراتی نظروں سے رقیہ کی طرف دیکھا۔ پھر تو جیسے صوفی کے لیے زندگی ایک امتحان بن گئی۔ رفیق کے دل میں پنپتے شک کے بیج کو ختم کرنے کے لیے اُس کو زندگی میں کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑا، یہ وہ ہی جانتی تھی۔ زندگی کے خوبصورت حسین سال گھر اور مکان کے درمیان ڈولتے ہوئے گزر گئے اور جب میاں کا اعتماد اور بھروسہ حاصل ہوا۔ وہ اپنے گھر میں ایک مالکن کی طرح بیٹھی تو بیچاری کی زندگی میں ارمان اور آرزوؤں کی جگہ ذمہ داریوں نے لے لی۔
''ہاہا! ساری زندگی بیچاری صوفی کی، آزمائشوں اور صبر کرتے گزر گئی۔ زندگی میں اُس کو کبھی محبت اور خلوص اُس طرح نہ ملا جتنی وہ حقدار تھی۔''
خالہ بڈو نے خاموش بیٹھی زرقون کو وہ وجوہات بتائیں جن کی وجہ سے رقیہ بیگم نے ساری زندگی اُس کی سیدھی سادی ماں سے ایک عداوت، ایک بغض اور کینہ رکھا۔
''تو امی کو صوفی کہتے تھے۔'' زرقون نے خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے عجیب یاسیت بھرے لہجے میں خالہ بڈو سے پوچھا۔
''ہاں فہمیدہ کو صوفی کہتے تھے۔ اور میرا نام بتول تھا۔'' خالہ بڈو نے جیسے آج صرف سچ بولنے کی ٹھان لی تھی۔
''بیٹا آج سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ رقیہ تو تھی ہی کمینی فطرت کی لیکن مجھ بدنصیب نے بھی اُس کی دوستی میں خوب گناہ سمیٹے، خوب اپنی قبر میں انگارے بھرے۔ تمہارے تایا کے گھر جا جا کر بھی رقیہ نے خوف آگ لگائی ہے۔ مجھے اِس بات کا بھی بہت دُکھ ہے۔ میں سوچ رہی ہوں تمہارے تایا کے گھر جاؤں اور جا کر اُن کو حقیقت بتاؤں۔ میں اُن کو بتانا چاہتی ہوں کہ عرفان کو کس طرح ایک منصوبے کے تحت پھنسایا گیا۔ لیکن میری بچی اِس سے پہلے تم اللہ کے واسطے مجھ کو معاف کر دو۔ میں نے تمہارے ماں باپ کے ہنستے بستے گھر میں آگ لگانے والوں کا خوب خوب ساتھ دیا ہے۔'' بڈو خالہ نے ہق دق بیٹھی زری کے آگے ہاتھ جوڑے۔
''تو امی کو صوفی بھی کہتے تھے اور بڈو خالہ بتول تھیں، جب ہی اکثر امی کہتی تھیں بتول کو کیا ہو گیا، اور میں نے کبھی امی سے پوچھا سی ہی نہیں کہ وہ کس بتول اور کس رُقی کو یاد کرتی ہیں۔ افسوس سارا وقت اپنی ہی فکر ڈالے رکھی۔ میری امی کتنی اکیلی تھیں، نہ اُن کی کوئی بہن تھی اور نہ ہی کوئی دوست۔ ساری زندگی امی نے آستین میں سانپ پالے۔ کاش مجھے عقل ہوتی تو کم از کم میں اپنی امی کے دل کی تو سنتی۔ نہ جانے کتنی خواہشیں اور کتنے ہی خواب، کتنا غصہ اور نہ جانے کتنی محرومیاں، وہ اکیلے ہی سہتی تھیں اور پھر دل پر ڈھیروں بوجھ، اور لاتعداد زخم لے کر میری امی یہاں سے چلی گئیں۔ اُن کا کوئی نہ تھا۔

لیکن میں تو اُن کی بیٹی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب عورت کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے تو اُس کے پاؤں زمین پر جم جاتے ہیں کیونکہ اب وہ اکیلی نہیں ہوتی۔ اُس کی دوست اُس کی ہمدرد، اُس کی غم خوار آ جاتی ہے۔ لیکن میں......
آہ......میں......

میں نے کبھی اپنی امی کا دل ہی نہیں ٹٹولا۔ کبھی اُن کی خاموش آنکھوں میں تیرتے اندیشے دیکھے ہی نہیں۔ ابا کی، سارے گھر کی، اس قدر خدمت گزاری کے پیچھے چھپے امتحان، آزمائش کو جانا ہی نہیں۔ اللہ مجھے معاف کردے۔ میری مظلوم، مجبور، بہترین ماں کو قبر میں سکون عطا کر، زری کو ایک عجیب سے ملال نے گھیر لیا۔

''بیٹا! کیا سوچ رہی ہو۔'' خالہ بنّو نے خاموش بیٹھی، اپنے آپ میں اُلجھتی، کچھ سوچتی زری کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ زری ساکت لبوں اور اُداس آنکھوں کے ساتھ اُن کو دیکھتی رہی، کچھ بولی نہیں۔

''بیٹا تمہاری خاموشی مجھے اور شرمندہ کررہی ہے اور تم......تم کتنی اچھی ہو۔ ایک اچھی ماں کی بہت اچھی بیٹی اور تمہارا باپ، واقعی ایک شریف النفس، انسان دوست آدمی ہے۔ میرے برے وقت پر جب میرا سایہ بھی مجھے چھوڑ گیا تھا، تم نے میری مدد کی۔ میں تمہاری احسان مند ہوں۔ تمہارے رویے نے مجھے بہت رُلایا ہے بیٹی۔ اللہ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے، شاید میرا بیٹا اُس نے اِس لیے واپس لیا، تاکہ میری آنکھیں کھلیں۔ میں کھرے اور کھوٹے کو پہچان سکوں۔ میں توبہ کرسکوں، اپنے گناہوں کی تلافی کرسکوں۔'' خالہ بنّو زری کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے بولیں۔

''کیا کررہی ہیں خالہ بنّو، میں نے کیا کیا ہے۔ بس دُکھ یہ ہے کہ میری امی......میری امی......ہمیشہ دھوکے کھاتی رہیں۔ ہمیشہ چپ چاپ سہتی رہیں۔ مجھ سمیت کبھی کسی نے اُن کا دل نہیں ٹٹولا، اُن کے دل کی نہیں سُنی۔'' زرقون نے خالہ بنّو کے دونوں ہاتھ کھول کر اُن کے آنسو پونچھے اور پانی کا گلاس اُن کو تھماتے ہوئے دھیمے لیکن دُکھی لہجے میں کہا۔

''بس بیٹا! اب اللہ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں جاؤں گی جہاں آراء کے پاس۔ میں اُن کو بتاؤں گی، اُن کو ساری حقیقت بتاؤں گی۔ بیٹا میں تمہاری شادی فراز سے کرواؤں گی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔'' خالہ بنّو کا لہجہ اور چہرہ دونوں سچ بول رہے تھے۔

زرقون نے ایک گہری نظر خالہ بنّو کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر سرسراتے لہجے میں اُس نے کہا۔

''وہاں مت جایئے گا۔ سب بیکار ہے۔''

''کیوں؟'' خالہ بنّو کا لہجہ پُرجوش اور حیران کُن تھا۔

''اس لیے کہ......''

زرقون کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے جیسے خالہ بنّو کے پیروں سے زمین نکال دی اور اُن کے منہ سے بے ساختہ نکلا، کب......''

☆......☆......☆

''آ گئیں بٹیا!'' زرقون جو آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں اُلکا پھول نکال رہی تھی۔ رفیق احمد کی آواز پر پلٹی۔

''ابا خیریت!'' وہ کبھی زری کے کمرے میں نہیں آتے تھے۔ آج ایسا کیا تھا کہ وہ اُس کے کمرے میں چلے آئے۔ زری نے جلدی سے سینے پر دوپٹا پھیلایا اور رومی جو واش روم میں کھڑی میک اپ صاف کررہی تھی۔

باہر نکل آئی۔

''ہاں سب خیریت ہے۔'' اُن کا لہجہ اور انداز دونوں ہی تھکے ہوئے تھے۔

''ابا آپ یہاں آ جائیں، یہاں بیٹھیں۔ میں چائے لاؤں آپ کے لیے۔'' مومی نے جلدی جلدی بیڈ پر سے کپڑے سمیٹتے ہوئے رفیق احمد کے لیے جگہ بنائی۔

''نہیں بٹیا میں یونہی ٹھیک ہوں۔ بیٹیوں کے بستر پر باپ نہیں بیٹھا کرتے۔'' انہوں نے اپنے مخصوص حتمی انداز میں کہا۔

''تو ابا یہاں تو بیٹھ جائیں۔'' مومی نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے صوفے پر ٹک گئے۔

اتنے میں زری بھی کپڑے بدل کر کمرے میں چلی آئی۔ عرفان کے کمرے سے آتی فلم کی تیز آواز اور ثمینہ اور عرفان کی باتوں کی آواز کو آپس میں مدغم ہوتے سُن کر زری نے ناگواری سے اُن کے کمرے کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر دروازہ ہلکے سے بند کر دیا۔

کیا رہا وہاں۔'' انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دائیں بائیں بیٹھی، محبت سے تکتی بیٹیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ابا بہت مزہ آیا۔ نرگس باجی بہت ہی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ آتشی گلابی غرارے سوٹ میں ایسی لگ رہی تھیں کہ نظر نہیں ہٹ رہی تھی اور آفتاب بھائی بھی بہت پیارے لگ رہے تھے۔'' مومی نے جلدی جلدی بتایا۔

''اچھا!'' رفیق احمد مسکرائے۔

''تم نے بیٹا میری طرف سے اپنی سہیلی کے گھر والوں کو مبارکباد دے دی تھی نا۔'' رفیق احمد کو زری آج معمول سے زیادہ خاموش لگی تو انہوں نے اُس کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''جی ابا!''

''کیا بات ہے زری! اِس قدر خاموش کیوں ہو؟'' رفیق احمد نے شفقت سے لاڈلی اور فرمانبردار بیٹی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں ابا! نرگس میری ایک ہی تو دوست ہے اور اب شادی کے بعد وہ لندن چلی جائے گی آفتاب بھائی اپنے ڈیڈی کے بزنس کی لندن والی برانچ سنبھالیں گے۔ نرگس کی شادی کی خوشی کے ساتھ ساتھ اُس کے جانے پر میں افسردہ بھی ہوں۔ لیکن چھوڑیے، یہ بتایئے آپ نے دوا کھائی۔ طبیعت ٹھیک ہے نا آپ کی اور آپ اب تک کیوں جاگ رہے ہیں؟'' زرقون نے تشویش سے باپ سے پوچھا۔

''بیٹا میری زندگی صرف دوائی اور بلڈ پریشر کے درمیان ہی تو نہیں گزرنی، زندگی میں اِس سے بڑے بڑے مسائل ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں بیٹا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟ میں بیمار اور اکیلا ہوں۔ اِس وقت مجھے تمہاری اماں بہت یاد آ رہی ہیں۔ زندگی کی کتنی پریشانیاں اور مسئلے وہ اپنے کندھوں پر اُٹھا لیتی تھیں۔ مجھے تو کبھی کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن آج لگتا ہے ذمہ داریوں نے میرے کندھے توڑ دیے ہیں۔ عرفان نے زندگی میں میری کمر پر وہ گھونسے مارے ہیں کہ اگر ساری زندگی سیدھا کھڑا ہونا چاہوں تو شاید کبھی بھی اب میری کمر سیدھی نہیں ہو سکتی۔ اور اب میرا کاروبار، میری ساری زندگی کی محنت اور بنی بنائی عزت اُس نے اپنی بیوقوفی اور ساس اور بیوی کی لالچ میں برباد کر دی۔'' رفیق احمد حد

سے زیادہ متفکر تھے۔ موی نے دل گرفتگی سے اپنے سگے باپ سے زیادہ پُرشفیق باپ کو دیکھا۔ اُس کے دل کو کچھ ہوا، وہ اپنی کُرسی سے اُٹھی اور زمین پر بیٹھ کر اُن کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُس کے پاس بیٹھ گئی۔
سارے کمرے میں ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ کھڑکی پر لہراتے پردے، اور صحن سے آتی پھولوں کی خوشبو بھی متاثر نہیں کر پا رہی تھی۔ نرگس کی شادی نے زری کو خوش ہونے کے ساتھ ساتھ بہت افسردہ بھی کر دیا تھا۔ نہ جانے کیوں اُس کو لگ رہا تھا کہ اب وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ اُس کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ ایسا کچھ جو اُس کی اُن سب کی زندگی کو تہہ و بالا کر دے گا۔ لیکن کیا! یہ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ لیکن اُس کی چھٹی حس اُس کو رونے پر اُکسا رہی تھی اور وہ کمالِ ضبط سے اپنے آنسو ضبط کیے بیٹھی تھی۔

دل روتا ہے آنکھوں کے سمندر نہیں روتے
ہم موسمِ باراں میں بھی ، کھل کر نہیں روتے

کوئی اُس کے اندر بیٹھا اُس کو سمجھا بھی رہا تھا۔
رفیق احمد نے محبت اور شفقت سے دونوں بیٹیوں کو دیکھا اور پھر بولے۔
''بیٹا تم لوگ اتنی اُداس نہ رہا کرو۔ تمہاری ماں مری ہے لیکن باپ زندہ ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں اپنے آپ کو کمزور نہ سمجھنا۔ اِس کرہ ارض پر اللہ کے بعد میں تمہارا حمایتی ہوں۔ اور بیٹا میں تمہارے جائز کا بھی حمایتی ہوں اور ناجائز کا بھی۔ بیٹا جائز کا حمایتی تو ایک راہ چلتا شخص بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر چیز کے حمایتی ماں باپ ہی ہوتے ہیں۔'' رفیق احمد کا لہجہ عجیب سی پُراسراریت لیے ہوئے تھا۔ زرتون کے دل کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ اُس نے ایک نظر رفیق احمد کے گھٹنوں پر تھوڑی ٹکائے بیٹھی موی کو دیکھا اور پھر کمرے میں بکھرتی انجانی سی اُداسی کو۔
''ابا مجھے آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' زری بولی۔
''نہیں بیٹا میں ٹھیک ہوں...... بس ذرا پریشان ہوں۔'' رفیق احمد نے عجیب تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔
''کیوں؟'' موی نے معصومیت سے پوچھا۔
رفیق احمد نے کچھ نہ کہا بلکہ اپنا دایاں ہاتھ اُس کے سر پر ٹکا دیا۔ لیکن اُن کے ہاتھ کی لرزش اگر موی کو محسوس ہو رہی تھی تو زری کو بھی نظر آ رہی تھی۔
''ابا عرفان بھائی اُس دن کیا بتا رہے تھے۔'' زری نے اپنی دانست میں موضوع بدلا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس نے انجانے میں باپ کا ایک تازہ زخم اُدھیڑ ڈالا ہے۔
''ابا مجھے بازار میں بہت سارا قرضہ اُتارنا ہے میں بازار کا بہت قرض دار ہو گیا ہوں۔'' عرفان نے کچھ جھجکتے ہوئے باپ سے کہا۔ وہ اُن کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن اب اُن کو بتائے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔
''بازار کا قرضہ! تم کو اُدھار لینے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔ اور آخر کتنا اُدھار لے لیا کہ تم کو لوگ بازار میں بیٹھنے نہیں دے رہے۔'' رفیق احمد کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور وہ چیخ پڑے۔
''دیکھیں ابا! اب آپ چیخیں مت، میں اِسی لیے آپ کو کچھ نہیں بتاتا کہ آپ فوراً غصہ ہونے لگتے ہیں۔'' عرفان نے جلدی سے باپ کو ٹوکا۔
''ارے مردود! بے شرم! میری ساری عزت، میری زندگی بھر کی محنت اور جمع پونجی تم چار دن نہ سنبھال سکے اوپر سے کہہ رہے ہو غصہ مت کریں۔ غصہ نہ کروں تو کیا تم کو گلے سے لگا کر شاباش دوں۔ مجھے جواب دو بازار کا

قرضہ کیسے چڑھا۔'' رفیق احمد نے غصے سے کپکپاتے ہوئے سر جھکائے بیٹھے عرفان کو بے نقط سنائیں۔

''وہ ابا! کچھ لوگوں سے میں نے اپنی ضمانت پر جیولری ڈاکٹر صاحبہ کو دلوائی تھی۔ ایک تو وہ لوگ تقاضا کررہے ہیں دوسرے میں نے ثمینہ کی بڑی بہن کو مکان کے لیے ایک آدمی سے اُدھار اپنی ضمانت پر دلوایا تھا۔ اُس آدمی کا تقاضا بہت شدید ہے ابا۔ ڈاکٹر صاحبہ سے بھی رابطہ نہیں ہورہا۔ میں سوچ رہا ہوں......''

عرفان کچھ کہتے کہتے رُکا۔ رفیق احمد کو ایسا لگا، ساری بلند وبالا عمارتیں ایک دم، ایک ساتھ اُن پر آگری ہوں اور وہ ملبے تلے دب گئے ہوں۔ ملبہ اتنا زیادہ ہے کہ اُن کو سانس لینے میں دقت ہورہی ہے۔ بلکہ اُن کا سانس جیسے رُک سا گیا ہو۔

''میاں کچھ، شاخسانے بعد کے لیے رکھ دو، یا سارے آج ہی چھوڑ دو گے۔'' رفیق احمد نے سر میں اُٹھتی شدید درد کی لہر کو انگوٹھے اور دونوں انگلیوں سے دباتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

''اور یہ بتاؤ! تم نے اپنی سالی کو کس خوشی میں رقم دلوائی تھی اور کتنی دلوائی تھی۔'' رفیق احمد کو عرفان کی غلطیوں کا احساس تو تھا لیکن غلطیاں اتنی بڑی اور سنگین ہوں گی اِس کا اندازہ نہیں تھا۔

''پچپن لاکھ۔'' عرفان کے منہ سے ڈرتے ڈرتے نکلا۔

''55 لاکھ، اتنی بڑی رقم، تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا ہے۔ میاں کہیں تم نشہ تو نہیں کرنے لگے ہو۔ وہ جو تمہاری سالی بیگم نے نیا مکان اور گاڑی خریدی ہے۔ اُس کے قرضے کے بوجھ تلے تم دبے ہو۔ عرفان! تم نے یہ سب کیا کیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنے ناعاقبت اندیش اور بیوقوف ہوگے۔ تم نے تو لٹیا ہی ڈبودی۔ اب بتاؤ، اب کیا چاہتے ہو؟'' اب کیا رہ گیا ہے میرے پاس داؤ پر لگانے کو۔ جو بچا ہے اُس کو بھی تم آگ لگادو۔'' رفیق احمد نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں۔

اُن کو غم مال کے برباد ہونے سے زیادہ، بیٹے کی نالائقی کا تھا۔ اُن کا بیٹا اِس قدر نالائق، کمزور اور شارٹ کٹ ڈھونڈنے والا لالچی ہوگا، انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

''ابا آپ پریشان نہ ہوں! ڈاکٹر صاحبہ ایک اچھی اور شریف عورت ہیں، وہ ہمیشہ مجھے میرے تصور سے زیادہ منافع دیتی رہی ہیں۔ اِس دفعہ نہ جانے کہاں پھنس گئی ہیں۔'' عرفان نے پریشان باپ کو لولی لنگڑی تسلی دی۔

''اللہ کرے جو تم سوچ رہے ہو ویسا ہی ہو۔'' رفیق احمد جانتے تھے کہ وقت اور جیب سے نکلا نوٹ کبھی بھی واپس نہیں آتے لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے انتہائی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ابا! بازار میں وہ پٹھان مجھے بہت تنگ کررہا ہے، جس سے میں نے زرینہ کو رقم دلوائی تھی، اب زرینہ سے تقاضا کرتا ہوں تو وہ بُرا ماننے لگتی ہے۔ رقیہ مامی سے کہتا ہوں تو وہ کہتی ہیں تم جانو زرینہ جانے، ابا بازار کے لوگوں کو تو میں سنبھال لوں گا لیکن اگر اُس پٹھان کو پیسے نہیں دیے تو ابا وہ مجھے گرفتار کرادے گا۔ ابا جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے۔ سود بڑھتا جارہا ہے۔ ابا......'' عرفان کہتے کہتے رُکا۔

ایک لمحے کے لیے رفیق احمد کو اپنے بیٹے پر بے انتہا ترس آیا۔ جو لوگ اپنوں سے دور ہوجاتے ہیں تو لوگ انہیں اسی طرح نوچتے ہیں۔ کاش پتا ڈالی سے ٹوٹنے سے پہلے سوچ لے کہ اب اُس کا مقدر صرف پیروں تلے کچلنا ہی ہے۔ کاش! کوئی سوچ لے، کاش......

''ابا میں چاہتا ہوں ہم صدر والی دکان بیچ کر قرضہ اُتار دیں پھر جب ڈاکٹر تابندہ آئیں گی تو دوبارہ کسی

[illegible] دکان [illegible] ہے نا ابا۔'' عرفان نے اُمید، نا اُمیدی، خوف اور ذلت کے دروازوں کو ایک ایک کر کے کھلتے دیکھ کر...... خوشامدی لہجے میں باپ سے کہا۔

''دکان بیچ دوں!'' رفیق احمد کو کمر میں ایک سرد سی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ ''تم جانتے ہونا عرفان وہ صرف ایک دکان ہی نہیں، بازار میں میرا بھرم بھی ہے۔ جس دن وہ دکان بکی، لوگ سمجھ جائیں گے رفیق احمد تباہ ہوگئے۔ بیٹا میرا بھرم، میری ساکھ، سب ختم ہو جائے گی۔ گو کہ ان چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن انسانوں کے درمیان رہنا ہو، معاشرے میں سانس لینا ہو، رشتے بنانے ہوں، رشتے داریاں نبھانی ہوں، تو بعض اوقات اِن لوازمات کی ضرورت پڑتی ہی ہے۔ اور تم یہ بھی تو سوچو کہ اگر دکان بک جائے گی تو گھر کیسے چلے گا۔''

''ابا میں کہیں نوکری کرلوں گا۔'' عرفان کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ گو کہ اِس بیٹے نے رفیق احمد کو تباہ کر دیا تھا۔ لیکن ماں باپ کے دل کو کوئی نہیں جان سکتا۔ اُن کے دل کو یہ سوچ کر تکلیف ہوئی کہ سیٹھ کی طرح کاؤنٹر پر بیٹھنے والا اُن کا بیٹا، کہیں پر نوکری کرے گا۔

اُن کے لیے یہ تصور بھی محال تھا۔ لیکن اگر قرضہ ادا نہ ہوا تو یہی بیٹا...... وہ سوچنا بھی نہیں چاہتے تھے۔

''اُف ابا یہ کیا کیا عرفان بھائی نے؟'' زرقون جو منہ پر ہاتھ رکھے باپ کی بات سُن رہی تھی خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''بس بیٹا! جب انسان کا بُرا وقت آتا ہے تو پریشانیاں اسی طرح ہر طرف سے داخل ہوتی ہیں۔ اور یاد رکھو بیٹا یہ تمہارا بُرا وقت ہے اور بُرا وقت اُن ہی پر آتا ہے، جن پر کبھی اچھا وقت گزرا ہو۔ میں بہت تکلیف میں ہوں۔'' رفیق احمد نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا تو مومی کو ایسا لگا جیسے اُن کی آنکھوں کے کونے گیلے ہو رہے ہیں۔ اُس نے گھبرا کر زری کی طرف دیکھا۔ زری نے شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ کر اُس کو خاموش رہنے کا اِشارہ کیا۔

''میں نے عرفان کو منع کیا ہے کہ ہفتہ دس دن کے بعد وہ جو چاہے کرلے، لیکن میں اِس جمعہ کو مومی کو رخصت کر رہا ہوں، اور مومی کی رخصتی سے پہلے میں نہیں چاہتا کسی کو پتا چلے جو ہم پر گزر رہی ہے۔ ویسے بھی بیٹا اب تو میرا دل چاہتا ہے۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم نفس کوئی نہ ہو، ہم نوا کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
جو اگر مرجایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

رفیق احمد نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

شعر سے زیادہ شعر کہنے کے انداز نے زری کو رُلا دیا۔ لیکن اُس کو آنسو پینے آتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شاید کچھ عرصے سے اُس کے دل پر اسی لیے غم اور تکلیف کی کیفیت رکھی تھی کہ اُس کو آج کا دن بھی دیکھنا تھا۔

''آپا'' مومی نے گھبرا کر زری کو مخاطب کیا۔

''ابا! آپ مومی کو اِس طرح کیوں رخصت کر رہے ہیں۔'' زری نے مومی کے بے قرار لہجے میں چھپے سوال کو پڑھ کر رفیق احمد سے پوچھا۔

''صرف موی نہیں اگر بھابی جان مان جاتیں تو میں تم کو بھی رُخصت کر دیتا لیکن بیٹیا! تم مجھے اور اپنی اماں کو معاف کر دینا۔ تمہاری ماں کی اگر میں ضد نہ مانتا تو شاید آج یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ میں نے مومی کے سُسر کو فون کیا تھا اور اُن سے کہا ہے کہ میں بہت بیمار ہوں اور میں جلد از جلد مومی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ وہ شریف النفس لوگ ہیں فوراً مان گئے ہیں لیکن اُن کی ایک ضد ہے۔'' رفیق احمد نے سینٹر ٹیبل پر سے پانی کا گلاس اُٹھا کر گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

''ضد!'' زری کے منہ سے نکلا۔

''ابا میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں، ابا آپ تو پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ اوپر سے میں...... ابا میں اِس حالت میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔'' مومی اُن کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔

''نہیں بیٹا! بیٹیاں تو بہت اچھی ہوتی ہیں اور تم دونوں تو میری بہت اچھی بیٹیاں ہو...... میرا دل چاہتا ہے میری دو نہیں تین بیٹیاں ہوتیں۔ بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں، اِس بات کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میری بہت اچھی نیک اور فرمانبردار بیٹیوں! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ لیکن بیٹی تو اللہ کے نبیؐ نے بھی رُخصت کی اور بیٹا اتنی جلدی رُخصتی کی وجہ یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ مومی اپنی سسرال میں ہلکی ہو کر جائے۔ میں چاہتا ہوں وہ اُسی شان اور بھرم کے ساتھ سُسرال کی دہلیز پر قدم رکھے، جس عزت اور احترام کے ساتھ اُس کا پیغام آیا تھا۔ مومی کے سسرال والوں کی ضد یہ ہے کہ وہ جہیز بالکل نہیں لیں گے۔ میں نے ضد بھی کی لیکن وہ لوگ بالکل بھی جہیز لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مومی کے پیپرز تو کئی ماہ پہلے تیار ہو چکے ہیں، بس انشاء اللہ اِس جمعہ کو میں اپنی چھوٹی بیٹی کو بہت پیار سے رخصت کرنا چاہتا ہوں۔''

رفیق احمد کی آنکھوں میں خوشی، دکھ اور تنہائی کا عجیب سا امتزاج زرقون کو نظر آیا۔ گو کہ عرفان کے متعلق ہونے والے انکشافات نے جیسے اُس کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اِس وقت اگر وہ کمزور پڑ گئی تو شاید اُس کے ابا ٹوٹ جائیں گے، بکھر جائیں گے۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کے ابا کو اِس وقت ایک ہمدرد کی ضرورت ہے۔ اُس نے چپ چاپ گم صم سی بیٹھی مومی کو دیکھا۔ تو اُس کے دل کو ایک عجیب سی یاسیت نے گھیر لیا۔ بیچاری مومی! ماں باپ کی محبتوں کو ترسی ہوئی، زمانے کی ستائی ہوئی۔ ہمارے گھر آئی تو بھی کوئی سکون نہ مل سکا۔ کتنی جلدی اِس گھر کا حصہ بن گئی۔ کس قدر ہم لوگوں سے محبت کرتی ہے۔ مومی تو محبتوں سے گُندھی ہے۔ وہ ہم تو کیا، اِس گھر کے در و دیوار تک کو چاہتی ہے اور میں...... اللہ مجھے مومی سے کیسی محبت ہے، میں تو یہ بھول ہی گئی ہوں کہ مومی میری سگی بہن نہیں ہے۔ نہیں...... نہیں

میں یہ سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ مومی بس میری بہن ہے۔ میری پیاری سی، چھوٹی سی، شرارتی سی بہن۔

اللہ میاں یہ کیا ہو رہا ہے۔ میرے سارے ہمدرد، حمایتی، محبت کرنے والے ایک ایک کر کے مجھ سے دور کیوں جا رہے ہیں۔ امی چلی گئیں۔ نرگس کی شادی ہو گئی۔ چند دنوں میں وہ لندن چلی جائے گی۔ مومی...... اب مومی بھی اِس گھر سے بلکہ اِس ملک سے ہی دور، دبئی چلی جائے گی۔

یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک ایک کر کے سب ہی جا رہے ہیں۔ لیکن شکر ہے میرے مالک! میرے ابا سلامت ہیں۔ وہ میرے پاس ہیں۔'' زری نے خیالوں کے بھنور میں اُبھرتے ڈوبتے بھی ایک شکر کا موقع ڈھونڈ ہی لیا۔

''ارے ابا! آپ اُداس کیوں ہیں۔ اچھا ہے نا مومی دبئی چلی جائے گی۔ بھئی اب تو میرے عیش ہو جائیں،

گے۔ نرگس لندن سے پرفیومز بھیجے گی اور مومی دبئی سے کپڑے، واہ...... واہ کیا عیش ہوں گے۔ ہے نا ابا!''
زرقون نے ماحول میں خوشگواریت پیدا کرنا چاہی اور وہ کامیاب بھی رہی۔
''ابا دیکھ رہے ہیں آپ۔ زری آپا کو! کیسا خوش ہو رہی ہیں۔ خدا کی قسم ابا میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا کہ میں آپ کو چھوڑ کر جاؤں۔ ابا آپ اُن کو منع کر دیں۔ میں آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔'' مومی نے بہت مان اور محبت سے کمرے سے باہر نکلتے رفیق احمد کو مخاطب کیا۔
''بیٹا زندگی میں سب سے کڑا وقت ایک باپ کے لیے بیٹی کی رخصتی ہی ہوتا ہے۔ لیکن بیٹا، بیٹیوں کو رُخصت کرتے ہیں تو میٹھی نیند آتی ہے۔ تمہارا تو نکاح ہو چکا ہے تم میرے پاس اِس گھر میں اُن کی امانت ہو۔ یہ میری خوشی ہے کہ میں اپنی زندگی میں تم دونوں کو اپنے اپنے گھروں میں ہنستا بستا دیکھوں۔ بیٹا جب تم دونوں ہنستی ہو تو میرے کلیجے میں ایک عجیب سی ٹھنڈک پڑتی ہے۔ بس تم دونوں خوش رہا کرو۔ میں چاہتا ہوں زری کو بھی رخصت کر دوں لیکن اب جو اللہ کی مصلحت۔''
انہوں نے کہتے ہوئے کمرے سے باہر قدم رکھ دیے۔
''آپا یہ ابا کیا کہہ گئے۔'' مومی جو نرگس کی شادی کو انجوائے کر کے گھر لوٹی تھی گھبرا کر زری سے بولی۔
''ہاں تو اچھا ہے اِس ٹینشن زدہ ماحول سے تم باہر جا سکتی ہو تو مومی ضرور چلی جاؤ۔ ابا صحیح کہہ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اب ہمارا اور اِس گھر کا کیا ہوگا۔ اور مومی، میری گڑیا ذرا سوچو یہ ابا کی خوشی ہے کہ تم اپنے گھر جا بسو جب سے امی کا انتقال ہوا ہے ابا ٹوٹ سے گئے ہیں۔ ہمیں ابا کی مجبوریاں سمجھنی چاہئیں۔ بس اب خوش خوش رخصتی کی تیاری کرو۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی گڑیا سی بہن کو خالی ہاتھ رخصت ہونے دوں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے بھی اُن کو تو معلوم ہی تھا تم کو شادی کا کتنا شوق ہے اِس لیے وہ تقریباً تمہارا سارا جہیز تیار کر کے ہی گئی ہیں، بس ایک نظر دیکھنا ہوگا۔ اور مومی تمہاری شکل آج کل کتنی منحوس سی ہو رہی ہے۔ تمہارے لیے کوئی اچھا سا پارلر بھی بک کروا لیتی ہوں۔ نرگس بھا بیز پارلر سے تیار ہوئی تھی اور بقول تمہارے بہت ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔ خیر وہ تو ہے ہی بہت خوبصورت میں کوشش کروں گی کہ تم بھی خوبصورت نہیں تو کم از کم قابلِ قبول ضرور لگو۔'' زری نے ہنستے ہوئے لمحوں میں ماحول ہی بدل ڈالا یہ اُسی کا کمال تھا۔ مومی نے بہن کو مصنوعی غصے سے دیکھا اور پھر اُس کے چہرے پر ایک شرمگیں مسکراہٹ پھیل گئی اور زری کے دل کی گہرائیوں سے اُس کے لیے خوشیوں کی دعا نکلی لیکن وہ خود......

☆......☆......☆

''یار مرتضٰی تم تو پورے کے پورے مولوی بن گئے۔'' احمر نے پیارے نبی کی پیاری سنتیں، کتاب پڑھتے مرتضٰی کو دیکھتے ہوئے بہت اپنائیت سے کہا۔
''احمر جب امریکہ آیا تھا، تو چند دنوں بعد ایک ریسٹورنٹ میں اُس کی ملاقات مرتضٰی اور شیری سے ہوئی تھی۔ شیری مرتضٰی سے کسی بات پر اُلجھ رہی تھی۔ پھر دونوں کی تکرار جھگڑے میں بدل گئی۔ احمر خاموشی سے دونوں کو دیکھتا رہا، چند لمحوں بعد شیری نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور واپس چلی گئی اور مرتضٰی سر پکڑے بیٹھا رہ گیا۔ اُس لمحے احمر نے مرتضٰی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور یوں اُن کی دوستی بہت تیزی سے پروان چڑھی اور جب سے مرتضٰی نے شیری کو طلاق دی تھی، احمر مرتضٰی کا بہت ہی خیال رکھنے لگا تھا۔ اور آج احمر مرتضٰی کی طرف آیا ہوا تھا۔

''بس یار! مولوی وولوی کیا ہونا، احساس ہوتا ہے، زندگی کا بہت وقت ضائع کر دیا۔ اُس خالق کا تو کوئی حق ہی ادا نہیں کیا۔ اور سچ بتاؤں احمر مجھے اِن تمام چیزوں میں بہت سکون ملتا ہے۔ کہتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ ہر چیز بن مانگے دے دیتا ہے لیکن ہدایت صرف مانگنے والے ہی کو دیتا ہے اور میں اللہ سے ہدایت کا طلب گار ہوں۔ اللہ مجھے ہدایت دے، جیسے میرے دل کو سکون اور اطمینان دیا ہے۔'' مرتضیٰ نے مسکراتے ہوئے احمر کی بات کا جواب دیا۔

''گھر میں بہت سناٹا ہے۔ مرتضیٰ شادی کر لو۔'' احمر نے پانچ کمروں کے وسیع گھر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بہت اپنائیت سے کہا۔

''شادی!'' مرتضیٰ نے حیرت سے احمر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں میرے یار شادی۔ گھر کا سناٹا دل کو ہولا رہا ہے۔'' احمر کے لہجے میں بے پناہ اپنائیت تھی۔

''حیرت ہے! احمر! میری زندگی کے ایک ایک دُکھ سے آشنا ہونے کے باوجود تم مجھ کو شادی کا مشورہ دے رہے ہو۔ شادی کے تو نام سے ہی مجھے ایک عجیب سا خوف آتا ہے۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ میں اپنے اللہ کو زیادہ سے زیادہ کھوجنا چاہتا ہوں۔ میری زندگی میں بہت سکون ہے۔ احمر اور اس سکون کو کسی حال میں، میں تباہ نہیں کرنا چاہتا۔'' مرتضیٰ کے لفظوں میں ماضی کے دُکھ رو رہے تھے۔

''لیکن یار! عورت تو مرد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ عورت اللہ نے مرد کی تسکین اور تکمیل کے لیے پیدا کی ہے اور ضروری تھوڑی ہے کہ ہر عورت بُری ہو۔ کیا ہماری مائیں عورتیں نہیں تھیں۔ کیا ہماری بہنیں عورتیں نہیں ہیں۔ عورت بہت مقدس اور اچھی بھی ہوتی ہے۔ عورت کے بغیر گھر گھر نہیں ہوتا، مکان ہوتا ہے۔ اور میرے یار! ساری زندگی دیارِ غیر میں رات دن محنت ہم مکانوں میں رہنے کے لیے تو نہیں کرتے نا اور شادی سُنت بھی تو ہے نا۔ اور اللہ کے نیک بندے تو سنت سے تو انکار نہیں کر سکتا نا۔'' احمر نے کمال فنکاری سے مرتضیٰ کی شہ رگ پر ہاتھ رکھا۔ مرتضیٰ اُس کی بات پر بے ساختہ مسکرا دیا۔

''لگتا ہے تمہارے ذہن میں کوئی لڑکی ہے۔ جس کے لیے تم میری گردن کاٹنے پر بضد ہو۔''

''لڑکی!'' احمر کی آنکھیں مسکرائیں۔

''لڑکی تو ہے۔'' اُس کے منہ سے سرسراتا ہوا نکلا۔

''امی آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ زری ہماری بہن بھی تو ہے اور سب جانتے ہیں کہ وہ اور فراز ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں۔'' احمر نے فون پر ماں کا فیصلہ سننے کے بعد حیرت سے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''زیادہ اُس کا حمایتی اور ہمدرد بن کر مجھ پر چیخنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے اگر چار پیسے کما کر ہمیں بھیج رہے ہو تو ہم پر گرجنے اور برسنے کا تم کو قطعی کوئی اختیار نہیں ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر اُس لڑکی میں ایسا کیا ہے کہ سارے باپ بیٹے اُس کے عاشق زار بنے ہوئے ہیں۔ مریم صحیح کہتی ہے، ابھی وہ جادوگرنی ہمارے گھر نہیں آئی ہے تو روز اُس کے نام کا اخبار پڑھا جاتا ہے اور جو آ گئی تو مجھے اور اپنی بہن کو تو تم لگ ردی کی ٹوکری میں ہی ڈال دو گے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جن لوگوں نے تمہاری بہن کے ساتھ اِتنا بُرا سلوک کیا، اُس کی زندگی برباد کر دی، تم لوگوں کی ان کے ساتھ ہمدردی ہی ختم نہیں ہوتی۔'' جہاں آراء بیگم نے احمر کو بے نقط سنائیں اور احمر...... احمر کو تو ایسا لگا جیسے فون کے دوسری طرف اُس کی ماں ہی نہیں ہے...... یہ اُس کی ماں کیسے ہو سکتی ہے۔ اُس کی ماں تو بہت نرم دل، محبت کرنے والی عورت تھی۔ اور زری...... زری کے تو وہ بہت لاڈ اُٹھاتی

تھیں، محبت بھرے لاڈ...... یہ کیا ہوا۔ یہ کیسی ہوا چلی ہے کہ گھر مکان اور رشتے دار، بہن بھائی غیر بن گئے ہیں۔ یہ کیا ہوا ہے؟ احمر کی عقل حیران تھی۔

''امی تو ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ ماشاء اللہ مریم کی شادی ہوگئی ہے اور وقار ایک اچھا لڑکا ہے۔'' احمر نے حیرت زدہ سے لہجے میں ماں کو جواب دیا۔

''خاک اچھا ہے! رات دن باتیں سُناتا ہے۔ سوساس نندوں پر بھاری ہے وقار۔ میری بچی جس طرح گزارہ کررہی ہے بس وہ ہی جانتی ہے۔'' جہاں آراء بیگم کو احمر کا اِس طرح سوال و جواب کرنا بُری طرح کھلا تو انہوں نے اُس کو جھاڑ کر رکھ دیا۔

''خیر امی! جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے مریم بھی بہت بدتمیز اور زبان دراز ہوگئی ہے۔ اُس کو بھی اپنے اوپر کنٹرول کرنا چاہیے۔'' احمر نے بغیر کسی لگی لپٹی کے ماں سے کہا۔

''یا اللہ! تم کو اب بہن میں کیڑے نظر آنے لگے۔ ہاں بھئی جب بیٹوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں تو وہ اسی طرح پرائے ہو جاتے ہیں اور بیٹا تم نے تو کمال ہی کردیا۔ تمہاری بیوی کے جوہر تو جب کھلیں گے تب کھلیں گے تم تو چچا کی بیٹی کے لیے لڑ رہے ہو۔ خیر کسی وقت بھی ٹیلیفون کی لائن کٹ سکتی ہے۔ میں تم کو یہ بتارہی ہوں کہ میں فراز کا رشتہ ایک بہت اچھی جگہ کررہی ہوں، رہ گئی تمہاری پیاری زرقون تو جہاں دل چاہے اُس کی شادی کروا دو۔ کم از کم اُس کی شادی فراز سے نہیں ہوسکتی۔ خدا حافظ۔'' جہاں آرا بیگم نے اپنی بات مکمل کرتے ہی ٹیلیفون کی لائن کاٹ دی اور احمر ٹیلیفون کو تکتا رہ گیا۔

''یار میں تو کافی بھی بنا کرلے آیا اور تم ابھی تک علامہ اقبال بنے اِسی صوفے پر بیٹھے ہو۔ حد کرتے ہو۔'' مرتضٰی نے کافی کا کپ احمر کے سامنے رکھا تو احمر نے چونک کر مرتضٰی کی طرف دیکھا۔

''ہاں! بس یہی سوچ رہا تھا کہ تم ویسے تو بہت نالائق ہو لیکن میرے ذہن میں تمہارے لیے ایک بہت لائق لڑکی ہے۔'' احمر نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

''نہیں احمر میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' مرتضٰی بہت سنجیدہ تھا۔

''خیر! ویسے تم ایک نظر دیکھ لو۔'' احمر نے میز پر رکھا اپنا موبائل فون اُٹھا کر گیلری سرچ کرنی شروع کی۔ اور پھر ایک تصویر مرتضٰی کی آنکھوں کے سامنے کردی۔ مرتضٰی نے تصویر دیکھی پھر ٹیلیفون آف کرکے احمر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''Not Now۔''

☆......☆......☆

''بھئی اماں میری سمجھ میں نہیں آتا۔ دو بچوں کی ماں بن گئی لیکن اِس گھر کی باتیں آج تک سمجھ میں نہیں آئیں۔ بڈھے کا اِس قدر کنٹرول ہے پورے گھر پر کہ اُس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ اور اُن کو دیکھو خالہ بٹو کو کیسی احسان فراموش نکلی ہیں۔ بالکل طوطے کی طرح آنکھیں پھیرلیں ہیں۔ آج کل تو اُن پر زری کی ہمدردی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ دل جلتا ہے رات دن۔ اِس زری کو دیکھو۔ فراز سے رشتہ تقریباً ختم ہوگیا ہے۔ میں سوچتی تھی۔ فراز تو اِس کا یار ہے۔ شادی سے انکار ہوگا تو خوب روئے دھوئے گی۔ واویلا مچائے گی۔ روئے پیٹے گی۔ تو میرے دل میں ٹھنڈک پڑے گی۔ میں بھی بڈھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہوں گی بہت عزت

دار بنتے تھے۔ دیکھو بٹی نے کیسے تمہاری ناک کے نیچے عشق لڑایا ہے۔ لیکن اماں ایسی ناگن اور ڈائن ہے کہ ایسی خاموش ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ بالکل نارمل ہے جبکہ اندر ہی اندر گھل رہی ہے۔ رنگ کمہلا گیا ہے دو دو دن بالوں میں برش نہیں کرتی۔ چپ رہتی ہے۔ کپڑوں کی طرف سے بھی بہت لاپروا ہوگئی ہے۔ لیکن اماں! اُسی تحمل سے سارے کام کرتی پھرتی ہے۔ لمبی لمبی نمازیں پڑھتی ہے۔ بڑے بڑے سجدے کرتی ہے۔ جائے نماز پر بیٹھ کر روتی ہے۔ لیکن سب کے سامنے ایسی نارمل بنی رہتی ہے کہ کیا بتاؤں۔''

''آج زری اور موی رفیق احمد کے ساتھ اُن کے کسی دوست کے گھر کھانے پر گئے ہوئے تھے گو کہ دعوت تو ثمینہ اور عرفان کی بھی تھی لیکن ثمینہ نے اُن لوگوں کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ رفیق احمد نے گھر میں رقیہ بیگم کے داخلے پر پابندی لگا رکھی تھی اور وہ اپنی ماں کو گھر بلانا چاہتی تھی۔ سو اِس وقت رقیہ بیگم، ثمینہ کے ساتھ رفیق احمد کے گھر میں ٹہل رہی تھیں۔

''اری بٹیا تُو کیوں فکر کرتی ہے میرے بارے میں۔ ہماری اماں کہتی تھیں کہ میں اگر کسی کے پیچھے پڑ جاؤں تو اُس کو قبر میں لٹا کر ہی چین لیتی ہوں۔ اور دیکھ تیری پھوپو کو کتنے آرام سے قبر میں لٹا دیا۔ اور یہ احمد کمال، اِس نے جو میری بے عزتی کی ہے۔ مجھ پر اِس گھر میں آنے پر پابندی لگائی ہے۔ میں اُس کو معاف نہیں کروں گی۔ اور......''

''احمد کمال! اماں یہ احمد کمال کون ہے؟'' ثمینہ نے اُلجھتے ہوئے ماں کی بات کاٹی۔

''احمد کمال تیرے سُسر کا نام ہے۔ جوانی میں سب احمد کمال کہتے تھے پورا نام رفیق احمد کمال ہے۔'' رقیہ بیگم نے تیوری پر بل ڈال کر، آنکھوں میں اُترتی یادوں کو پیچھے دھکیل کر لاپروائی سے کہا۔

''واہ! بڑا رومانٹک نام ہے۔'' ثمینہ نے حیرت سے نچلا ہونٹ لٹکاتے ہوئے کہا۔

''اب تُو رومانس دیکھے گی یا میری بات سُنے گی۔'' احمد کمال کا نام اُن کو ماضی میں دھکیل رہا تھا اور رقی اپنا بدلہ صوفی سے لے چکی تھی لہٰذا اب وہ احمد کمال کی بازگشت بھی سُننا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ہاں اُس کو رفیق احمد پر غصہ تھا۔ اُس رفیق احمد پر جو اُس کی بیٹی کا سُسر تھا۔

وہ رفیق احمد جس نے اُس کو اِس گھر سے ذلیل کر کے نکالا تھا۔ اُس کو زری سے شدید نفرت تھی۔

زری جو صوفی اور احمد کمال کی محبت کا ثمر تھی۔ زری جو رفیق احمد کی لاڈلی تھی۔ زری جو رفیق احمد کی جان تھی۔ زری جو ہنستی تو ایسا لگتا احمد کمال ہنس رہا ہو۔ زری جس کی آنکھیں احمد کمال جیسی تھیں۔ زری جس میں احمد کمال جیسا وقار اور تمکنت تھی۔ زری جس کا چہرہ احمد کمال کی جوانی تھا۔ وہ زری کا منہ نوچ لینا چاہتی تھی۔ وہ زری کو برباد کرنا چاہتی تھی۔ وہ زری کے غموں پر رفیق احمد کو روتا دیکھنا چاہتی تھی اور اس کے لیے وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔

''لے یہ پکڑ! یہ رائی کے دانے ہیں، رنچھوڑ لائن میں ایک بہت بڑا ہندو سفلی گر رہتا ہے۔ مہاراج نام ہے اس کا۔ میں مہاراج سے پڑھوا کر لائی ہوں۔ تو یہ دانے بکھیر دے خاص کر اپنے سُسر کے کمرے میں اور ان دونوں لڑکیوں کے کمرے میں بھی۔ مہاراج کہہ رہا تھا جتنا یہ دانے بکھیریں گے اِسی تیزی سے یہ گھر بکھرے گا اور اِس گھر سے خوشی اور اطمینان ختم ہوگا۔

''وہ تو خیر ہو جائے گا اماں اب ذرا یہ بتاؤ کہ زرینہ نے پیسوں کا کیا کیا؟ تم کو پتا ہے عرفان کو دکان بیچنا پڑ رہی ہے۔'' ثمینہ نے ماں کے ہاتھ سے پڑھے ہوئے دانوں کی پڑیا لے کر مطلوبہ جگہوں پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

''ارے دے دے گی، کیوں فکر کرتی ہے۔ اچھا ہے نا دکان بک جائے۔ دکان تیرے سُسر کے نام ہے۔

اچھا ہے عرفان بیچ دے دیر سویر سے تجھے پیسے مل ہی جائیں گے۔ اس طرح ساری رقم تیرے ہاتھ میں آ جائے گی۔ تُو فکر مت کر، بکنے دے دکان کو۔'' رقیہ بیگم نے ثمینہ کو تسلی دی۔ ''اور ہاں اپنا زیور سنبھال کر رکھیو، زیور عورت کا اثاثہ ہوتا ہے۔ آج کل عرفان پریشان ہے۔ اپنی پریشانیاں خود سمیٹے زیور مت دیجیو تجھی۔'' رقیہ بیگم کو بیٹھے بیٹھے یاد آیا۔

''لو اماں میں پاگل ہوں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں کسی قیمت پر اپنا زیور نہ دوں۔ بلکہ ایسا کرو اماں یہ زیور تم اپنے پاس رکھ لو۔ نہ یہاں ہوگا اور نہ ہی عرفان مانگے گا۔'' ثمینہ دور کی کوڑی لائی۔

''نہیں نہیں تُو اپنے پاس رکھ۔ بس کسی کو بھی کسی بھی قیمت پر زیور کو ہاتھ مت لگانے دینا۔ رفیق احمد عزت پر جان دینے والا آدمی ہے، وہ کچھ بھی کرے گا۔ اپنے بیٹے کو بازار میں ذلیل نہیں ہونے دے گا۔'' رقیہ بیگم نے کمینگی کی آخری انتہا پر کھڑے ہو کر کہا۔

''ویسے اماں خوامخواہ ہی سونا لگایا۔ اگر وہ ڈاکٹر نہیں آتی تو...... تم بھی نا پیچھے لگ جاتی ہو۔ تم نے میرا اس قدر پیچھا پکڑا کہ میں عرفان کے سر ہوگئی۔'' ثمینہ نے برائی کا ٹوکرا رقیہ بیگم کے سر پر ڈالنا چاہا۔

''ارے واہ بیٹی واہ...... خوب اماں کے سفید چونڈے پر گوبر مل رہی ہو۔ ایسا کیا کیا میں نے...... تمہاری گردن پر چھری رکھ دی تھی۔ کیا......'' رقیہ بیگم بھی اُس کی ماں ہی تھیں۔ انہوں نے وہ سنائیں کہ ثمینہ کو کہنا پڑا۔

''ارے اماں تم تو غصہ ہی کرنے لگیں۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ بس اللہ خیر کرے۔ ذرا میں آج کل عبداللہ کی طرف سے بھی پریشان ہوں نا۔'' ثمینہ نے ماں کے بگڑے تیوروں کو دیکھتے ہوئے بات پلٹی اور رقیہ بیگم بڑبڑاتی ہوئی گھر سے نکل گئیں۔

☆......☆......☆

''سُنا ہے تمہارے بھائی کا رشتہ طے ہو رہا ہے بڑی اونچی پارٹی میں۔'' مریم کی ساس نے روٹی پکاتی مریم کے پیچھے کھڑے ہو کر طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''ظاہر ہے، میرا بھائی ہے بھی اس قابل۔ جیسا وہ ہے ویسا ہی اُس کو گھرانہ مل گیا ہے۔ بہت امیر اور خوبصورت لڑکی ہے۔'' مریم نے رسان سے کہتے ہوئے بات پلٹ دی۔

''ہاں بھئی میں تو تم لوگوں کی سمجھداری کی قائل ہوگئی ہوں۔ تم کو، کوئی نہیں پوچھ رہا تھا۔ سگے چچا نے بھی دھتکار دیا تو تم کو، تمہاری اماں نے ہمارے گلے میں ڈھول کی طرح لٹکا دیا۔ لو بھئی پیٹے جاؤ، جتنا دل چاہے۔ اور بیٹے کو بھی ایسی جگہ اٹکا رہی ہیں کہ ساری زندگی عیش ہی کرے گا۔ خوب بہت خوب۔ ویسے تم اور تمہاری اماں کون سے مولوی کے پاس جاتی ہو تعویذ گنڈوں کے لیے مجھے بھی پتا بتا دو، کچھ کام مجھے بھی کرنے ہیں۔ میں بھی تعویذ لے لوں گی۔''

جب سے مریم کا بچہ ضائع ہوا تھا اور ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آئندہ پریگنینسی کے ففٹی ففٹی چانس ہیں۔ مریم کی ساس نے اُس کا پیچھا ہی پکڑا ہوا تھا اور مریم جو ایک عجیب سے دوراہے سے گزر رہی تھی۔ وہ بھی بدلحاظ اور چڑچڑی سی ہوگئی تھی۔

''معاف کیجیے گا اماں اگر ہم تعویذ گنڈے کرنے والے ہوتے تو زندگی اس طرح یہاں نہیں گزر رہی ہوتی۔'' مریم نے چیخ کر کہا۔

رحمان بابا

رحمان بابا کا نام عبدالرحمان تھا لیکن لوگ آپ کو رحمان بابا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ کے والد کا نام عبدالستار خان تھا جو پٹھانوں کے ایک مشہور قبیلے مہمند سے تعلق رکھتے تھے۔ رحمان بابا آج سے تقریباً سو سال قبل پشاور کے قریب ایک گاؤں بہادر کلی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے وقت کے مشہور عالموں سے علم حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے ہندوستان کے بعض علاقوں کی بھی سیر کی تھی۔ آپ درویش قسم کے آدمی تھے۔ دنیاوی شان و شوکت اور مال و دولت سے آپ کو کوئی دلچسپی نہ تھی' اسی لیے آپ نے جوانی بھی فقیری میں بسر کی۔ آپ اپنا گاؤں چھوڑ کر پشاور کے قریب ایک دوسرے گاؤں ہزار خوانی میں رہنے لگے۔ آپ نے اپنی زندگی کا زیادہ وقت اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت میں بسر کیا۔ آپ کی شہرت کا سبب آپ کی شاعری ہے' آپ پشتو زبان کے مشہور و معروف صوفی شاعر تھے۔ رحمان بابا کو وفات پائے سینکڑوں برس گزر چکے ہیں لیکن لوگوں کی آپ سے عقیدت کا یہ حال ہے کہ آج بھی آپ کے مزار پر ایک میلہ لگا رہتا ہے۔ گلوکار سریلی دھنوں کے ساتھ آپ کا کلام گاتے ہیں۔ ہر سال آپ کے مزار پر عرس بھی ہوتا ہے۔

حسن انتخاب: شاہانہ خان۔ کراچی

''اچھا! تو یہاں بہو بیگم خوش نہیں ہیں۔ کہاں زندگی گزارنا چاہتی تھیں آپ۔'' مریم کی ساس کو اُس کے جواب سے جیسے پتنگے سے لگ گئے۔

''ارے اماں آپ کیوں بھول جاتی ہیں کہ ہماری بھابی بیچاری اپنے چچا کے گھر میں زندگی گزارنا چاہتی تھیں۔ لیکن افسوس صد افسوس! اِن کے چچا اور چچا کے بیٹے نے اُن کو بالکل ہی دھتکار دیا اور بیچاری لڑھکتی لڑھکتی ہمارے در پر آ گئیں اور ہم بیوقوفوں نے اِن کی شادی اپنے بھائی سے کرلی۔'' مریم کی بڑی نند نے کچن میں داخل ہو کر ماں کی سلگتی ہوئی گفتگو میں پیٹرول ڈال کر آگ لگائی اور پھر سارے کچن میں شعلے بھڑکنے لگے۔

اُس دن مریم کا پہلی دفعہ ساس اور نندوں کے ساتھ جھگڑا ہوا اور پھر جھگڑے معمول بن گئے۔

کبھی کبھی مریم سوچتی ایسا نہیں ہونا چاہیے لیکن اُس کو ایسا لگتا جیسے اُس کی قوتِ برداشت ختم ہوگئی ہو۔ وقار کا رویہ! ساس نندوں کے طنز! میڈیکل رپورٹ! احساس محرومی! تلخی! معاشی اُلجھنیں! زرقون اور فراز کی محبت! یہ سب باتیں اُس کو سرتاپا بدل رہی تھیں۔ وہ بدل گئی تھی۔

تلخیاں اُس کے مزاج اور اُس کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھیں۔ وہ ذہنی طور پر بیمار ہوتی جارہی تھی۔ ایک ایسی بیمار، جس کی بیماری کی لپیٹ میں بہت سارے مظلوم بھی آرہے تھے۔

☆......☆......☆

''تم خوش ہو نا نرگس!'' زری نے نرگس کی آواز سنتے ہی پوچھا۔

''میں بہت خوش ہوں زری۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ میں آفتاب کے ساتھ ہوں۔ زندگی اتنی خوبصورت

ہوگئی ہے۔ اتنی حسین زندگی کا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لندن کا موسم بہت خوبصورت ہے۔ ابر آلود ٹھنڈی ہوائیں اور وقفے وقفے سے برستی بارش ایک عجیب سا رومانس چاروں طرف بکھیر دیتی ہے اور اُس پر آفتاب کی محبتیں، آفتاب کی شرارتیں......"

نرگس کا ایک ایک لفظ محبتوں کی داستان سنا رہا تھا۔ زری کے دل کو ایک عجیب سا اطمینان اور خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ نرگس اُس کی دوست تھی بلکہ دوست سے زیادہ ہی تھی۔ نرگس کی خوشیاں، اُس کی خوشیاں تھیں۔ وہ نرگس کے لیے دعا گو تھی۔ بہت دنوں بعد اُس کے لبوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ رینگ گئی۔

"لیکن نرگس بے وفا، میں نے تم کو موی کی رُخصتی کے وقت بہت یاد کیا۔ تم کو معلوم ہے نا کتنی بڑی ذمہ داری تقریباً میں نے اکیلے ہی اٹھائی اور تم! بے وفا لندن کی حسین وادیوں میں محبت بھرے گانے گاتی پھر رہی ہو۔ اور تم ہر وقت ہی گانا گاتی تھیں۔ نرگس میں تمہاری بہن ہوں۔ ہر وقت تمہارے ساتھ ہوں۔ اور اتنے اہم موقع پر تم فرار ہوگئیں۔ یہ کھلا تضاد نہیں۔ ہائیں!" زری نے ہنستے ہوئے نرگس کی کھنچائی کی۔

"اللہ میری بہن تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اگر آفتاب کے ڈیڈی پہلے سے ریزرویشن نہیں کروا دیتے تو کیا میں موی کی رُخصتی کے لیے نہیں رُکتی۔ لیکن کیا کروں زری، شادی کے بعد لڑکیوں کے آگے بظاہر کچھ نہیں لیکن پھر بھی بہت سی رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ورنہ میری جان۔"

نرگس نے بڑے جذب سے کہا۔

اوہو! خیر نرگس تم خوش رہو میں تو مذاق کر رہی تھی۔" نرگس کو شرمندگی کی دلدل میں اُترتے دیکھ کر زری نے ہاتھ بڑھا کر اُس کو سہارا دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ موی کیسی ہے؟ خوش ہے؟ کب جا رہی ہے؟" نرگس نے جیسے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"موی!" زری کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

"موی بہت خوش ہے اور ابا بھی بہت خوش ہیں۔ انہوں نے ایک ذمہ داری اٹھائی تھی اللہ نے وہ ذمہ داری ادا کرا دی ہے۔ چند دنوں بعد وہ دبئی چلی جائے گی۔ ابھی گھر آئی ہوئی ہے۔ ذرا آرام کر رہی ہے۔ کہتی ہے سُسرال میں بیٹھے بیٹھے کمر دُکھ جاتی ہے۔" زری کے لہجے میں بہن کی محبت سے زیادہ مامتا جھلک رہی تھی۔

"زری تم کتنی اچھی ہو۔ کتنی پیاری، کاش میرا کوئی ایسا بھائی ہوتا جو تمہارے قابل ہوتا تو میں تمہارے ماں باپ کے قدموں میں بیٹھ کر تم کو مانگ لیتی۔ کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے تم کو ٹھکرا دیا۔ واقعی ہیرے کی قدر جوہری ہی جانتا ہے۔ وہ جوہر شناس نہیں تھے۔ تم بہت قیمتی ہو۔ تم بادشاہوں کے تاج میں جڑنے والا کوہ نور ہیرا ہو۔ گھر کے اتنے مسائل، ثمینہ بھابی کی شرانگیزیاں، بھائی کی سردمہری، باپ کی بیماری، معاشی پریشانی اور ذمہ داریاں...... لیکن تمہارے مزاج، تمہاری عادات اور تمہارے اخلاق پر کسی بات نے کوئی فرق نہیں ڈالا۔ تم وہی ہو، محبتوں کی سفیر، محبتوں کی سوداگر، تم کتنی اچھی ہو اور تمہارے ساتھ کتنا بُرا ہو رہا ہے۔"

"ابا کی طبیعت آج کل ٹھیک نہیں رہتی۔ کچھ کمزور ہو رہے ہیں۔ میرا فائنل سمسٹر ختم ہو گیا ہے۔ نرگس! میں سوچ رہی ہوں کسی اسکول میں جاب کر لوں۔" زرقون کی آواز نے نرگس کو خیالات کی وادی سے ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

"کیا کہا تم نے۔ تم اسکول میں جاب کرنا چاہتی ہو۔ لیکن کیوں؟" نرگس حیران ہوئی۔

"بھائی ابا کی دوائی آنی ہے اور بھائی رات کو ابا کو بہت گرمی لگتی ہے۔ اُن کے کمرے کا اے سی بالکل بھی کام

نہیں کر رہا۔ میں نے ٹیکنیشن کو بلوایا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ریپیئرنگ بہت مشکل ہے۔ تو بھائی ابا کے کمرے کا اے سی بدلوا دو۔'' رات کو جب عرفان گھر آیا تو اُس کے کمرے میں جا کر زرقون نے اُس سے کہا۔

''بھئی ابا کی دوائی تو میں لا دوں گا مگر اے سی بدلوانا تو بہت مشکل ہے۔ میرے پاس بالکل گنجائش نہیں ہے۔ دکان بک تو گئی ہے لیکن ایک پیسہ نہیں بچا۔ اب تم یہ سمجھ رہی ہو گی کہ بھائی کے پاس پیسے ہیں، تو زری اس وقت میرا ہاتھ بہت تنگ ہے۔'' عرفان نے معذرت ظاہر کی۔

''لیکن بھائی......'' زرقون ہکلائی۔

''ارے بھئی! اتنی پڑھی لکھی بنتی ہو۔ تمہاری تو سمجھداری کے ڈنکے پٹے ہوئے ہیں، تم کو نظر نہیں آتا کہ عرفان کس قدر پریشان ہیں اوپر سے تم لوگوں کی فرمائشیں...... بھئی اے سی خراب ہے تو اے سی کے بغیر سو جاؤ آخر ''قبر'' میں بھی تو جا کر سونا ہے یا وہاں پر بھی اے سی لگیں گے۔ حد ہو گئی بھئی عیاشیوں کی۔'' عرفان جیسے ہی دروازے کی بیل سُن کر کمرے سے باہر نکلا۔ ثمینہ نے ماتھے پر بل ڈال کر تیز اور تلخ لہجے میں زرقون کو باتیں سنائیں۔

ایک لمحہ کو تو زرقون کے جیسے کان سُن ہو گئے۔ گو کہ ثمینہ بہت بدلحاظ، بدتمیز اور زبان دراز تھی لیکن رفیق احمد کے لیے اس قدر نازیبا اور تضحیک آمیز الفاظ اُس نے آج تک استعمال نہیں کیے تھے۔ رفیق احمد گھر کے سربراہ تھے۔ اور زری...... زری کی تو جان تھی اپنے باپ میں۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ ثمینہ کا منہ نوچ لے لیکن یہ اُس کے ماں باپ کی تربیت نہیں تھی۔ اُس نے اپنے اوپر اپنے غصہ اور جذبات پر کنٹرول کرتے ہوئے آہستہ لیکن سرد لہجے میں کہا۔

''بھابی یہ گھر، وہ دکان اور ہر چیز میرے ابا کی ہے ہم لوگ نہ تو عیاشیاں کرتے ہیں اور نہ ہی ہمیں عیاشیاں کرنے کی عادت ہے۔ عیاشی اور ضرورت میں فرق ہوتا ہے۔ ابا کا بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا ہے۔ اُن کو گرمی برداشت نہیں ہوتی۔

میں بھائی کے پیسے نہیں مانگ رہی۔ میں بھائی سے ابا کے پیسوں میں سے کچھ پیسے مانگ رہی ہوں۔''

''کس قدر تیز اور زبان دراز ہے یہ زری۔ اگر مجھے بھی زندگی میں موقع ملا تو انشاء اللہ اس کی زبان گدی سے کھینچ کر چیل کوؤں کے آگے نہیں ڈالی تو میرا نام بھی ثمینہ نہیں۔'' ثمینہ نے کھولتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے عہد کیا۔

''ویسے زری! تمہارے پاس تو پھوپو کا بہت سارا زیور ہے۔ تم اپنے چھوٹے موٹے خرچوں کے لیے اُس میں سے کوئی چیز بیچ دو۔ آج کل تو ویسے ہی سونا بہت ہی مہنگا ہو رہا ہے۔'' ثمینہ نے زری کے ہاتھ میں چمکتی سونے کی دو چوڑیوں کو لالچ اور حسد بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنی دانست میں ایک مخلصانہ مشورہ دیا۔ ارے ہاں یاد آیا...... تم تو اپنے حصے کا زیور خالہ بڑو کی بھینٹ چڑھا چکی ہو۔ تمہارا زیور بھی گیا اور اُن کا بیٹا بھی مر گیا۔ کم از کم کسی سے مشورہ تو کر لیا کرو۔ تم تو گھر کی اماں بن گئی ہو۔ سارے فیصلے خود ہی کرتی پھرتی ہو۔ بھئی ہماری کیا حیثیت جو تمہارے سامنے بولیں۔ تمہاری مرضی ہے، تو ہم اِس گھر میں رہ رہے ہیں۔ تم چاہو تو ایک منٹ میں ہمارا سامان اُٹھا کر روڈ پر پھینک دو۔'' اِس سے پہلے کہ زرقون کو کچھ کہتی ثمینہ نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ زرقون کو اُس کی باتیں تکلیف پہنچا رہی ہیں۔ اُس نے جلدی سے دوبارہ بولنا شروع کر دیا تھا۔

''دیکھیں بھابی! اِس بات کو آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ میں اپنے ابا کے لیے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔

زیور کی تو کوئی اوقات ہی نہیں ہے اور جہاں تک بات ہے خالہ بڑو کی، تو میری مرضی میں نے ابا سے پوچھ کر اُن کو اپنے زیورات دیے تھے اور میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ ہم اُن لوگوں کے ساتھ تو اچھا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں جو ہمارے حق میں اچھے ہوں یا جن سے ہمیں محبت ہو، میرے خیال سے اُن کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کا زیادہ اجر ہے، جن سے آپ کو کوئی خاص لگاؤ اور انسیت نہ ہو۔ جنہوں نے کبھی بھول کر بھی آپ کے ساتھ بھلائی نہ کی ہو۔ لیکن آپ اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے اُن کے ساتھ بھلائی کریں اور اللہ کا شکر ہے میں اُس امتحان میں پوری اُتری۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کا بیٹا نہ بچ سکا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے میرے دل کو اطمینان ہے کہ میں جو کچھ بحیثیت ایک انسان کے اُن کے ساتھ کر سکتی تھی میں نے کیا۔ بالکل اِسی طرح زندگی بھر آپ لوگوں نے میری امی کے ساتھ کوئی بھلائی نہ کی لیکن وہ آپ کو اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ بیاہ کر لے آئیں۔ آپ نے اِس کا بدلہ کیا دیا میرے خیال سے مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں۔ اور پلیز......'' ثمینہ کو بل کھا کر کچھ بولنے کی کوشش کرتے دیکھ کر زرقون نے ہاتھ اُٹھا کر اُس کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور یہ بھی یاد رکھیے کہ میرے ابا کو کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ میں اپنے ابا کے لیے انشاء اللہ ہر آرام مہیا کروں گی۔ آپ فکر مت کریں۔ آپ اپنے پیسے سنبھال کر رکھیں۔'' زرقون نے جو کبھی ثمینہ کے منہ نہیں لگتی تھی آج اُس کو ٹھیک ٹھاک طریقے سے بتا دیا تھا کہ اگر وہ سازشی ذہن رکھتی ہے تو وہ بھی بات کرنا جانتی ہے اور بات کو جتانا بھی جانتی ہے۔

''اونہہ! ابھی میں زندہ ہوں! تجھے زندہ درگور نہ کر دیا تو میں بھی رقیہ بیگم کی بیٹی نہیں اور تُو جس باپ پر اِس قدر پھول رہی ہے دیکھتی ہوں یہ کتنے دن زندہ رہے گا تیری ڈھال بن کر۔'' ثمینہ نے کمرے سے باہر نکلتی زرقون کی کمر پر لہراتی سیاہ بل کھاتی چوٹی پر نظریں جماتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''اوہ مائی گاڈ! زری تمہاری بھابی نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔'' ساری بات سن کر نرگس نے تاسف سے کہا۔

''بس یار اسی لیے سوچ رہی ہوں کہ میں اسکول میں جاب کر لوں۔ تھوڑا ہاتھ ہی فارغ رہے گا اور کم از کم آئندہ اپنے لیے یا ابا کے لیے میں اِن سے کچھ مانگنا نہیں چاہتی۔'' زرقون کا لہجہ قطعیت لیے ہوئے تھا اور وقت......

☆......☆......☆

خود بھی ہم سے بچھڑ کر شاید وہ ادھورا سا ہو
مجھ کو تو اتنے لوگوں میں تنہا بنا دیا

تم بھی ایک عام مرد نکلے فراز۔ دُکھ اِس بات کا نہیں ہے کہ تم بدل گئے۔ دُکھ اس بات کا ہے کہ تم نے نہ تو مجھ سے کبھی محبت کی اور نہ ہی تم میری محبت کو سمجھ سکے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ شکایت اپنوں سے ہوتی ہے اور تم میرے نہیں ہو۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا تم میرے کبھی بھی نہیں تھے۔ ایک سراب تھا جس کے پیچھے میں بھاگ رہی تھی۔ لیکن تم! تم کو میں کیا کہوں۔ تم نے مجھے چھوڑ دیا۔ لیکن میرا دل ماننے کو تیار نہیں ہو رہا۔ فراز کی بے وفائی......ایک ایسا داغ تھا جو زری کو سونے نہیں دیتا تھا۔ اُس کو دُکھ اس بات کا نہیں تھا کہ فراز نے اُس کو ٹھکرا دیا، اُس کو دُکھ اس بات کا تھا کہ اُس کے مقابل اُس جیسی لڑکی تو ہوتی......

فراز نے ایک عام سی لڑکی کے لیے زری کو چھوڑ دیا تھا۔ زری کو ملال فراز کی ترجیحات پر تھا۔
اس وقت سارا گھر گہری نیند میں تھا، لیکن صحن میں موتیے کے پودے کے پاس تخت پر بیٹھی چاند پر نظریں

جمائے، خاموش، اُداس، زری اکیلی تھی۔ وہ اکیلی رہ گئی تھی۔

وہ خاموش راتوں میں

میرا اُداس چاند

دل کی طرح ویران چاند اکیلا، تنہا مضطرب چاند

میرے خوابوں کی طرح ادھورا چاند نصیب کی طرح داغدار چاند

تیرگی میں ڈوبا اُداس چاند

ہجر کا مارا، روتا ہوا چاند

زمین پر میں اور آسمان پر وہ تنہا چاند

بڑھتا، گھٹتا، میرے ساتھ چلتا چاند

جا کے دیکھ وہ بے وفا کیا تجھ کو تکتا ہے

اے میرے چاند! اُس کے کان میں جا کر سرگوشی کر اور بتا!!

میرے اُداس دل کا حال

اے میرے چاند! او میرے چاند!

'زری بہت اچھی ہے لیکن قاسم بھی سچ کہتا ہے زندگی صرف محبتوں کے سہارے نہیں گزرتی اور جو میں امی اور مریم آپا کی مخالفت کے باوجود زبردستی، رو دھو کر زری کو شادی کر کے لے بھی آتا تو کیا ہوتا۔ ہر وقت گھر میں وہی روایتی، ساس نندوں کی چپقلش شروع ہو جاتی۔ محبت تو بھاپ کی طرح اُڑ جاتی اور ہم بن جاتے بس میاں بیوی۔ زری کے لیے اِس گھر میں رہنا مشکل ہو جاتا اور میں زری کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔

فراز نے رات کی تاریکی میں چاند پر نظریں جمائے سوال کرتے ضمیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

میں جانتا ہوں زری آج کل مجھ سے بہت ناراض ہے۔ اسی لیے وہ نہ میرے سامنے آ رہی ہے اور نہ ہی میری کوئی کال ریسیو کر رہی ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ میں زری کو جانتا ہوں۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں اُس کو منا لوں گا۔ میں اُس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اُس سے اُسی طرح ملتا رہوں گا، اُسی طرح چاہتا رہوں گا۔ میں زری کو بتاؤں گا اور وہ میرا یقین بھی کرلے گی کہ میں اُس کے لیے نہیں لڑ سکا۔ فراز نے لان میں روشنی پھیلاتے چاند کو دیکھ کر جیسے اپنے آپ سے کہا۔

فراز کہتے ہیں وہ میرے لیے لڑ نہیں سکے، اور یہ تو میں نے کبھی کہا ہی نہیں تھا کہ وہ میرے لیے، تائی اماں سے بدتمیزی کریں یا مریم آپا کا دل دکھائیں۔ میں نے تو کہا تھا بس وہ شادی نہ کریں۔ صرف حالات بہتر ہونے کا انتظار کریں۔ لیکن اُن کو بہت جلدی تھی۔

وہ شادی کرنے کے ساتھ ساتھ مالدار بھی ہونا چاہتے تھے اور وہ مالدار ہو گئے ہیں۔ لیکن مال...... محبت کا نعم البدل تو نہیں۔ محبت تو وقت کی طرح ہوتی ہے جو ہاتھ سے نکل گئی تو کبھی ہاتھ نہیں آتی، سوچتے ہوئے زری کا ہاتھ بے ساختہ اُس کے گردن میں کچھ ٹٹولنے لگا تو اُس کو خیال آیا کہ اُس نے فراز کا دیا ہوا وہ لاکٹ جو فراز نے اُس کو اپنے ہاتھ سے بنا کر دیا تھا وہ تو اُس نے اُتار کر اُس پاؤچ میں رکھ دیا تھا جو کسی مناسب وقت پر اُس کو فراز کو واپس کرنا تھا۔

''میرا دُکھ بھی کتنا درد بھرا ہے۔ لگتا ہے دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ فراز کی منگنی ہوگئی۔ اُن کے نام کے ساتھ کسی اور لڑکی کا نام آنے لگا اور میں زندہ ہوں...... میں کیسے زندہ ہوں۔

مجھ کو اِس شہرِ محبت میں تنہا کر کے
جانے کس جانب گیا وہ جو کبھی میرا تھا

وہ تھک رہی تھی۔ لیکن خاموش تھی، وہ صبر کر رہی تھی اور صبر کا اجر اپنی شان کے مطابق ادا کرنے والا آسمانوں پر بیٹھا اُس کے صبر کو قبول کر رہا تھا۔

زری سجدے میں گری رو رہی تھی سسک رہی تھی اللہ کی مدد مانگ رہی تھی۔ دکھ، تکلیف، اذیت، ذلت، محرومی، کو سہنے کے لیے اللہ کی مدد مانگ رہی تھی۔ سجدے میں گری قسمت کے کھلتے دروازے وہ نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ لیکن اُس کے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ آسمانوں کی بلندیوں پر بیٹھا۔ کاتب تقدیر اُس کی آہ و زاری سُن رہا تھا اور اُس کا قلم، سُنہرے حروف میں اُس کی تقدیر رقم کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

''مبارک ہو۔'' جمال نے تابندہ کی گردن پر محبت کی مہر ثبت کرتے ہوئے اُس کی انگلی میں ویڈنگ رنگ پہناتے ہوئے کہا۔ تابندہ کے چہرے پر ایک شرگیں مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آؤ اور اپنے خوابوں کے گھر کا دروازہ کھولو میری جان!'' ڈاکٹر جمال نے نشے سے چور، ٹوٹتے ہوئے لہجے میں تابندہ سے کہا۔ اور تابندہ نے Key Hole میں چابی گھمادی۔

''کیسا......'' پھولوں سے سجے حسین ترین بیڈ روم میں قدم رکھتے ہی تابندہ نے اپنے پیچھے آتے ڈاکٹر جمال سے داد چاہی۔

''بہت خوبصورت! بہت اچھا میری جان!'' ڈاکٹر جمال نے اُس کی کلائی پکڑ کر اُس کو اپنے قریب کیا اور اُس کو اپنے سینے سے لگا کر اُس کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا تنگ کر دیا۔ تابندہ کو اپنی پسلیاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں لیکن وہ خوش تھی۔ وہ جانتی تھی محبت میں سب جائز ہے۔

سنبل سے تابندہ اور تابندہ سے مسز تابندہ جمال کا سفر اُس نے بہت سمجھداری اور جمال کی محبتوں کے ساتھ طے کیا۔ آج اُس نے اور جمال نے شادی کی تھی۔ وہ اپنے گھر میں، اپنے خوابوں کے گھر میں، جمال کے ساتھ تھی جمال کی بانہوں میں تھی۔

آج اُس کی سہاگ رات تھی۔ ساری زندگی کی تھکن اُتار کر تھپک دینے والی رات۔ اِس رات کو اِسی انداز میں گزارنے کے لیے اُس نے کتنے لوگوں کی راتوں کی نیند حرام کی اُس کو پروا نہیں تھی۔ آج وہ اپنے محبوب کے لیے اس حسین بستر پر بچھ جانا چاہتی تھی۔

''تابی! تم نے اس مقام تک آنے کے لیے بہت محنت کی ہے۔ اگر تم اپنا وہ برٹش برتھ سرٹیفکیٹ نہیں دیکھتیں۔ تو شاید آج ہم یہاں نہ ہوتے۔ لوگوں کو اندازہ نہیں ہوتا کہ کسی بھی چیز سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ تم نے فائدہ اٹھایا اور خوب اٹھایا۔'' جمال نے اُس کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے اُس کی ذہانت کو سراہا۔

''صرف برٹش پاسپورٹ نہیں جناب ڈاکٹر صاحب! میں نے اپنی اچھی شکل و صورت، اعلیٰ تعلیم، اور بہترین شخصیت...... جہاں جہاں جس چیز کی ضرورت پڑی میں نے استعمال کیا ہے۔ اور میں یہاں آنا چاہتی

تھی۔ ایسے بیڈ روم میں وصل کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ میں اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت عورت کہہ سکتی ہوں۔ میں نے اپنی تقدیر خود لکھی ہے اور اپنی زندگی میں اپنی مرضی کے رنگ بھرنے کے لیے مجھے کس کس کا خون چوسنا پڑا، کس کی گردن پر چھری پھیرنی پڑی مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے۔'' تابندہ نے اپنے محبوب شوہر ڈاکٹر احمد جمال کے سینے میں سر چھپاتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''ایک بات ہے تابندہ! میں اِس بات پر خوش ہوں ساری دنیا کو اپنی انگلیوں پر گھمانے والی میری جان! میری زندگی، میری بیوی، ڈاکٹر تابندہ سنبل میرے ایک اِشارے کی منتظر رہتی ہے۔ ہے نا!'' ڈاکٹر احمد جمال نے محبت اور مان سے مسکراتی، کچھ شرماتی، کچھ لجاتی، اپنے آپ میں سمٹتی، ڈاکٹر تابندہ جمال کے چہرے پر اپنی محبت کی مہر ثبت کرتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل!'' تابندہ مسکرائی۔

ویسے تابی ایک بات تو بتاؤ، وہ جو دو لاکھ ڈالرز یعنی دو کروڑ روپے کا مسئلہ کھڑا ہوا تھا۔ وہ تم نے ایک دم کس طرح حل کیا۔'' تابندہ نے کچھ جواب نہ دیا لیکن اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بتاؤ نا تابی کیسے؟'' احمد جمال منتظر تھا۔

ہے ایک بے وقوف پاکستانی!'' تابندہ ہنسی۔

''کیا بہت مالدار آدمی تھا؟'' احمد جمال نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''تو پھر۔'' احمد جمال حیران تھا۔

''پھر تو پھر۔'' تابندہ ہنسی اور چند سیکنڈز کے بعد اس کی ہنسی احمد جمال کے قہقہے میں چھپ سی گئی۔

☆......☆......☆

''میرا زیور کہاں ہے؟'' مریم جو اپنی خالہ کے گھر شادی میں جا رہی تھی۔ اُس نے تیار ہو کر جب سیف کھولی تو زیور کو نہ پا کر گھبرا کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے اپنے آپ کو کلون میں ڈبوتے وقار سے پوچھا۔

''کون سا زیور؟'' وقار نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''کون سا زیور! میں اپنے زیور کی بات کر رہی ہوں۔ میری امی کے گھر کا زیور ابھی چند دن پہلے تو میں نے دیکھا تھا، لیکن اب نہیں ہے۔ کہاں ہے؟'' مریم حد درجہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس نے پلٹ کر اطمینان سے کُرسی پر جھولتے وقار کو دیکھا تو اُس کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔

''وقار آپ لوگوں نے اپنے گھر کا زیور تو فوراً ہی واپس لے لیا تھا بلکہ میرے خیال سے کسی سے مانگ تانگ کر چڑھایا تھا۔ لیکن میری امی کے گھر کا زیور...... وہ تو میرا ہے اور میرے کمرے میں ماسی نہیں آتی کہ میں یہ کہوں کہ کہیں اُس نے تو ہاتھ کی صفائی نہیں دکھا دی۔ اپنے کمرے کی صفائی میں خود کرتی ہوں۔ میرے نصیب ایسے اچھے کہاں کہ آپ کے گھر میں مجھے کسی بھی قسم کی کوئی سہولت نصیب ہو۔'' مریم نے تیز لہجے میں تقریباً چیختے ہوئے وقار سے کہا۔

''تم بکواس کر چکیں، زبان دراز عورت۔ بڑی تمہارے ابا کی ملیں چل رہی ہیں جو ہر وقت میکے کا گانا گاتی رہتی ہو۔ تم جیسی کالی کلوٹی، منحوس اور زبان دراز عورت کا گھر بسانے کے لیے اُن کے ماں باپ کو تو ساری جائیداد

دینی چاہیے جب انسان تم کو برداشت کر سکتا ہے۔ ورنہ تمہاری شکل دیکھ کر تو صرف تھوکنے کو دل چاہتا ہے۔'' وقار نے اپنے اندر کا زہر اُگلا۔

''وقار آپ مجھ کو منحوس اور زبان دراز کہہ رہے ہیں میں رُل گئی آپ کو، آپ کے گھر والوں کو خوش کرنے کے لیے اور آپ میرے سینے پر منحوس اور بدزبان عورت کا تمغہ لگا رہے ہیں۔ خیر میں ابھی اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتی بلکہ سیدھی شرافت سے بتائیں میرا زیور کہاں ہے؟'' مریم نے عجیب تاسف اور دکھ بھرے لیکن تیز لہجے میں سوال کیا۔

''وہ میں نے بینک کے لاکر میں رکھ دیا ہے۔'' وقار نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بینک لاکر میں! آپ کا کون سے بینک میں لاکر ہے۔ آپ کے کون سے اکاؤنٹ ہیں، مہینے بھر کا خرچہ، دال روٹی تو اِس گھر میں مشکل سے چلتا ہے اور یہاں پر کہانیاں سنائی جا رہی ہیں بینک لاکرز کی...... حد ہوتی ہے جھوٹ کی۔ وقار میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرا زیور کسی بینک وینک میں نہیں رکھا ہوا۔ میرا زیور لا کر دو۔ میرا زیور آخر ہے کہاں؟ تم فقیروں کو مانگنے کی عادت تو تھی ہی اب تم لوگ چوریاں بھی کرنے لگے ہو۔ جلدی بتاؤ، مجھے لگتا ہے وقار تم لوگ تو وہ لوگ ہو جو پیسے کے لیے اپنے گھر کی عورتوں کا بھی سودا کر دو۔'' مریم چیخی۔

''چپ رہ، بے غیرت کُتیا! میں نے بیچ دیا تیرا زیور اور جو تو اتنی بدصورت نہ ہوتی تو تجھے بھی بیچ دیتا۔'' وقار نے اُس کے چہرے کو تھپڑوں سے لال کرتے ہوئے چیختے ہوئے کہا۔

''اور سُن آج......''

☆......☆......☆

سنتے ہیں قیمت تمہاری لگ رہی ہے آجکل
سب سے اچھے دام کس کے ہیں یہ بتلانا ہمیں
تاکہ اُس خوش بخت تاجر کو مبارکباد دیں
اُس کے بعد دل کو بھی ہے سمجھانا ہمیں

تو تم شادی کر رہے ہو؟ تم نے مجھے چھوڑ دیا۔

فراز! مجھے یقین نہیں آ رہا، لیکن یقین تو کرنا ہی پڑے گا۔ جو حقیقت ہے اُس حقیقت کو تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا، لیکن حقیقت اتنی تلخ میری سوچوں، میرے یقین، میرے اعتبار سے اس قدر مختلف ہوگی یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہے کہ محبتوں پر سے اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ محبت کیا ہوتی ہے سمجھ میں نہیں آ رہا، لکھنے سے قاصر ہوں۔ میرے ساتھ آپ نے ایسا کیوں کیا؟

اِس وقت جب میں یہ صفحات لکھ رہی ہوں تو میرے ہاتھ کپکپا رہے ہیں۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا رہی ہیں۔ اِن صفحات پر جو دھبے ہیں وہ بہت قیمتی ہیں فراز! وہ دھبے میرے آنسو ہیں۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو وہ لہو کیا ہے

میں نے زندگی میں صرف آپ سے محبت کی۔ آپ کو چاہا۔ کہتے ہیں جذبے پتھروں کو پگھلا دیتے ہیں تو میری سچی محبت آپ کے پتھر دل پر کوئی اثر نہیں ڈال سکی۔ میں نے زندگی بھر وہ کیا جو آپ نے چاہا۔ اعلیٰ تعلیم!

میں نے آپ کی خواہش پر حاصل کی۔ آپ سگھڑ اور گھریلو زرقون چاہتے تھے۔ میں نے دنیا بھر کے کورسز کر ڈالے۔ آپ کو سیاہ رنگ پسند تھا۔ میری الماری سیاہ کپڑوں سے بھر گئی۔ آپ کو پُر اعتماد لڑکیاں پسند تھیں۔ میرا شیلف شیلڈ اور ٹرافیوں سے بھر گیا۔

میں نے تو آپ کو سجدوں میں مانگا اور آپ نے مجھے ایسی ٹھوکر ماری کہ میرا محبت سے اعتبار اُٹھ گیا۔

گڑیا سے کھیلنے سے لے کر یونیورسٹی کی لائی تک میری زندگی میں صرف آپ رہے، یا میری زندگی ہی آپ رہے۔ میں نے تو کبھی کسی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اور آپ نے میری جگہ کسی اور کو دے دی......

دُکھ اِس بات کا نہیں ہے کہ آج میری جگہ کوئی اور آپ کے ساتھ ہے یا اب آپ کا نام کوئی اور اپنے نام کے ساتھ لگائے گا۔

آپ کے دل پر میری محبت، میری وفاؤں میری پرستش کا اثر کیوں نہیں ہوا۔

میری لکھی ہوئی باتوں کو آپ سمجھ ہی نہیں پائیں گے کیونکہ میں احساسات لکھ رہی ہوں۔ اور آپ الفاظ پڑھ رہے ہیں۔

بہت فرق ہے، سوچ میں، جذبات میں اور احساسات میں بہت فرق ہے۔

اور فراز...... میں یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے آپ سے شکایت نہیں۔ نہیں مجھے آپ سے بہت گلہ ہے۔ میں شاید آپ کو کبھی معاف نہ کرسکوں۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے آپ سے نفرت ہے اور مجھے اب آپ سے محبت نہیں ہے۔ محبت اتنی جلدی اپنی جڑیں نہیں چھوڑتی، اگر محبت ہو...... تو...... لیکن آپ کیا جانیں محبت کیا ہوتی ہے۔

محبت انسان کو بے بس کر دیتی ہے اور بعض باتوں میں مجھے اپنا آپ بے بس محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ہاں میں اب یہ دعا ضرور کرتی ہوں کہ اللہ اپنی رحمت اور کرم سے آپ کا خیال تک میرے دل سے نکال دے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میرا اللہ میری یہ دعا ضرور سنے گا۔

میں آپ کی خوشیوں کے لیے دعا گو ہوں۔ گو کہ یہ دعا مانگنا بہت مشکل ہے۔ لیکن آپ میں اور مجھ میں جو فرق ہے...... وہ بس اِسی دعا کا ہے۔ ورنہ میرے ساتھ تو وہ معاملہ ہے کہ......

محبتوں میں ایسی ہار ہوگئی
کہ میں اب
جیتنے سے بھی خوفزدہ ہوگئی
کہانی میری بس اتنی سی ہے
کہ
میری محبتوں کی اور
اُس کی بے وفائیوں کی انتہا
ایک ساتھ ہوگئی
زرقون رفیق احمد

آج فراز کی بارات تھی۔ زری اپنے کمرے میں بیٹھی۔ اکیلی تنہا، اپنی ڈائری کے سفید صفحوں کو اِنک کی سیاہی سے بھرتے ہوئے اشکبار آنکھوں کے ساتھ دل کی باتیں کر رہی تھی۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ سارا گھر، خاموش تھا۔ وہ بہت دیر تک اپنے باپ کے پاس بیٹھی رہی۔ اُن سے باتیں کرتی رہی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے پیارے ابا کو اُس کی تکلیف کا اندازہ ہو۔ اور شاید وہ اس میں کامیاب بھی ہوگئی تھی۔

اُس نے پین کو ڈائری میں رکھا۔ اور صحن میں چلی آئی۔ رات کے پچھلے پہر چلتی، ٹھنڈی ہوا پھولوں اور پتوں کو گدگدا رہی تھی اور اُس کو ہاں اُس کو بری طرح رُلا رہی تھی۔

وہ آج دل بھر کر رونا چاہتی تھی۔ وہ اپنے زخموں کی تشہیر نہیں چاہتی تھی۔ اُس کی تکلیف پر غمزدہ ہونے والی ماں منوں مٹی تلے سو رہی تھی۔ اُس کو بہت پیار کرنے والی اُس کی بہن مومو، بہت دُر، بیٹھی اُس کو یقین تھا کہ اُس کے لیے دعا گو تھی۔ اُس کی جان سے زیادہ عزیز دوست نرگس۔ سات سمندر پار اپنی زندگی کے ریشمی تاروں میں اُلجھی ہوئی تھی۔

اُس کا باپ، اُس کا باپ، اُس کے لیے زندگی میں پہلی بار اپنے بھائی سے ناراض ہوا تھا۔ لیکن وہ کسی سے ناراض نہیں تھی۔ لیکن وہ تنہا تھی اور بہت دکھی تھی۔

اُس کو مریم پر حیرت تھی۔ اُس کو تائی اماں (جہاں آراء بیگم) کے رویے اور سوچ پر دکھ تھا۔ اُس کو اپنے تایا سے بہت محبت تھی۔ اور اُن کے لیے دعا گو تھی۔ اور فراز! فراز کے متعلق وہ اب سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

☆......☆☆

''زری! زری! جلدی اٹھو۔ زری اٹھو۔'' وہ جو گہری نیند سو رہی تھی۔ عرفان کے جھنجھوڑنے پر اُٹھ بیٹھی۔

''زری تم کو ابا بلا رہے ہیں۔ زری ابا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ جلدی کرو۔'' عرفان نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر بستر سے کھینچا۔

''ابا بلا رہے ہیں! لیکن کیوں؟ میں ابھی ابھی تو ابا کے پاس سے آئی ہوں۔'' زری نے نیند سے بوجھل لہجے میں حیرانگی سے گھبرائے ہوئے کھڑے عرفان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابا کو کیا ہوا!'' زری نے نیند میں ڈوبی آواز میں بستر پر پڑا اپنا دوپٹا ہاتھ سے ٹٹولا۔

پتا نہیں زری! جلدی چلو۔ میں پانی پینے اٹھا تھا اور جب میں نے ابا کے کمرے کی طرف دیکھا تو......''

عرفان کے منہ سے نکلنے والے لفظوں نے جیسے زری میں بجلی سی بھر دی اور وہ گھبرا کے ننگے پیر اور ننگے سر رفیق احمد کے کمرے کی طرف بھاگی۔

دنیا میں بسنے والے انسانوں میں اُس کا آخری ہمدرد۔

اُس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

☆☆......☆☆

☆ کیا زرقون کا آخری سہارا، اُس کا باپ زندگی کی جنگ ہار جائے گا؟

☆ رقیہ بیگم اور ثمینہ اب کیا سازش رچانے والی ہیں؟

☆ مریم کو وقار نے کیا کہا؟

☆ کیا مرتضٰی احمر کی بات مان کر شادی کے لیے رضا مند ہو جائے گا؟

اِن سب سوالوں کے جواب کے لیے آئینہ، عکس اور سمندر کی آخری قسط کا انتظار کیجیے۔

چائے کی پیالی

اُس کے خاوند نے غیر متوقع طور پر اُس کے اعتماد کی چادر کا کونا پکڑ کر یوں کھینچا کہ وہ لرز گئی۔'' ایک خیال مجھے پریشان کرتا رہتا ہے۔'''' خیریت ہے؟'' کیسا خیال؟'''' تم ناراض ہو جاؤ گی۔'''' میں اور آپ سے ناراض..... اگر خواب میں بھی آپ نے یہ.....

ایک خوش اندام، خوب صورت بیوی کا فسانہ، بطورِ انتخاب

ارینہ نے اپنے من میں جلتی لالٹین کی لو نیچی کی۔ درد بڑھتا جا رہا تھا۔

ماضی کے سفر کی صعوبت سے وہ ہانپ گئی تھی۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے، جب ارتات احمد نے اُس کا گھونگھٹ الٹا تھا تو اُس کا کہنا تھا کہ تمہارے حسن نے میری آنکھیں خیرہ کر دی ہیں۔ گھونگھٹ اُلٹتے ہی اُسے سکتہ ہو گیا تھا، اور وہ ساری باتیں بھول گیا تھا۔

شبِ عروسی میں اُس کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا، لیکن اُس کے حسن کے سامنے اُس کی زبان پر تالے پڑ گئے تھے۔ وہ بس ایک ٹک اُسے دیکھتا رہا۔ اُن دونوں کے درمیان بس خاموش زبان تھی۔ وہ اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کرتا، کم تھا۔ اُس کی شریکِ سفر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ آخری ڈگری اُس نے اوکسفرڈ یونیورسٹی سے لی تھی۔

سُسرال میں اُسے سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔

گھر میں پہلے ہی کام کرنے والے ملازمین کی کوئی کمی تھی کہ اُسے تو ارتات احمد نے مغلیہ عہد کی شہزادیوں کی طرح کئی کنزیں رکھ دیں۔ وہ کئی بار سوچتی۔'' کیا یہ میرے ظاہری حُسن کی پذیرائی ہے؟'' ارتات احمد نے میرے اندر تو جھانکا ہوتا۔ وہ مری سیرت کی پذیرائی کرتا تو مجھے اِس سے کہیں زیادہ خوشی ہوتی۔ اُس گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ اُس گھرانے کے خیالات بڑی حد تک باغیانہ تھے۔ اُن کے ہاں دولت ہر مسئلے کا حل تھی، جب کہ اُسی گھر میں اُس کی نند اپاہج تھی۔ پانی کی طرح پیسا بہایا گیا، لیکن اپاہج پن برقرار رہا۔

وہ جنت نظیر زندگی گزار رہی تھی۔ اُس نے اپنے اخلاق سے سب کے دل جیت لیے تھے۔ اُسے ایک گلہ تھا، جو اُس نے کبھی کیا نہیں۔ اُس کا خاوند کاروباری معاملات کی وجہ سے جب رات گئے گھر لوٹتا تو وہ اُس کے انتظار میں اندر سے

ٹوٹ پھوٹ چلی ہوتی تھی۔ انتظار اُس کے باطنی وجود کی چولیں ہلا کر رکھ دیتا، لیکن زندگی کی آسائشات کا سوچ کر وہ چپ ہو رہتی۔ اُسے یہ ادارک بھی تھا کہ اُس کا خاوند اُسے ٹوٹ کر چاہے۔ اسی پیار کی بدولت وہ اپنی اکلوتی اپاہج نند کے آرام اور علاج کا پورا خیال رکھتی۔

نند اُس کی دوست تھی، ساتھی اور غم گسار! ارتات کے آنے پر وہ اُسے مسکرا کر کہتی۔ ''لو بھابی، ہمارے حصے کا وقت ختم ہو گیا۔''

ایک دن زلزل آیا... تو اپنی جان بچانے کے خوف سے اکیلے بھاگنے کی بجائے وہ نند کی کرسی بھی ساتھ گھسیٹ لائی۔ لیکن اُسی رات اُس کے من میں آنے والے زلزلے کی شدت ریکٹر اسکیل پر بہت زیادہ تھی۔ اُس کے اندر کی عمارت زمیں بوس تو نہیں ہوئی، لیکن دراڑوں نے عمارت کم زور کر دی۔

اُس کے خاوند نے غیر متوقع طور پر اُس کے اعتماد کی چادر کا کونا پکڑ کر یوں کھینچا کہ وہ لرز گئی۔

''ایک خیال مجھے پریشان کرتا رہتا ہے۔''

''خیریت ہے؟'' کیسا خیال؟''

''تم ناراض ہو جاؤ گی۔''

''میں اور آپ سے ناراض...... اگر خواب میں بھی آپ نے یہ منظر دیکھا تو معاف نہیں کروں گی۔''

''میرے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''اولاد نہ ہونے کی وجہ سے تو آپ پریشان نہیں۔''

''نہیں یہ بات نہیں۔''

''بات یہی ہو گی۔ رپورٹ آجانے سے آپ پریشان ہیں تو کھل کر کہیں۔ اگر میں اولاد پیدا نہیں کر سکتی تو پروین شاکر کی طرح کمالِ ضبط کو آزما کر آپ کی دلہن اپنے ہاتھوں سے سجاؤں گی۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو میں ساری عمر آپ پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔''

''تم بات کو کہاں سے کہاں لے گئی ہو۔''

''تو پھر مسئلہ کیا ہے؟''

''میرے اندر زہر پھیل گیا ہے۔''

وہ یوں تڑپی جیسے اُسے کسی صحرائی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ ''بات کھل کر کہیں۔'' وہ پلنگ پر بیٹھی تھی اور اُس کی زلفیں پریشان تھیں۔

''میرے اندر شک کا زہر پھیل گیا ہے۔''

''میں آپ کی اِن اُلجھی باتوں کو سمجھ نہیں پا رہی۔ آپ کہہ کیا رہے ہیں؟''

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے کردار پر شک کرنے کے بجائے تمہارے ساتھ کھل کر بات کی جائے۔ اگر تم جھوٹ نہیں بولو گی تو بات یہیں دفن ہو جائے گی۔''

وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ خزاں رسیدہ پتے کی طرح...... اُس کا تن من اُجلا تھا۔ بے داغ، کہیں کوئی خراش نہیں تھی۔ پھر بھی جانے اُس کے مجازی خدا نے اُس پر کیوں شک کیا تھا۔

اُس نے اپنے آپ کو جمع کیا۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ انسانی وجود کے ٹکڑے بکھر جائیں تو انہیں سمیٹنا مشکل ہوتا ہے۔ اُس نے اپنے وجود کے ریزے جمع کیے، اور حواس کو مجتمع کیا۔ اُس کی زندگی بکھرنے لگی تھی۔ نہ جانے شک کی چنگاری اُس کے مجازی خدا کے من میں کہاں سے آ گری تھی۔ غصے اور جذبات کی رو میں بہنے کا وقت تھا۔ اُس نے پورے اعتماد سے سوال کیا۔

''میں شک کی وجہ جان سکتی ہوں؟''

''تمہارے بے پناہ حُسن نے مجھے اِس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔''

''اِس میں میرا کوئی قصور نہیں۔''

''کیسے؟''

''میں نے اپنے آپ کو تخلیق نہیں کیا۔ یہ تخلیق کار کی عنایت ہے۔''

''ایک بات کہوں۔''

''کہیے۔''

''اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں تمہارا کوئی دوست بھی رہا ہے؟''

''دوست سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' اُس کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔

''کوئی ایسا شخص جس نے تمہیں پسند کیا ہو۔''

''پسند کرنے والے تو ہزاروں تھے۔ شمع کے گرد پروانے تو رقص کرتے ہی ہیں۔''

''تم کچھ چھپا رہی ہو۔''

''میں کچھ بھی نہیں چھپا رہی۔ آپ نے سوال ہی غلط کیا ہے۔ میں ہزاروں کی پسند سہی، لیکن میں نے کسی کو پسند نہیں کیا۔ میری زندگی میں آپ پہلے مرد ہیں۔''

''میں کیسے یقین کر لوں؟''

''بے یقین زندگی آپ کو ذہنی عذاب میں

مبتلا کردے گی۔ میں آپ کی ہوں۔ مجھ پر یقین کیجیے۔ یہ یقین اسٹامپ پیپر پر لکھ کر نہیں دیا جاسکتا۔ دل کے اسٹامپ پیپر کسی عدالت سے نہیں ملتے۔ میں اپنی عدالت میں بے گناہ ہوں۔ تم اپنی عدالت سے فیصلہ کرلو۔ مشکلات کی ہوا چل پڑی تو یقین کے خیمے اکھڑنے سے ہم عمر بھر کے لیے بے سائباں ہوجائیں گے۔'' اُس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔

وہ بے یقینی کی پگ ڈنڈی پر ننگے پاؤں بھاگ رہا تھا۔ من کی سلگن اُس کے لیے سوہانِ روح بن چکی تھی۔ گھر میں سرد مہری کے لال بیگ نکل آئے۔ اُن کا سدباب کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اریبہ کے اندر ایک دن انتقام کے ناگ نے پھن پھیلایا۔ اُس نے قوتِ ارادی کے منتر سے اُسے رام کیا۔ اُسے معلوم تھا کہ اگر یہ ناگ پھن پھیلائے اپنا کام کرگیا تو کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ وہ مسمار ہوتی چلی گئی۔ اُسے اپنے آپ کو تعمیر کرنا تھا، لیکن اُس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔

اُس نے تمام حربے آزما ڈالے۔ اُس کی روح، اُس کے جسم سے نکل چکی تھی۔ وہ بس ایک ڈھانچا تھی۔ ایک پنجر......! اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا وہ سانس کیسے لے رہی ہے۔ وہ تیمور کی چیونٹی تھی۔ وہ اپنے شریکِ سفر کے تعمیر شدہ شک کے کنویں میں سے نکلنے کی سعی کرتی رہی۔ وہ کنارے تک پہنچتی، لیکن خاوند کی کائی زدہ گفتگو اُسے پھر پاتال میں دھکیل دیتی۔ اِسی کوشش میں ایک دن ایک خیال اُس کے اندر کوندے کی طرح چمکا۔ وہ چونکی، اور یوں مسکرائی جیسے اچانک اندھیرے میں کوئی جگنو چمک اٹھے۔ اُسے زندہ رہنے کو کنارہ ہاتھ آگیا۔ وہ خوشی سے چیخنا چاہتی

ایک پرانا دن پھر بیتا

یاد کے ہاتھ یہ لمحے کا بدن راکھ ہوا
رات نے کانچ پیا اور پسِ تنہائی
تیری تصویر پہ آنسو نے اُتاری آنکھیں

شاعر: کامی شاہ

تھی، لیکن اِس ڈر سے کہ اُسے پاگل نہ سمجھ لیا جائے، ضبط کرگئی۔ اُس نے کپڑے تبدیل کیے، ہلکا سا میک اپ کیا اور کمرے میں ٹہلتی اور گنگناتی رہی۔ سارے منظر بدل گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کررہی تھی۔ جب اُس نے نند کے سامنے کھانا لاکے رکھا تو اُس نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ ''یہ تم ہو!''

''ہاں...... میں ہوں۔ اتنی حیران کیوں ہورہی ہو۔''

''یہ تبدیلی کیسے؟''

''مجھے وہ مل گیا ہے۔''

''کون مل گیا ہے؟''

''جس کی تلاش میں صدیوں سے میری روح بھٹک رہی تھی۔''

''میرے بھائی کے علاوہ بھی کوئی ہے؟''

''ہاں ہے۔''

''عقل کے ناخن لو۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا!''

''اگر تم رازدار رہنے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں وہ راز بتاسکتی ہوں۔'' اُس کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔ عورت کے فطری تجسس سے مجبور ہوکر اُس کی نند نے وعدہ کرلیا۔

''میں نے اپنے اندر ایک تخیل تعمیر کیا ہے۔ ایک وجیہہ شخص کا تخیل! بالکل ایسے جیسے فرانسیسی

ناول نگار پیرا کولنئی کے عظیم الشان ناول ''افروڈائیٹ'' کر میکزی کردار کا تخیل! جب وہ مجھے چھوتا ہے تو میرے پورے وجود میں موسیقی کی لہریں اٹھتی ہیں، میرا پورا جسم موسیقی کے آلات میں بدل جاتا ہے۔ جب وہ میری زلفوں کے تار پر کوئی راگ چھیڑتا ہے تو میں دنیا و مافیہا سے کٹ جاتی ہوں۔ میرے ہونٹوں کے پیانو پر اُس کی انگلیاں نئے اور اُلوہی سُروں کو جنم دیتی ہیں۔ میری آنکھوں کے بربط پر اُس کا لمس راگ درباری میں بدل جاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھے بانہوں میں اٹھا لے تو مجھے یوں لگتا ہے، میں اُلن فقیر کا اِکتارا ہوں جسے وہ بے خود ہو کر بجا رہا ہے۔ میں 'میں' نہیں رہتی، 'تم' ہو جاتی ہوں۔ میں اُس کی آواز پر چونک اٹھتی ہوں۔ وہ میرے ساتھ رہتا ہے۔ میں اُس کی دیوداسی ہوں۔

اُس دن دوپہر کے کھانے پر اُس کا خاوند آیا تو وہ کھانے کی میز پر نہیں تھی۔

''ارینہ کہاں ہے؟''

''اُس کی طبیعت خراب ہے۔''

وہ خواب گاہ میں داخل ہوا تو وہ کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔ اُس نے اُسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ اگلی صبح وہ ناشتے پر بھی نہیں تھی۔ استفسار پر اُس نے ناسازیٔ طبیعت کا بہانہ کیا۔ آنے والے دنوں میں اُس نے محسوس کیا کہ ارینہ اُس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ خلیج اُس کی اپنی پیدا کردہ تھی۔ اُس کی طبیعت میں جھلاہٹ آنے لگی۔

''تم کس دنیا میں رہتی ہو؟''

''اپنی دنیا میں رہتی ہوں۔''

''کون سی دنیا ہے تمہاری؟''

''تمہیں اِس سے کیا؟''

''تم ہر وقت بنی سنوری کیوں رہتی ہو؟''

''میری اپنی بھی کوئی زندگی ہے!''

''تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تم میری بیوی ہو۔''

''شاید!''

وہ غصے میں پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

ارینہ اُس سے دور ہوتی چلی گئی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ساحل پر کھڑا ہے اور سامنے سمندر میں اُس کا مال بردار جہاز آہستہ آہستہ ڈوب رہا ہے۔ وہ اُسے بچانا چاہتا تھا، لیکن سمندر پُر شور تھا۔

اُس نے ارینہ کو کسی ماہر نفسیات کو دکھانے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر سے ملاقات کا وقت لے کر جب وہ گھر پہنچا تو ارینہ کسی انگریزی ناول میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ شیشے کی میز پر رکھی چائے شاید ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

''ارینہ!''

گہری خاموشی تھی۔

اُس نے دوبارہ پکارا۔ ''ارینہ، ناول میں اتنا استغراق!'' اُسے ارینہ کی خاموشی سے اُلجھن ہونے لگی۔

''ارینہ......ارینہ!''

اُس نے ناول بند کیا اور پوچھا۔ ''یہ آپ کس کو پکار رہے ہیں؟''

''ارینہ!''

''یہ آپ کے لیے کوئی چائے رکھ گیا ہے۔ پی لیجیے۔'' اُس نے ارینہ کی آنکھوں میں جھانکا تو آنکھوں میں رکھی، اُس کے حصے کی چائے کی پیالی نہ جانے کب سے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ میگزین

- رنگِ کائنات
- دوشیزہ گلستاں
- نئے لہجے، نئی آوازیں
- یہ ہوئی نا بات
- لولی وُڈ، بولی وُڈ
- نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل
- کچن کارنر
- حکیم جی!
- بیوٹی گائیڈ

دوشیزہ گلستاں

اسماء اعوان

فرمانِ الٰہی

بھلا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو اس (غرور) کے سبب سے کہ اللہ نے اس کو سلطنت بخشی تھی، ابراہیم (علیہ السلام) سے پروردگار کے بارے میں جھگڑنے لگا۔ جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا میرا پروردگار تو وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ وہ بولا زندہ اور مار تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تُو اسے مغرب سے نکال دے (یہ سن کر کافر) حیران رہ گیا۔ اور اللہ ناانصافی کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

سورۃ البقرہ 2۔ ترجمہ: آیت 258

حدیثِ نبوی

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اہلِ ایمان کی مثال باہمی محبت، رحمدلی اور شفقت میں ایک جسم کی طرح ہے کہ جب جسم کے کسی ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم اس میں شریک ہو جاتا ہے نیند اور بخار میں (چنانچہ درد مثلاً: کان میں ہے لیکن پورا جسم بے چین ہے، نیند نہیں آرہی، درد کی وجہ سے، بخار ہے تو پورا جسم متاثر ہے اور اس بیماری میں شریک ہے، اسی طرح پوری امتِ مسلمہ کی مثال ایک جسم کی مانند ہے ایک مسلمان کی تکلیف پوری امت مسلمہ کی تکلیف ہے۔) 2054

(صحیح مسلم شریف: باب تراحمہ المومنین وتعاطفھم الخ)

میری ڈائری سے

ایک دن سونے نے لوہے سے کہا۔ ''ہم دونوں ہی لوہے کی ہتھوڑی سے پٹ جاتے ہیں لیکن تم اتنا چلاتے کیوں ہو۔'' لوہے نے بہت خوب صورت جواب دیا۔ ''جب اپنا ہی اپنے کو مارتا ہے تو زیادہ درد ہوتا ہے، چیخ نکل ہی جاتی ہے۔

مرسلہ: حاذق ندیم۔ کراچی

کرسی کے فائدے

یہ کیا ہے......؟ کہا یہ کرسی ہے۔

اس کے کیا فائدے ہیں ......؟ اس کے بڑے بڑے فائدے ہیں اس پر بیٹھ کر قوم کی 'بے لوث' خدمت کی جاسکتی ہے، اس کے بغیر نہیں کی جاسکتی، اس لیے جب لوگ قومی خدمت کا جذبہ زور مارتا ہے تو وہ کرسی کے لیے لڑتے ہیں اور ایک دوسرے پر اٹھا پھینکتے ہیں۔

کرسی بظاہر لکڑی کی معمولی سی چیز ہے مگر لوگوں میں اخلاقِ حسنہ پیدا کرتی ہے۔ بڑے بڑے پاٹے خان جب اس کے سامنے آتے ہیں تو خودی کو بلند کرنا بھول جاتے ہیں اگر کوئی نہ بھی

بیٹھا ہو تب بھی سلام کرتے ہیں۔
ابن انشاء کی کتاب ''اردو کی آخری کتاب'' سے اقتباس۔
منتہیٰ ظہیر......لطیف آباد کا انتخاب

فلسطینی مجاہد

یہ فلسطینی مجاہد
سر پہ باندھے ہیں کفن
موت سے آنکھیں ملائے
بڑھ رہے ہیں صف شکن
کہہ رہی ہے ساری
دنیا سے میونخ کی فضا
ایسی گیدڑ بھبکیوں سے
شیر بھی ڈرتے ہیں کیا؟
جان کی پروا نہیں
سر دے کے ثابت کر دیا
طرز عمل اسلاف کا
اک بار پھر تازہ کیا

شاعرہ: رضوانہ کوثر

نیکی

ایک ماں بچے کو گود میں لیے رو رہی تھی کہ وہاں سے ایک خوش پوش آدمی گزرا اور رونے کی وجہ پوچھی تو عورت نے کہا: ''جناب میرا بچہ بیمار ہے اور دوا کے لیے پیسے نہیں ہیں۔''
اس آدمی نے 1000 روپے کا نوٹ دیا اور کہا ''جاؤ دوا لے آؤ اور باقی پیسے مجھے لا کر دو۔''
عورت گئی اور تھوڑی دیر بعد دوا لے کر باقی 800 روپے اپنے محسن کو واپس دیئے تو وہ آدمی بولا: ''شاباش! ہم سب کو نیکی کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر کو فیس مل گئی، تمہیں دوا مل گئی اور میرا جعلی نوٹ چل گیا۔''

مرسلہ: عمر شیخ۔ ناظم آباد کراچی

باتوں سے خوشبو آئے

☆ آپ کا پل پل بدلتا رویہ آپ سے وابستہ لوگوں سے پل پل اذیت میں مبتلا رکھتا ہے۔
☆ میں نے باتونی سے خاموشی، غصیلے سے برداشت اور ظالم سے رحم سیکھا ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ میں ان جیسے اساتذہ کا شکر گزار نہیں ہوں۔
☆ سخاوت یہ ہے کہ اپنی استطاعت سے زیادہ دو۔
☆ اچھے لوگوں کی خوشبو ہوا کے مخالف سمت بھی پہنچ جاتی ہے۔
☆ لوگوں کی توقع پوری کرو مگر کسی سے کوئی توقع نہ رکھو۔
☆ اگر مقصد عظیم ہو تو ناکامی بھی اچھی لگتی ہے۔
☆ عادتیں بے شک اپنی مرضی کی ہوتی ہیں مگر آپ خود دوسروں کے لیے ہوتے ہیں۔

مرسلہ: نازش خان۔ صوابی

وائرس

ڈاکٹر نے مریض کی میموری ٹھیک کر دی اور پوچھا۔ ''کچھ یاد آ رہا ہے؟''
مریض نے کہا۔ ''صرف بیوی کا نام۔''
ڈاکٹر ہنس کر بولا۔ ''سب کچھ صاف ہو گیا مگر وائرس رہ گیا ہے۔''

مرسلہ: عندلیب جہاں۔ کوٹری

گاجر کے پتے

آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ گاجر کے نرم و نازک پتوں میں پروٹین، معدنیات، اور کئی وٹامنز چھپے ہیں۔ ان پتوں میں گاجر کے مقابلے میں چھ گنا زیادہ وٹامن C اور پوٹاشیم کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے جس کے سبب آپ کے جسم سے غیر ضروری پانی کا اخراج ہوتا ہے، بلڈ پریشر معتدل رہتا ہے اور خون میں پھٹکیاں بھی نہیں بننے پاتیں۔ لہٰذا مارکیٹ سے ایسی گاجریں خرید کر

لائیں جن میں پتے موجود ہوں اور انہیں گاجروں کے ساتھ پکا کر کھائیں۔

مرسلہ: آمنہ علی۔شاہ فیصل، کراچی

قابلِ غور

☆ اخلاق وہ چیز ہے جس کی قیمت نہیں دینا پڑتی مگر اس سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔

☆ ضرورت سے زیادہ اپنے جسم کو مت سنوارو کیوں کہ اس کو خاک میں مل جانا ہے۔سنوارنا ہے تو اپنی روح کو سنوارو کیوں کہ اس کو رب کے پاس جانا ہے۔

مرسلہ: ریحان عباسی، کراچی

دوستی

دوستی ایک سمندر ہے
ساحلِ وفا کو اپنے سینے میں چھپا کے جانے کے بعد کب سے بہہ رہا ہے۔
دوستی ایک ایسا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر ہے جو کہہ رہا ہے۔
میرا نام 'وفا' میرا کام 'وفا' ہر پیغام 'وفا'

مرسلہ: رُباب علی۔کراچی

دوست

دوست وہ نہیں جو پانی میں خشک ہونے پر مرغابی کی طرح اڑ جائے۔
دوست تو وہ ہے جو کنول کے پھول کی طرح حقِ وفا نبھائے۔تالاب میں ہی مرجائے۔

مرسلہ: الماس بانو۔ٹوبہ ٹیک سنگھ

امید

کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ جہاں غموں کے قافلے رکے رہیں، وہیں ذرا فاصلے پر خوشیاں موجود ہوتی ہیں مگر جنہیں ہماری دکھی آنکھیں شناخت کرنے سے قاصر رہ جاتی ہیں ،جبکہ اکثر جہاں ہماری سوچ کی پرواز تھمتی ہے ،وہیں اندھیرے مٹتے ہیں اور اجالا پھوٹتا ہے اس لیے خوش امید رہنا سیکھیے کہ مایوسی دیمک کی طرح ہوتی ہے جو خوشیوں کو کھوکھلا کر دیتی اور امید وہ خوش کن احساس ہے جب دکھوں کو مات ڈالتا ہے۔

حسنِ خیال: سعدیہ عابد۔کراچی

زندگی

سقراط سے پوچھا گیا۔''موت سے بھی کوئی سخت تر چیز ہے؟
سقراط نے جواب دیا۔زندگی کیوں کہ ہر قسم کے رنج وغم اور مشکلات زندگی ہی میں برداشت کرنا پڑتے ہیں اور موت ان سے نجات دلاتی ہے۔

مرسلہ: ماریہ۔ساہیوال

اف یہ بیویاں

امریکہ میں ہر سال ڈھائی لاکھ مرد بیویوں سے طمانچے کھاتے ہیں اور گھروں میں بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔اس امر کا انکشاف امریکہ کے ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر سوزالے اسٹین نے اپنی تازہ ترین تصنیف ''امریکی سوسائٹی میں خواتین کا کردار'' نامی کتاب میں کیا ہے۔ڈاکٹر کے مطابق امریکہ کے بیشتر گھرانوں کی بیگمات اپنے شوہروں کی خوب پٹائی کرتی ہیں۔

مرسلہ: عمار علی۔کراچی

نمائندگی

امریکہ کی ایک سڑک پر جنازہ جارہا تھا ایک ہندوستانی کو یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ تابوت کے ہمراہ گولف کھیلنے کا سامان رکھا ہوا ہے۔اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس جنازے میں شریک ایک شخص سے دریافت کیا یہ شخص زندگی میں گولف کا بہت اچھا کھلاڑی رہا ہوگا؟ رہا ہوگا. سے آپ کا کیا مطلب ہے؟اس نے جواب دیا

وہ اچھا کھلاڑی ہے تبھی آج کا فائنل کھیلنے کی وجہ سے وہ اپنی بیوی کے جنازے میں شریک نہیں ہوسکا، اس لیے اس کا گولف کا سامان ہمراہ ہے۔

مرسلہ: شہزاد علی۔ مظفرآباد

خوشی اور غم

خوشی اور غم دو متضاد چیزیں ہیں، جو انسان کے اختیار سے باہر ہیں۔ خوشی کا دورانیہ کم اور غم کا دورانیہ زیادہ ہوتا ہے۔ خوشی کا احساس دل میں گہرائی تک اثر کرتا ہے مگر انسان کی روح کو بھی گھائل کر کے رکھ دیتا ہے۔ انسان خوشی کی نسبت غم کے لیے آپ کو کم ہی تیار کرتے ہیں، خوشی عام طور پر بھی زیادہ ہوتے ہوئے بھی کم محسوس ہوتی ہے جبکہ غم کم ہوتے ہوئے بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے غم کے بعد جب اچانک کوئی خوشی آتی ہے تو وہی انسان کو تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے اور انسان کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی زندگی میں یہ غم کبھی آیا نہ ہوا۔ گر دنیا میں صرف خوشی ہوتو انسان کبھی بھی غم کو نہ سمجھ پاتا۔

مرسلہ: شاہانہ سلیم۔ کراچی

کرکٹ شناس

پاکستان اور سری لنکا کی ٹیمیں میدان میں نبرد آزما تھیں۔ پاکستان کے باؤلنگ اٹیک کے سامنے سری لنکن کا ٹھہرنا مشکل ہوگیا تھا۔ سات وکٹین گر چکی تھیں جن میں ایل بی ڈبلیو بھی شامل تھے۔ اس زبردست کارکردگی پر اپنے جذبات کے اظہار کے لیے گلدستہ لے کر کرکٹ کا ایک رسیا میدان میں کود پڑا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس حسنِ کارکردگی پر ایوارڈ کسے دے۔ اس نے ایک نظر تمام فیلڈرز اور بولروں پر ڈالی اور گلدستہ ایک شخص کے ہاتھ میں تھما کر یہ جا وہ جا۔ وہ شخص میچ کا ایمپائر تھا۔

مرسلہ: سنی، کراچی

مس کال

موجودہ دور میں موبائل فون کی افادیت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مس کال کا رواج بھی فروغ پا رہا ہے۔ کیا ہم لوگ اخلاقی طور پر اتنے دیوالیہ ہوگئے ہیں کہ کسی دوست یا رشتے دار کی خیریت معلوم کرنے کے لیے چند روپے بھی نہیں خرچ کر سکتے؟ ہمیں چاہیے کہ مس کال سے گریز کریں اور اس طرح ایک اچھی عادت کی بنیاد ڈالیں۔

مرسلہ: حرمین علی۔ ژوب

سیخ کباب

ایک صاحب میں دھاگے میں لپٹے سیخ کباب کبھی نہیں کھائے تھے۔ ایک دفعہ ان کی بیگم نے انہیں دھاگے میں لپٹے سیخ کباب کھلائے۔ کباب منہ میں رکھتے ہی اس پر لپٹا ہوا دھاگہ لمبا ہونے کی وجہ سے کھنچتا چلا گیا۔ وہ صاحب گھبرا کر بولے۔

''بیگم......! بیگم جلدی آؤ دیکھو میں ادھڑتا ہی چلا جا رہا ہوں۔''

مرسلہ: عظمیٰ سلیمان۔ کراچی

مرے ناخدا

مانا کہ
ساحل کی ریت سے
بن نہیں سکتا آشیاں اپنا
لیکن اتنا دور مت جاؤ
مرے ناخدا!
لوٹ آؤ
کہ
کاغذ کی کشتی بھی
پانی پر زیادہ نہیں چلتی

شاعر: علی رضا عمرانی

نئے لہجے، نئی آوازیں

اس دل کو

تیرے ملنے کی حسین آس تھی اس دل کو
سارے ہی موسم سہانے لگے تھے اس دل کو
وہ تو کوئی اور ہی ہوتے ہیں جو مل جاتے ہیں
تجھے نہ پا کر تیرے احساس کی چاہ تھی اس دل کو
میرا بچپن ، میری سکھیاں وہ پہلی محبت
کبھی بھی وہ حسین لمحے بھولتے نہیں اس دل کو
جاتے وقت وہ چین وقرار سب ہی کچھ تو لے گیا
بس ! لے جانا بھول گیا میرے اس دل کو
سپنے ٹوٹ گئے ، آس بھی باقی نہ رہی
یوں بجھا ٹھیس لگی اس دل کو

شاعرہ: سعدیہ عابد۔ کراچی

غزل

مری خاطر زمانے کو بُھلا دے گی
دوا نہ پیار میں تجھ کو بنا دے گی
کسی نے حال جو ہنس کر برا پوچھا
وہ ہر اِک راز تک دل کا بتادے گی
مری خاطر زمانے سے اُلجھتی ہے
زمانے کو مرا دشمن بنا دے گی
ذرا لہجہ بدل کر بات کر دیکھو
وہ گر رونے لگے دریا بہا دے گی
وہ میرے ساتھ ہے گر میں بھٹک جاؤں
شمع بن کر مجھے رستہ دکھا دے گی
وہ اب کے جب مجھے ملنے کو آئے گی
تو ساری دُوریاں پل میں مٹا دے گی
کہ اب اِک رات بھی کٹتی نہیں مجھ سے
تری دوری مجھے پاگل بنادے گی
ہمیں معلوم ہے جھوٹے کو گر بولیں
وہ اپنی جان تک ہم پر لٹا دے گی
ترے تاریک جیون کو مرے عادل
وہ اپنے پیار سے جنت بنادے گی

عادل حسین۔ کراچی

غزل

غم نہیں ہے پھر کوئی بھی غم رہے
تو اگرچہ ، ہمنوا ہر دم رہے
خاک ہوجائے ہر ارمانِ عدو
سر بلند تاحشر یہ پرچم رہے
کچھ خیال آبروئے بے خودی
اے مرے دل ، اے مرے محرم رہے
یاد سے غافل رہوں نہ صبح و شام
عمر بھر بس ایک ہی عالم رہے
آدمی ہو آدمی بن کر جیو
کچھ خیال حضرتِ آدم رہے
آپ کیا جانیں گے نیّر کا جنون
آپ تو دیوانگی میں کم رہے

نیّر رضاوی۔ لیاقت آباد۔ کراچی

یقین

دیوں کو قید کرنے سے
سحر قیدی نہیں بنتی
کہ دریا نہ بھی چاہیں
تب بھی اپنے رُخ پہ بہتے ہیں
بہاریں روٹھ بھی جائیں
تو آخر لوٹ آتی ہیں
میرے ساتھی، میرے ہمدم
تمہیں بھی لوٹ آنا ہے

شاعرہ: حمیرا خان۔ شاہ کوٹ

غزل

میرے وطن کو سلامت میرے خدا رکھنا
اس سرزمین پر امن و سکوں بنا رکھنا
عجیب طرز کے حاکم یہاں مسلط ہیں
عجیب طرز کی رعایا سے کیا گلہ رکھنا
ہم اپنی راہ سے بھٹکے ہوئے مسافر ہیں
ہمارے واسطے ہدایت کا در کھلا رکھنا
ظلم وجود، یہ دہشت گری جو پھیلی ہے
کیا اس میں جشن منانے کا حوصلہ رکھنا
شکر خدا، اس نعمت وطن پر گل
میرے خدا تو قائم اسے سدا رکھنا

سباس گل۔ رحیم یار خان

قطعات

جو قریہ بموں سے چھلنی ہے
کیسے میں اُسے آباد کروں؟
ہاں عید کا چاند تو دیکھا ہے
بس منہ سے مبارک باد کہوں؟

راؤ تہذیب حسین تہذیب۔ رحیم یار خان

آزاد شاعری

اے پانی، پانی، پانی
روک اپنی روانی
اپنی مدھوشی میں تو نے
کتنی تباہی مچائی ہے
ابر کرم جا چلا جا
تھر کو سیراب کر دے
میں نے مانگا تھا تجھ کو
تھر کے لیے

جیجل میتلو۔ کراچی

چوری

کیسی محبت!
کون سی محبت کی بات کرتے ہو
یہاں تو ہر سو
محبت کے سوداگر بستے ہیں

خون دینے والے مجنوں
کب کے مر کھپ گئے
اب تو چوری کھانے والے
مجنوں بستے ہیں

شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

اعتراف

زندگی کے ستم
اس قدر ہیں کہ ہم
تجھ کو اے جانِ جاں
پہلے کی طرح نہیں سوچتے
کوئی آواز ہو، کیسا بھی ساز ہو
تیرا لہجہ کسی میں نہیں ڈھونڈتے
پھر بھی یہ نہ سمجھ
تجھ کو بھولے ہیں ہم
تو ہمیں یاد ہے، دل میں آباد ہے
بس زندگی کے ستم
اس قدر ہیں کہ ہم
تجھ کو اے جانِ جاں
پہلے کی طرح نہیں سوچتے

راحت وفا راجپوت

حادثہ

شام کا دیا دُھند لا رہا ہے
عمر کا سورج، ڈھل رہا ہے
ضمیر تو عرصہ ہوا مر چکا
لاشہ اٹھائے جسم چل رہا ہے

عنبرین نعیم۔ کراچی

بادل

نگاہوں کا بادل
جب برستا ہے
موسم غم میں
اشکوں کا سیلاب
میرے دل کی بستی
ڈبو جاتا ہے!!

معاویہ عنبر وٹو۔ ہڑپہ

سوال آپ کے......
جواب زین العابدین کے!!

اِس ماہ شبانہ جسکانی۔ میر پور خاص کا سوال انعام کا حق دار ٹھہرا۔ انہیں اعزازی طور پر دوشیزہ گفٹ ہیمپر روانہ کیا جارہا ہے (ادارہ)

شیخ محمد شاہین۔ ریڑھی گوٹھ

☺: روز محشر کیا سوالات کے دوران خواتین سے اُن کی عمر بھی پوچھی جائے گی؟

✍: پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ چہرہ میک اپ سے عاری جو ہوگا۔

شمع ارشد۔ چیچہ وطنی۔

☺: زین بھائی! وفا کا جذبہ مرد میں زیادہ ہوتا ہے یا عورت میں؟

✍: بھئی' وفا کا جذبہ تو صرف مرد میں ہی زیادہ ہوتا ہے کیونکہ بیوی کے مرنے کے بعد مرد اسے پورے احترام کے ساتھ دفن کرتا ہے۔

روحی خاکوانی۔ ملتان۔

☺: آپ لڑکیوں سے اتنے الرجک کیوں ہیں؟

✍: آپ نے غلط سنا ہے' کراچی اور ملتان کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔

شرف الدین پیرزادہ۔ ملکاں وال۔

☺: زین! اگر بے وقوف دنیا میں نہ ہوتے تو عقل مند کیا کھاتے؟

✍: وہ بے چارے بے وقوفوں کے نہ ہونے کا غم کھاتے۔

ناہید علی .... شہداد پور

⚘ اگر کوئی خواب میں EDHI کی ایمبولینس دیکھے تو کیا ہوگا؟

☆ سب اچھا ہی اچھا ہونے والا ہے۔

بشریٰ علی .... کوٹ ڈیجی خان

⚘ زین بھائی! D2 کا کیا ہوا؟

☆ جو D-1 کا ہوا تھا۔ مگر اِس بار مُنی نہیں ہے اور دیگر مسالے بھی دم دار نہیں لگے۔

نازو شاہ .... مچھ بلوچستان

⚘ بھیا جی! ناول کیا ہوتا ہے؟

☆ وہ تحریر جس میں کہانی گھر گھر کی چل رہی ہو۔ سمجھ لیں سپر ہٹ ناول ہے۔

☺: زمین کے چاند اور آسمان کے چاند میں کیا فرق ہے؟

✍: آسمان کے چاند میں روشنی اور ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے جبکہ زمین کے چاند کو دیکھنے کے بعد عمر بھر کی کمائی لٹ جاتی ہے۔

جاوید اقبال میمن۔ بھان سعید آباد

☺: سفید گھوڑے کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟

عبدالرحمٰن غوری۔ اوکاڑہ

☺: اسکول اور کالج کی زندگی میں کیا فرق ہے؟

✍: وہی جو میکے اور سسرال کی زندگی میں ہے۔

حسرت جالندھری۔ جڑانوالہ

☺: انسان احمق ہونے کی وجہ سے غریب ہوتا ہے یا پھر غریب ہونے کی وجہ سے احمق؟

✍: اس کا جواب آپ سے بہتر اور کون دے سکتا ہے۔

✍: اُنہیں سمجھانا آسان ہے جو آنکھیں رکھتے ہیں۔

صائمہ خالد۔ کوئٹہ

☺: شعر کا جواب شعر سے دیں؟

بہت نزدیک آتے جا رہے ہو
بچھڑنے کا ارادہ کرلیا کیا؟

✍: مجھے الو بنانے کی، مری جاں مت کرو کوشش
تمہارے گھر میں آنے کا ارادہ ہم نہیں رکھتے

عامر نوید۔ بورے والا

☺: انسان مشکل وقت میں گدھے کو بھی باپ بنا لیتا ہے لیکن مشکل وقت میں ماں کس کو بنا تا ہے؟

✍: ''ساس'' کو...... مماثلت کی وجہ سے۔

محمد آصف رزاق۔ کراچی

☺: کسی کے دل میں اپنے لیے جگہ بنانا آسان

ہے یا ریلوے ٹرین میں؟

✍: جیب بھاری ہو تو دل میں۔

اللہ یار خان۔ لندن

☺: پاکستانی خواتین کے برقعے کون چرا کر لے گیا؟

✍: چوری اور سینہ زوری اسی کو کہتے ہیں۔

مسرور۔ بدین

☺: خدا روٹھ جائے تو سجدے کروں، صنم روٹھ جائے تو؟

✍: اللہ اللہ کریں......

محمد دانش خٹک۔ پشاور

☺: وہ کہتی ہے تم اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہو، اس سے کیا کہوں؟

✍: بات مان لیں، اب کہنے کو آپ کے پاس رکھا ہی کیا ہے۔

ناصرہ آپا۔ وہاڑی

☺: بیٹا زین! ذرا جلدی سے بتاؤ دولہے اور چولہے میں کیا فرق ہے؟

✍: دولہے اور چولہے، دونوں ہی عورت کا مقدر ہیں، اگر دولہا کا مزاج بگڑنے لگے تو پھر چولہا پھٹنے کے واقعات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

عائشہ جعفری۔ درابن کلاں

☺: زین بھائی! انسان جان بوجھ کر مصیبت کب مول لیتا ہے؟

✍: جب اسے شادی کا شوق چرائے۔

شبانہ جسکانی۔ میرپور خاص

☺: زین بھائی! ہمارے گھر میں مہمانوں کا سایہ ہے۔ کیسے بھگائیں، تنگ آ چکے ہیں؟

✍: اپنے گیٹ کے باہر تالا ڈال دیں اور پیشانی پر لکھ دیں ''برائے فروخت''۔

اعجاز بخش۔ راولپنڈی

☺: زین جی! لڑکیوں کو ایئر ہوسٹس کا پیشہ خطرناک کیوں نہیں لگتا؟

✍: کیونکہ تمام انسانوں (مسافروں) کو روانگی سے پہلے ہی بیلٹوں سے باندھ دیا جاتا ہے اور لڑکیوں کو تو ہوا میں اُڑنے کا ویسے بھی بہت شوق ہوتا ہے۔

اروی معطر۔ گجرات

☺: پیارے زین بھائی! بیوی شوہر کی باتوں کو دھیان سے کب سنتی ہے؟

✍: جب وہ کسی اور 'عورت' سے بات کر رہا ہو۔ یا اُس وقت جب مہینے کی پہلی تاریخ قریب ہو۔

☆☆......☆☆

'یہ ملاقات' کے لیے میرا سوال یہ ہے...

کوپن برائے
دسمبر 2014ء

____

____

نام: ____________________

پتا: ____________________

ذہن چکرا کے رہ گیا۔ میرا قلم تو وہ کر رہا تھا۔ جو یونانیوں کے چوبی گھوڑے نے ہیلن کے پرستاروں کے ساتھ کیا تھا۔ میں جو بات لکھنا چاہتا، وہ فوراً اُسے گڑ بڑ کر دیتا۔ اُلٹی بات لکھتا۔ مقبول مصنف کی حیثیت سے لگتا ہے میری موت قریب تھی۔ اس پر یاد آیا کہ مجھے.....

مزاح کے اِس شہ پارے میں حساسیت کی چاپ بھی سنائی دے گی

میرے قلم نے مجھ سے بغاوت کردی ہے اور لفظ میری مرضی کے خلاف آوازیں اُٹھانے لگے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں، مجھے کچھ پتا نہیں، یہ کیسے ہوا۔ جو کچھ ہوا، اچانک ہوا اور اِس کا انکشاف اُس وقت ہوا، جب میں نے حسبِ معمول اپنی اشتہار کمپنی کے لیے ایک اشتہار کا مضمون لکھنا چاہا۔ اشتہار ایک مشہور و معروف ہیئر شیمپو کے بارے میں تھا۔ کمپنی کی ہدایت کے مطابق میں نے لکھا۔

''گڑ بڑ گھٹالا شیمپو آپ کے بالوں کی چمک اور آپ کے حُسن کی دمک کو دوبالا کرتا ہے۔ فوراً اپنے قریبی جنرل اسٹور سے طلب کیجیے۔''

جب میں نے اپنا مضمون مکمل کر کے کاغذ پر نظر دوڑائی تو پتا چلا کہ وہاں کچھ اور لکھا ہوا ہے۔

''گڑ بڑ گھٹالا شیمپو...... آپ کے بالوں کی چمک اور آپ کے حُسن کی دمک کا پکا دشمن ہے۔ اِسے ہرگز نہ خریدیں اور ہر اُس جنرل اسٹور کا، جو اِسے فروخت کرنے کی کوشش کرے، بائیکاٹ کریں۔''

میں نے کہا، ہائیں یہ کیا ہوا؟ میرے قلم کی خیر، وہ ایسی غلط باتیں کب سے لکھنے لگا ہے۔ میں نے قلم کو اُلٹ پلٹ کے دیکھا، اندر باہر ہر طرف سے خوب اچھی طرح اُس کا معائنہ کیا اور اُس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں پائی۔ یہ تو وہی پرانا قلم تھا۔ جس سے میں عرصے سے دنیا بھر کے عالمانہ مضامین، علامتی افسانے، اخباری بیانات اور تاریخی ناول لکھتا چلا آیا تھا۔ میں نے سوچا شاید کسی وقتی آسیبی اثر کے تحت میرے قلم نے گڑ بڑ کی تھی، لہٰذا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے دوبارہ قلم اٹھایا اور اپنے اخباری کالم ''آنکھ اور کان'' کا پہلا پیراگراف لکھنا شروع کیا۔ ''ہماری حکومت کو اِس بات کی داد ملنی چاہیے کہ اُس نے معاشرے کو خود غرض افراد سے پاک کرنے کے لیے شفاف تحریک چلا رکھی ہے، جس سے معاشرے میں اخلاص کو عام کرنے میں مدد ملے گی اور عوام کا بھلا ہوگا۔''

جملہ ختم ہوتے ہی جب میں نے اُسے پڑھا تو وہ یوں نکلا۔

''ہماری حکومت کا اِس بات کے لیے محاسبہ ہونا چاہیے کہ اُس نے خود غرض افراد کی ہمت افزائی کی مہم

چلا رکھی ہے۔ جس سے معاشرے میں ذہنی افلاس بڑھے گا اور عوام ......''

میرے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں نے فوراً اپنی بیوی کو اس ناگہانی آفت سے آگاہ کیا۔ اُس نے کہا، ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ اتنے سال ہوگئے مجھے آپ کے ساتھ رہتے ہوئے، آپ تو بڑے باشعور اور سمجھ دار انسان ہیں۔ اُلٹی سیدھی باتیں بھلا آپ کیوں کر لکھ سکتے ہیں۔ ضرور آپ کی طبیعت خراب ہے، فوراً ڈاکٹر ''زر پسند'' سے اپنا معائنہ کرائیے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کے ذہن پر کوئی بوجھ ہے۔'' اِس کے بعد اُس نے کہا کہ ڈاکٹر کے یہاں جانے سے پہلے ذرا گڈو کے ہیڈ ماسٹر کے نام ایک رقعہ لکھ دیجیے کہ طبیعت خراب ہونے کے سبب وہ کل اسکول نہیں جاسکا تھا، لہٰذا ایک دن کی چھٹی منظور کی جائے اور اُس سے کوئی باز پرس نہ کی جائے۔'' میں نے فوراً اِس مضمون کا رقعہ لکھا اور لڑکے کے حوالے کیا۔ لڑکے نے رقعہ لیا اور اپنی دادی کو جا دکھایا۔ بس قیامت ہوگئی۔ وہ ڈانٹتی ڈپٹتی میرے پاس آئیں اور بولیں۔ ''تعجب ہے، باپ ہو کے بچے کی شکایت کرتے ہو، ایک دن اگر وہ ہوم ورک نہ کرنے کی وجہ سے اسکول نہیں گیا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہیڈ ماسٹر کو نہ صرف اِس کی رپورٹ کی جائے، بلکہ بچے کو سخت سے سخت سزا دینے کی ترغیب دی جائے۔ کچھ تو شرم کرو۔''

میں سچ مچ شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ سب خطا میرے باغی قلم کی تھی۔ نجانے اُسے کیا ہوگیا تھا۔ نجانے مجھے کیا ہوگیا تھا۔ اچھی خاصی مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ لفظوں نے پہلے تو مجھ سے ایسی بے وفائی نہ کی تھی۔ میں جو چاہتا تھا، لکھتا تھا۔ لوگ بھی وہی پڑھتے، جو میں لکھتا تھا۔ کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوتا تھا۔ میں نے سوچا، کیا حرج ہے، اگر اپنی بعض پرانی تحریروں کو ایک بار پھر سے لکھا جائے۔ پُرانی شراب نئی بوتلوں میں بھی بڑی دلکش ہوتی ہے...... پھر میں نے اپنا مشہور افسانہ 'اُلٹے آسمان کا شامیانہ'' نکالا اور اور اُسے نقل کرنا شروع کیا۔ اُس کا ابتدائیہ یوں تھا۔

''شہر میں سورج اپنے ہاتھوں میں آتش فشاں اُٹھائے، ننگے پاؤں گھوم رہا تھا، اور درخت مکانوں کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے شرم سے زمین میں گڑ گئے تھے۔ گھروں میں صرف چھپکلیاں تھیں۔''

میرے قلم نے لکھا۔'' سورج تیزی سے چمک رہا تھا، درختوں پر سکوت تھا اور شہر کے لوگ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔''

مجھے یہ ابتدا بالکل پسند نہیں آئی۔ سپاٹ، بے جان، فرسودہ، اچھا خاصا افسانہ بگڑ گیا تھا اور اِس میں دماغ لڑانے کے لیے کوئی بات باقی نہ رہ گئی تھی۔ اپنے بہترین افسانے کی مزید بے عزتی برداشت کرنا میرے بس میں نہیں تھا، لہٰذا میں نے یہ سلسلہ یہیں روک دیا۔ میں نے سوچا' اگر میرے قلم کو سلیس اُردو اور سیدھے راستہ بیان کا ایسا ہی شوق ہوگیا ہے تو کیوں نہ وہ رومانی خطوط اِسے دوبارہ لکھنے کو دیے جائیں، جن میں پہلے ہی بڑی عام فہم زبان استعمال کی گئی ہے۔ میں نے فوراً لائبریری سے ''زہرہ کی ڈائری'' نامی اپنے رومانوی کہانیوں کے مجموعے میں سے ایک جذبات انگیز خط نکالا اور اُسے نقل کرنا شروع کیا۔

''میری زہرہ!

اِس ہفتے کا چوبیسواں محبت نامہ قبول کرو! جی چاہتا ہے ہر وقت تمہیں خط لکھتا رہوں، مگر کیا کروں قاصد پر تمہیں خط پہنچانے کا زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا، لہٰذا روزانہ صبح، دوپہر اور شام تین خط بھیجنے کی پابندی پر قائم ہوں، اللہ شفا دے گا۔ دوسری بات یہ کہ تم نے اب تک مجھے اپنے فیصلے سے مطلع نہیں کیا کہ کب'' کیفے وصل'' میں ملنے کے لیے آنے کا وعدہ پورا کروگی۔ پچھلی جمعرات کو بھی میں وہاں کئی گھنٹے بیٹھا تمہارا انتظار کرتا رہا، مگر تم نہیں آئیں، حالانکہ یہ کیفے اہلِ دل کی میزبانی کے فرائض بڑی خوبی سے ادا کرنے کے لیے مشہور ہے اور کوئی ایسا ویسا واقعہ یہاں اب تک رونما نہیں ہوا۔

جواب کا منتظر

صرف تمہارا......

میں نے خط کو بڑی توجہ سے نقل کر کے جب دوبارہ پڑھنا شروع کیا تو اُس کی یہ شکل ہو گئی تھی۔

میری زہرہ!

جی چاہتا ہے کہ ہر وقت تمہیں خط ہی لکھتا رہوں، اس لیے کہ اور کوئی کام نہیں ہے۔ مگر قاصد پر اعتبار بھی نہیں۔ تعجب ہے تم اب تک روزانہ تین خطوں سے بھی عاجز نہیں آئیں، بڑی ڈھیٹ ہو۔ تم آخر میری بات کیوں نہیں سُنتیں۔ ''کیفے وصل'' میں ملنے کیوں نہیں آتیں، کیا میں تمہیں کھا جاؤں گا۔ اگر تم یہ کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں تو مجھے تم سے کون سی محبت ہے۔ یہ تو بس وقت گزاری کا مشغلہ ہے۔ پچھلی جمعرات بھی میں وہاں بہت دیر بیٹھا رہا، مگر تم نہیں آئیں، شرم کرو...... ''کیفے وصل'' تو ''اہل دل'' کی بڑی مدد کرتا ہے۔ پولیس چھاپہ مارتی ہے تو پہلے سے اپنے مہمانوں کو ہوشیار کر دیتا ہے۔ ویسے اگر محبت کی راہ میں پکڑے بھی جائیں تو کیا۔ بدنامی میں بھی اپنا ایک مزہ ہے۔

جواب کا منتظر

تمہارا ابھی......

ذہن چکرا کے رہ گیا۔ میرا قلم تو وہ کر رہا تھا۔ جو یونانیوں کے چوبی گھوڑے نے ہیلن کے پرستاروں کے ساتھ کیا تھا۔ میں جو بات لکھنا چاہتا، وہ فوراً اُسے گڑ بڑ کر دیتا۔ اُلٹی بات لکھتا۔ مقبول مصنف کی حیثیت سے لگتا ہے میری موت قریب تھی۔ اس پر یاد آیا کہ مجھے ایک مشہور و معروف نیوز ریڈر کے انتقال پُر ملال پر اُن کی یاد میں ایک تعزیتی بیان جاری کرنا تھا۔ میں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار اِن الفاظ میں کیا۔

''مرحوم ایک مکمل فنکار تھے۔ وہ ہر خبر اتنے یقین سے پڑھتے، گویا وہ واقعہ اُن کے سامنے ہوا ہے اور سننے والے اُن کے دلکش اندازِ بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ افسوس! اُن کے بعد خبر سننے کا مزہ نہیں رہا۔'' بیان مکمل ہونے کے بعد جب میں نے اپنی تحریر پڑھی تو آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ کچھ یوں تھی۔

''مرحوم بہت ہی فنکار تھے۔ وہ ہر خبر اتنے اعتماد کے ساتھ پڑھتے تھے، جیسے وہ واقعہ خود اُن کی آنکھوں کے سامنے پیش آیا ہو۔ سننے والے اُن کے دلکش اندازِ بیاں سے متاثر ہو کے افواہوں پر بھی ایمان لے آتے۔ افسوس! اُن کے بعد اب کون خبروں کا یقین کرے گا۔''

میرے ساتھ قلم کے نازیبا سلوک نے مجھے مجبور کر دیا کہ مشورے کے لیے ڈاکٹر ''زر پسند'' کے پاس جاؤں۔ وہ ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں اور روپے پیسے کے لالچ کے بغیر نہایت زود اثر اور تیر بہدف نسخے لکھتے ہیں۔ انہوں نے ساری کیفیت پوچھی، تفصیلی طبی معائنہ کیا اور کئی ٹیسٹ تجویز کیے۔ کئی روز تک اُن کے مطب کے چکر لگانے کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ مجھے ایک ایسا مرض ہو گیا ہے، جس کے بارے میں صرف پرانی کتابوں میں اشارے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ مرض نے ابھی صرف میری انگلیوں پر قبضہ جمایا ہے، آگے نہیں بڑھا، لیکن رفتہ رفتہ وہ کیفیت، وہ سنسنی، وہ پُراسراری چاپ مجھے اپنے بدن کے ہر گوشے میں سنائی دے گی اور جس دن اِس کا اثر میرے ذہن تک پہنچا تو وہی باتیں جو میرا قلم لکھتا ہے۔ میرے منہ سے بہنے اور آنکھوں سے ٹپکنے لگیں گی۔ اندھیری سڑکیں، اندھیری نظر آئیں گی اور درختوں کے پیلے پتے پیلے ہی نظر آئیں گے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے، یہ مرض لاعلاج ہے اور مجھے اِس کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اُن کا کہنا ہے کہ کچھ دن بعد میں ٹی بی کے مریضوں کی طرح اپنے مرض کو تھوکنے لگوں گا، دیواروں پر، فرش پر، گزرتے لوگوں پر...... مجھے پتا نہیں، کتنے اور لوگ ہیں جو اِس مرض میں مبتلا ہیں۔ کاش! ایسا بھی کوئی سینی ٹوریم ہوتا، جہاں مجھ جیسے بیماروں کو رکھا جاتا، جو سچ تھوکتے ہیں۔

☆☆......☆☆

ہمایوں سعید ملک ریاض بن گئے

لولی وڈ کے معروف اداکار ہمایوں سعید معروف بزنس مین ملک ریاض بن گئے۔ تفصیلات کے مطابق پاکستان کے معروف بزنس ٹائیکون ملک ریاض حسین کی جدوجہد زندگی پر 'ملک' کے نام سے فلم بنائی جارہی ہے جس میں ہمایوں سعید ملک ریاض حسین کا کردار ادا کررہے ہیں۔ اس فلم کے تین منٹ کے ٹریلر میں ہمایوں سعید کی پرفارمنس کو پسند کیا جارہا ہے۔ اس فلم میں ماڈل و اداکارہ عروہ حسین ان کی بیوی کا کردار ادا کررہی ہیں جن کی عیدالاضحیٰ پر 'نامعلوم افراد' ریلیز ہوئی ہے۔ ہمایوں سعید کا کہنا ہے کہ یہ کردار میرے لیے ایک چیلنج تھا کیونکہ اس میں مجھے ایک ایسی شخصیت کے کردار کو نبھانا تھا جو بزنس ٹائیکون ہونے کے ساتھ فلاحی کاموں کے حوالے سے بھی شہرت رکھتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ کردار میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ملک ریاض کے مختلف وڈیوز دیکھیں تا کہ اس کردار کے ساتھ انصاف کرسکوں۔

وینا ملک کا بیٹا مقبولیت میں سب سے آگے

وینا ملک کے بیٹے ابرام خان نے دنیا میں آتے ہی کامیابیاں سمیٹنا شروع کردی ہیں۔ انہوں نے مقبولیت میں بولی وڈ اداکار شلپا شیٹھی کے دو سالہ بیٹے کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ وینا ملک کے بیٹے ابرام خان خٹک کے چاہنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ان کی بڑھتی مقبولیت کا ثبوت ہے ان کا ٹوئٹر اکاؤنٹ، جس میں ابرام کے مداحوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے **27** ہزار تک جا پہنچی ہے جبکہ ٹوئٹر پر بولی وڈ اداکارہ شلپا شیٹھی کے دو سالہ بیٹے دیان راج کندرا کے فالوورز کی تعداد ہے تقریباً **13** ہزار۔ یوں وینا ملک کے بعد ان کے بیٹے ابرام نے بھی سوشل میڈیا پر قبضہ جمالیا ہے۔

میرا، نور تصادم کا خطرہ

میرا کی جانب سے منفی پراپیگنڈہ کرنے کے بعد اداکارہ نور کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور نور نے میرا سے لڑائی لینے کا بھی سوچ لیا۔ اداکارہ میرا کی جانب سے

مختلف پروگراموں میں اس حوالے سے اداکارہ نور نے کہا ہے کہ اداکارہ میرا کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے اور اب ان کو علاج کی ضرورت ہے۔ وہ مختلف مقامات پر شوبز کے ایونٹس کے دوران میرے خلاف منفی پراپیگنڈہ کرتی رہتی ہیں حالانکہ میں واحد اداکارہ ہوں جو ان کے لیے مثبت سوچ رکھتی تھی۔

حمیرا اجل کی جدوجہد پر سلمیٰ ہائیک کی فلم

ہولی وڈ میگا اسٹار سلمیٰ ہائیک کی دنیا دیوانی ہے لیکن خود اس گلوبل سیلبرٹی کو جس شخصیت نے متاثر کیا وہ کوئی

مشہور زمانہ چمکتی دمکتی اسٹار نہیں بلکہ کراچی کی ایک عام سی لڑکی ہے، جس نے تعلیم عام کرنے کے خواب کو سخت جدوجہد کے بعد ممکن بنا ڈالا۔ حمیرا اجل نے زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم کراچی کی کچی آبادی میں بچوں خصوصاً لڑکیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی ٹھانی اور ہر مشکل کا دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے ڈریم ماڈل اسٹریٹ اسکول قائم کیا۔ سلمیٰ ہائیک نے حمیرا کی جدوجہد کو دستاویزی فلم 'حمیرا دی گیم چینجر' کے روپ میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ سلمیٰ ہائیک کا کہنا ہے کہ ان کا مشن ہے کہ دنیا بھر کی عورتوں کو انصاف ملے۔
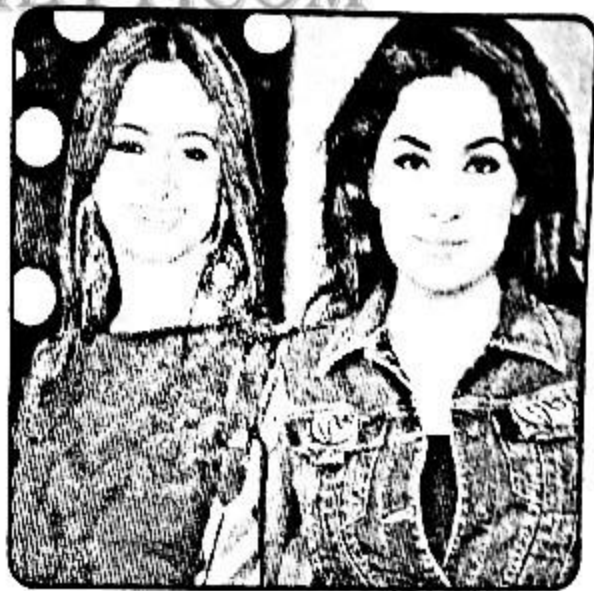
رندھیر کپور اور ریکھا 16 سال بعد

سپرنانی میں ماضی کی مقبول جوڑی رندھیر کپور اور ریکھا 16 سال بعد ایک بار پھر ایک ساتھ نظر آئے گی۔ رندھیر کپور کا کہنا تھا کہ ریکھا میری بہت اچھی دوست

ہے اور ہم دونوں ایک ساتھ 20 فلموں میں کام کر چکے ہیں اور ایک بار پھر 16 سال بعد ایک ساتھ فلم میں کام کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ریکھا میری پسندیدہ اداکاراؤں میں سے ایک ہیں بے شک لوگوں کی نظر میں وہ ایک موڈی خاتون سہی لیکن میرے ساتھ ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہیں۔ واضح رہے کہ ہدایت کار اندرا کمار کی فلم 'سپر نانی' میں رندھیر کپور اور ریکھا نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

عامر خان تمام اسٹارز سے بازی لے گئے

مسٹر پرفیکٹ مہنگی ترین گاڑی کے معاملے میں بولی وڈ کے تمام ستاروں سے بازی لے گئے۔ وزیراعظم من موہن سنگھ اور بزنس مین مکیش امبانی کے بعد عامر خان نے بھی دس کروڑ مالیت کی بم پروف کار خرید لی۔ بولی وڈ اداکار عامر خان بھی مہنگی گاڑیوں کے شوقین نکلے۔ عامر

خان ان دنوں فلم کی شوٹنگ کر رہے ہیں جس میں لوک سبھا میں ہونے والی بدعنوانیاں عوام کے سامنے لائی جائیں گی۔ عامر کے گاڑی خریدنے کی ایک وجہ انہیں ملنے والی دھمکیاں بھی بتائی جارہی ہیں کیونکہ وہ اپنی سکیورٹی کو لے کر کوئی چانس نہیں لینا چاہتے۔

لارا دتہ 'شامیانہ' میں

بولی وڈ اداکارہ لارا دتہ فلم 'شامیانہ' کے ساتھ فلمی دنیا میں کم بیک کریں گی۔ ان کے شوہر مہیش بھوپاتی اس

فلم کے معاون پروڈیوسر ہیں جبکہ لارا دتہ اس فلم میں کیفے مالکہ کا کردار ادا کریں گی۔ جو کہ بشن کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ لارا دتہ بچے کی پیدائش کے بعد فلمی پردے سے غائب رہی ہیں۔

شروتی ہاسن بھوپال میں

بولی وڈ اداکارہ شروتی ہاسن فلم 'پارا' کی شوٹنگ کے لیے بھوپال پہنچ گئیں۔ فلم 'پارا' فرانسیسی فلم لس لائینو نائسن کا ری میک ہے۔ فلم کی دیگر کاسٹ میں عرفان خان

، ویدیوت جاموال اور امیت سادھ شامل ہیں یہ فلم آئندہ سال سنیما گھروں کی زینت بنے گی۔

پرینیتی کو 'سچے پیار' کا انتظار

بولی وڈ اداکارہ پرینیتی چوپڑا کا کہنا ہے کہ میں ان اداکاراؤں میں سے نہیں ہوں جو کہتی ہیں کہ ہمارے پاس پیار کے لیے وقت نہیں ہے۔ سچے پیار کا انتظار ہے۔ جب بھی ملا تو اسے اپنا لوں گی۔ مجھے شروع سے ہی

سال گرہ منانا بہت پسند ہے اور میں اپنی سالگرہ سے پہلے دنوں اور ہفتوں کا حساب رکھتی ہوں اور اگر فیملی اور قریبی دوستوں میں سے کوئی میری سال گرہ بھول جاتا ہے تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔

تیزاب اور پہلی نیوایئر کی مووی

دپیکا پڈوکون نے کہا ہے کہ ان کا مادھوری کے ساتھ موازنہ نہ کیا جائے۔ مادھوری ایک بہت عظیم اداکارہ

ہے۔ دپیکا اپنی نئی فلم ’ہیپی نیو ایئر‘ میں فلم تیزاب میں مادھوری کا موہنی والا کردار ادا کر رہی ہیں۔ دپیکا نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا ہے کہ فرح خان نے سات سال بعد انہیں اپنی فلم میں پھر موقع دیا ہے وہ اس فلم میں اپنی پرفارمنس سے کافی مطمئن ہیں اور اُمید کرتی ہیں کہ شائقین کو بھی فلم پسند آئے گی۔

بڑھاپے میں ہدایت کاری کروں گی

بولی وڈ اداکارہ ہما قریشی نے کہا ہے کہ میں انجلینا جولی کے نقش قدم پر چلنے کی خواہاں ہوں۔ میں ابھی بھی فلم کی

ہدایت کاری کر سکتی ہوں تاہم جب میں 55 سال سے زائد کی عمر کو پہنچوں گی تو اس وقت فلم کی ہدایت کاری کروں گی۔

شردھا کپور کا آئٹم نمبر

بولی وڈ فلم ’اُنگلی‘ میں عمران ہاشمی، کنگنا رناوت، رندآپ ہوڈا اور سنجے دت اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

شردھا کپور اپنے کیریئر میں پہلی بار آئٹم نمبر کرنے والی ہیں۔ شردھا اس آئٹم نمبر کے متعلق بہت پر جوش نظر آ رہی ہیں۔ کرن

جوہر کی فلم ’اُنگلی‘ میں شردھا کا یہ آئٹم نمبر شامل کیا جانے والا ہے۔ اس فلم کی ہدایت رینسل ڈی سلوا دے رہے ہیں۔

سونم کپور کے ساتھ سلو بھائی پریشان

سورج برجاتیا کی فلم ’پریم رتن دھن پاؤ‘ میں سلمان خان اور سونم کپور کی جوڑی ہے لیکن رومانٹک سین کرتے ہوئے سلمان پُرسکون نہیں رہ پاتے۔ واضح رہے کہ سونم کے ساتھ رومانوی سین کرنے سے قبل سلمان خود سے آدھی عمر کی کئی اداکاراؤں مثلاً سوناکشی سنہا، ڈیزی شاہ اور جیکولین فرنانڈیز کے ساتھ بڑے آرام سے کام کر چکے

ہیں۔ لیکن سونم کے ساتھ ان کی پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ سونم کے والد انیل کپور اور سلمان خان گہرے دوست ہیں۔

☆☆..........☆☆

نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل

مختار بانو طاہرہ

زندگی اپنے ساتھ جہاں بہت ساری خوشیاں لے کر آتی ہے وہیں بہت سارے ایسے مسائل بھی جنم لیتے ہیں جو اس زندگی کو مشکلات کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں ان میں سے بیشتر اُلجھنیں انسان کی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں اور انہیں انسان از خود حل کر سکتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی اُن ہی اُلجھنوں کو سلجھانے کی ایک کڑی ہے۔ اپنے مسائل لکھ بھیجیں، ہماری کوشش ہوگی کہ آپ ان مسائل سے چھٹکارہ پالیں۔

سلامت علی۔ ملتان

باجی میری بہن کو اچانک پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے، یوں ہی بیٹھے بیٹھے وہ جھومنا شروع کر دیتی ہے، پھر آواز بدلنے لگتی ہے۔ کوئی سوال کیا جائے تو بھاری آواز میں بات کرتی ہے۔ گھر والوں کا کہنا ہے کہ اس پر کوئی اثر ہو گیا ہے۔ امی ایک پڑوسی خاتون کے ساتھ کسی کے پاس لے گئی تھیں۔ پھر سب کہنے لگے کہ وہ ٹھیک ہو رہی ہے لیکن مجھے نہیں لگتا۔ اب تو وہ دیکھنے سے ہی حیران، پریشان اور گم سم نظر آنے لگی ہے۔

ج: اثر، اثرات، سایا اور آسیب وغیرہ یہ سب توہمات ہی ہوتے ہیں۔ دراصل ذہنی بیماری میں رویہ تبدیل ہو جاتا ہے، بعض اوقات یہ تبدیلیاں حیران کن ہوتی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں، جس طرح آپ کے گھر والے ہو رہے ہیں۔ معلومات کی کمی اور نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو جانے کا ڈر، بدنامی کا احساس، مزاروں اور باباؤں کی طرف لے جاتا ہے۔ نتیجتاً بیماری بڑھتی جاتی ہے۔ آواز بھاری ہو جانا، جھومنا اور گم سم نظر آنا یہ سب شدید ذہنی مرض کی علامات ہیں۔

افشاں۔ میر پور

میرا مسئلہ بہت عجیب ہے۔ مجھے خریداری میں بہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔ بچپن میں بھی بھی بور ہوتی تو امی کہتیں چلو تمہیں شاپنگ کروا دیتے ہیں۔ دراصل وہ جاب کرتی تھیں، جب گھر آتیں تو ہماری اس تکلیف کو دور کرنے کی کوشش کرتیں جو ان کی غیر موجودگی میں ہم ان کا انتظار کر کے اٹھاتے تھے۔ اب میں شادی شدہ اور ایک بیٹی کی ماں ہوں۔ مجھے اب بھی بوریت ہوتی ہے تو بازار چلی جاتی ہوں۔ پہلے تو شوہر بھی ساتھ چلے جاتے تھے لیکن مالی مسائل کے سبب انہوں نے میرا ساتھ نہ دیا اور بہت زیادہ خریداری پر ناراض ہوتے ہیں۔ میرے بھائی ملک سے باہر اچھی جاب کرتے ہیں، وہ میری مدد کر دیتے ہیں اس لیے میں بغیر بتائے جو چاہے خرید لیتی ہوں۔ اب محسوس کر رہی ہوں کہ غیر ضروری رقم خرچ کرنے کی عادت یا خواہش نفسیاتی مسائل کو جنم دے رہی ہے کیونکہ اکثر اوقات چیزوں سے زیادہ رقم اہم ہوتی ہے اور وہ خوشی جو میں حاصل کر رہی ہوں، بالکل تھوڑی دیر کی ہے۔

ج: افشاں! کافی دیر کے بعد آپ نے سوچا

لیکن اچھا سوچا! یہاں دونوں باتیں ہیں یہ تو آپ کو محسوس ہو ہی گیا کہ خرچ کرنے کی خواہش نفسیاتی ہونے کے علاوہ مالی مسائل کا پیش خیمہ بھی ہے۔ عموماً ''مینیا'' کا شکار لوگ بازار میں بہت زیادہ اور فضول چیزیں خرید لیتے ہیں اور انہیں احساس نہیں ہوتا کہ اس عادت کے سبب کتنی زیادہ رقم خرچ کر ڈالی۔ یہ لوگ اپنی قیمتی چیزیں سستے داموں فروخت بھی کر ڈالتے ہیں۔ جب بور ہوں تو قریبی پُرخلوص رشتے داروں کے ہاں ملنے چلی جایا کریں، اس طرح آؤٹنگ بھی ہو جائے گی اور وہ کیفیت جو خریداری پر مائل کرتی ہے، ٹل جائے گی کیونکہ اصل مقصد اسی کیفیت پر قابو پانا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی الماری میں رکھے ملبوسات اور ضرورت کی چیزوں کا بھی جائزہ لیتی رہا کریں تاکہ احساس رہے کہ میرے پاس بہت کچھ ہے۔

محمد ادریس۔ کراچی

میں نے میٹرک کیا پھر کچھ ماہ ایک فیکٹری میں ملازمت کی، چند ماہ فارغ رہا۔ اب گھر والوں کے کہنے سے کالج میں داخلہ لے لیا۔ مختلف جگہوں پر مشقت کے کام کیے مگر پڑھنا بھی مشکل لگتا ہے۔ کالج میں ٹیچر اتنی تیزی سے پڑھاتے ہیں کہ بہت سی باتیں سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ پڑھائی چھوڑ بھی نہیں سکتا، سب کیا کہیں گے، بڑے زعم سے داخلہ لیا تھا، مالی مسائل بھی سامنے آتے ہیں۔ سوچتا ہوں پھر کہیں کام کر لوں اور لوگوں کو نہ بتاؤں کہ پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ فیصلہ کرنے میں مجھے ہمیشہ سے دشواری ہوتی ہے۔

: کام کرنے کے بعد تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ یا کم پڑھے لکھے لوگوں کی ملازمتوں اور ذمہ داریوں کا آپ کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہوگا۔ پڑھنا مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ ٹیچر کا لیکچر سننے سے پہلے اس کی تیاری کریں یعنی جس موضوع پر لیکچر ہو اس کا گھر سے مطالعہ کر کے چلیں اور بعد میں جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کو دوستوں میں پڑھیں، سلجھیں۔ بار بار پڑھیں، مشق کریں، محنت کرتے رہیں، پڑھنا آسان ہو جائے گا۔ یاد رکھیں جو شخص تعلیم حاصل کرتے ہوئے مصائب کا سامنا نہیں کرتا، اسے ہمیشہ کے لیے مصائب جھیلنے پڑتے ہیں۔

شہلا۔ واہ کینٹ

اچھی باجی! میں نے انٹر سائنس کر لیا ہے۔ میری ساری دوستوں نے کہیں نہ کہیں داخلہ لے لیا مگر پتا نہیں کیوں میں سوچتی ہوں ابھی بہت وقت ہے، پڑھ لوں گی۔ کبھی گھر کے کاموں میں لگ جاتی ہوں تو کبھی ٹی وی اور کمپیوٹر پر مصروفیت ہوتی ہے۔ ایک لڑکے کو پسند کرتی تھی، اس نے انکار کر دیا۔ اب میرا دل چاہتا ہے اس سے ایسا بدلہ لوں کہ وہ یاد رکھے۔ کئی ترکیبیں سوچیں مگر قابلِ عمل کوئی نہیں لگیں۔ اگر میں اس کو بھول جاؤں تو زیادہ بہتر ہوگا، یہ جانتی ہوں پھر بھی نہیں بھول پاتی۔

: ابھی تک کہیں داخلہ نہ لینے کا سبب ذہن میں آنے والے تخریبی اور منفی خیالات ہیں۔ دوسرے کی جگہ خود کو رکھ کر سوچیں، آپ کو بھی حق ہے انکار کا لیکن دوسرے کو بدلہ لینے یا نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں۔ لہٰذا اپنے ذہن سے ایسی ساری باتیں نکال دیں۔ وقت بہت تیزی سے گزر جاتا ہے، اس میں جتنی جلد ہو سکے علم حاصل کر لینا ہی فائدہ مند ہوتا ہے۔ تمام تر توجہ تعلیم پر دیں گی تو خیالات میں اچھی تبدیلیاں آئیں گی۔

نوٹ: اپنا مسئلہ بھیجتے ہوئے لفافے کے ایک کونے پر ''نفسیاتی مسائل'' ضرور لکھیں تاکہ آپ کے خطوط براہِ راست متعلقہ شعبے تک پہنچائے جا سکیں۔
خط و کتابت کے لیے:
110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی

پیارے ساتھیو۔ عیدالاضحیٰ کا تہوار جانے کے بعد بھی کئی روز تک جوش و جذبے کے ساتھ اپنی یاد دلاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس ماہ بھی گوشت سے بنائے جانے والے دلچسپ پکوان کی تراکیب کچن کارنر کا حصہ ہیں۔ اُمید ہے یہ تراکیب اپنی لذت اور انفرادیت کے باعث آپ کو عید قرباں کی یاد دلاتی رہیں گی۔

بھنا ہوا گوشت

اجزاء

بکرے کی دستی کا گوشت	1 کلو
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	150 گرام
ٹماٹر (چوپ کرلیں)	300 گرام
کُٹی ہوئی لال مرچ	1 چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	1 چائے کا چمچہ
پسی ہوئی ہلدی	1 چائے کا چمچہ
پسا ہوا لہسن ادرک	2 کھانے کے چمچے
تیل	120 گرام
نمک	حسبِ ذائقہ
پسا ہوا گرم مسالا	1 چائے کا چمچہ
لیموں (قتلے کاٹ لیں)	1 عدد
ادرک (باریک کاٹ لیں)	1 انچ کا ٹکڑا
ہرا دھنیا	سجانے کے لیے

ترکیب:

دیگچی میں تیل گرم کر کے پیاز ڈال کر بادامی کرلیں۔ گوشت اور ادرک لہسن کو اس میں ڈال کر گوشت کا رنگ تبدیل ہونے تک پکائیں۔ کُٹی ہوئی لال مرچ، پسی ہوئی لال مرچ، نمک اور ہلدی کو دیگچی میں شامل کر کے اتنا پانی ڈالیں جس میں گوشت گل جائے۔ دیگچی کو ڈھانک کر ہلکی آنچ پر گوشت گلنے تک پکائیں اور پھر کٹے ہوئے ٹماٹر ڈال دیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو چولہا بند کردیں۔ بھنے ہوئے گوشت کو ڈش میں نکال لیں۔ اوپر گرم مسالا چھڑکیں اور ادرک، ہرا دھنیا اور لیموں کے قتلوں سے سجا کر پیش کریں۔

اجزاء

گائے کا گوشت (ثابت اٹڈر کٹ)	2 کلو
لیموں کا رس	پون پیالی
سفید سرکہ	1 پیالی
لہسن	10 عدد
کُٹی ہوئی کالی مرچ	2 چائے کے چمچے
مکھن	3 کھانے کے چمچے
لاہوری نمک	حسبِ ذائقہ

ترکیب:

گوشت کے ٹکڑے پر چھوٹی چھری کی مدد سے سوراخ کرلیں۔ ہر سوراخ میں لہسن کا ایک، ایک جوا ڈال دیں۔ ایک پیالے میں سرکہ، لاہوری نمک، کالی مرچ اور لیموں کا رس ڈال کر ملائیں۔ اس آمیزے کو گوشت پر لگا کر پلاسٹک کی شیٹ سے ڈھانک کر پوری رات کے لیے چھوڑ دیں۔ اسے پہلے اسٹیمر میں 30 منٹ تک اسٹیم کریں اور پھر پہلے سے گرم اوون میں

15 منٹ کے لیے مکھن لگا کر پکائیں۔ مزیدار، ہنٹر بیف تیار ہے۔

قیمہ کباب مسالا

اجزاء

گائے کا قیمہ	آدھا کلو
پسا ہوا لہسن ادرک	1 چائے کا چمچہ
بیسن	1 کھانے کا چمچہ
ڈبل روٹی	1 سلائس
پسا ہوا گرم مسالا	پون چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	3 عدد
تیل	آدھا پیالی

مسالے کے اجزا:

ٹماٹر (چوپ کرلیں)	3 عدد
پسا ہوا لہسن ادرک	1 چائے کا چمچہ
پسا ہوا گرم مسالا	پون چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

سجانے کے لیے:

ہری مرچیں (چوپ کرلیں)	3 عدد
ہرا دھنیا	حسب ضرورت

ترکیب:

ڈبل روٹی کے سلائس کو پانی میں بھگو کر نچوڑ لیں۔ قیمے میں گرم مسالا، لال مرچ، نمک، بیسن اور ڈبل روٹی ڈال کر ملائیں اور انڈے کی شکل کے کباب بنالیں۔

کڑاہی میں تیل گرم کرکے اس میں پیاز گلابی کریں اور مسالے کے تمام اجزا شامل کرکے بھون لیں۔ بھنے ہوئے مسالے میں تیار کباب شامل کرکے ہلکی آنچ پر 10 منٹ کے لیے پکائیں۔ مزیدار، قیمہ کباب مسالا پر ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال کر گرم گرم پیش کریں۔

شب دیگ

اجزاء

گائے یا بکرے کا گوشت	آدھا کلو
گائے یا بکرے کا قیمہ	250 گرام
پسا ہوا لہسن ادرک	1 کھانے کا چمچہ
پیاز (باریک کاٹ لیں)	3 عدد
شلجم	3 عدد
گاجر	3 عدد
ہری مرچیں (باریک کاٹ لیں)	3 عدد
لیموں	2 عدد
ہرا دھنیا (چوپ کرلیں)	1 گڈی
دہی	1 پیالی
ڈبل روٹی	2 سلائس
آٹا	2 کھانے کے چمچے
پسا ہوا گڑ	آدھا کھانے کا چمچہ
خشخاش	1 چائے کا چمچہ
پسا ہوا دھنیا	2 کھانے کے چمچے
گرم مسالا	1 چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	1 کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے ڈیڑھ پیالی

ترکیب:

شلجم اور گاجروں کو چھیل کر بڑے ٹکڑوں میں کاٹ لیں اور پھر فرائنگ پین میں تل لیں۔ چوپر میں قیمہ، خشخاش، زیرہ اور ڈبل روٹی کے سلائس کنارے کاٹ کر شامل کریں اور باریک پیس لیں۔ ہاتھ ذرا سا چکنا کرکے اس آمیزے کے کوفتے بنائیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور کوفتے تل کر نکال لیں۔ ایک دیگچی میں گوشت، پیاز، لال مرچ،

دھنیا، لہسن ادرک، گرم مسالا، نمک، تیل اور 2 پیالی پانی ڈال کر گوشت گلنے تک پکائیں۔ دہی ڈال کر ہلکا سا بھون کر شلجم، گاجر، کوفتے، گڑ اور 2 پیالی پانی دیگچی میں شامل کر کے مزید بھونیں۔ ہلکی آنچ پر 5 منٹ پکائیں اور پھر ایک پیالی پانی میں آٹا گھول کر شامل کر دیں اور پھر 10 منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ مزیدار شب دیگ تیار ہے۔ لیموں کا رس، ہری مرچیں اور ہرا دھنیا ڈال کر پیش کریں۔

جھٹ پٹ سیخ کباب

اجزاء

مرغی کا قیمہ	آدھا کلو
پیاز (چوپ کرلیں)	1 عدد
ادرک (چوپ کرلیں)	1 کھانے کا چمچہ
ہری مرچیں (چوپ کرلیں)	6 عدد
ہرا دھنیا (چوپ کرلیں)	4 کھانے کے چمچے
پسی ہوئی رائی	آدھا چائے کا چمچہ
پسی ہوئی کالی مرچ	1 چائے کا چمچہ
نمک	1 چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	2 کھانے کے چمچے
تیل	2 کھانے کے چمچے

ترکیب:

ایک پیالے میں مرغی کا قیمہ، نمک، رائی، کالی مرچ، لیموں کا رس، ادرک، ہرا دھنیا، پیاز اور ہری مرچیں ڈال کر ہاتھ سے ملائیں۔ ایک سیخ لے کر اس پر آمیزے کو لپیٹ کر لمبے کباب کی شکل دیں اور پھر سیخ کو درمیان سے نکال دیں۔ اس عمل کو دہراتے ہوئے باقی آمیزے کے بھی کباب بنالیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کریں اور کبابوں کو اس میں شامل کر کے 5 سے 7 منٹ تک سنہری رنگ آنے تک تلیں۔ ایک وقت میں 4 سے زیادہ کباب نہ ڈالیں ورنہ کباب ٹوٹ جائیں گے۔

چائنیز پسندے

اجزاء

پسندے	آدھا کلو
لہسن و ادرک کا پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچ
سویا ساس	ایک چائے کا چمچ
اجینوموتو	آدھا چائے کا چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچ
انڈا	ایک عدد
ڈبل روٹی کا چورا	ایک پیالی
نمک	حسب ذائقہ
آلو کے چپس	ایک پیالی
گھی	فرائی کے لیے

ترکیب:

پسندوں کو دھو کر اس پر سرخ مرچ، لہسن و ادرک، سرکہ، سویا ساس، اجینوموتو اور نمک سے تیار کردہ آمیزہ ملا کر لگادیں اور آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ کسی کھلے منہ کی دیگچی میں پسندے ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں جو اپنے ہی پانی میں گل جائیں گے۔

ضرورت ہو تو تھوڑا سا پانی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ خشک ہو جانے پر انہیں آنچ سے اُتار کر کھلی پلیٹ میں پھیلا کر ٹھنڈے کرلیں۔ ٹھنڈے ہونے پر انہیں پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈبو کر ڈبل روٹی کے چورے میں لپیٹنے کے بعد ایک ایک کر کے فرائنگ پین میں گرم کیے ہوئے گھی میں تل لیں۔ دونوں اطراف سے بادامی ہونے پر نکال کر کاغذ پر پھیلائیں تاکہ اضافی چکنائی جذب ہو جائے۔ تمام پسندے تل جائیں تو کسی ڈش میں نکال کر آلو کے چپس کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

☆☆......☆☆

حکیم جی!

محمد رضوان حکیم

ساتھیو! اکثر ہمیں کسی ایسی بیماری سے سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے ہمیں سمندر کی تہہ یا آسمان کی بلندیوں، جنگل بیابانوں یا پہاڑوں تک پر جانا پڑ جاتا ہے مگر جان ہے تو جہان ہے۔ خدا اگر بیماری دیتا ہے تو اس نے شفا بھی دی ہے۔ قدرت کے طریقۂ علاج کا آج بھی کوئی مول نہیں۔ حکمت کو آج بھی روزِ اول کی طرح عروج حاصل ہے۔ اسی لیے طبیب اور حکیم صاحبان کو خدائی تحفہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی صحت اور تندرستی کے لیے ہم نے یہ سلسلہ بعنوان 'حکیم جی' شروع کیا ہے۔ اُمید ہے ہمارے مستند اور تجربہ کار حکیم صاحب آپ کی جملہ بیماریوں کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کریں گے۔ نیا سلسلہ حکیم جی! آپ کو کیسا لگا؟ اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

موٹاپا دور کرنے اور زائد چربی کا موثر علاج:

☆موٹاپا کیا ہے؟

موٹاپا اس جسمانی حالت کو کہتے ہیں جب جسم میں چربی کی اضافی تہیں بن جاتی ہیں اور جسم کو بدنما بنا کر بیماریوں کی آماجگاہ بنا دیتی ہیں۔ موٹاپے کے دوران جسم میں چربی کے خلیات کی تعداد اور سائز میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ عام طور پر کمر، پیٹ، گردن، کولہے وغیرہ کے اطراف میں چربی زیادہ جمع ہوتی ہے۔

☆موٹاپے کی وجوہات:

جسم کی ضرورت سے زائد خوراک لینا۔ موروثی طور پر موٹاپے کا رجحان، کم جسمانی مشقت والی طرز زندگی، بار بار کم خوراکی Dieting کے ذریعے وزن کم کرنا اور پھر وزن بڑھ جانا۔ زیادہ کیلوریز، چربی اور نشاستے والی غذاؤں کا استعمال، ذہنی دباؤ، کم خوابی، جسمانی غدود کے افعال کی ابتری، بعض بیماریوں اور ادویات کے باعث وزن کا بڑھ جانا۔

☆ علامات وامراض:

قدرت نے انسان کو ایک متوازن جسم عطا کیا جبکہ وہ اپنی بے اعتدال غذائی عادات سے اس جسم کی ساخت کو اپنے لیے دشواریوں کا باعث بنالیتا ہے۔ موٹاپا جسم کو بدصورت اور کمزور بنا دیتا ہے جس سے بیماریاں اس کا گھر دیکھ لیتی ہیں۔ فربہی جسم کا انسان عام طور پر بدمزاج ہوجاتا ہے۔ جسمانی محنت کے کام میں دشواری کا سامنا کرتا ہے۔ جسمانی دردوں میں مبتلا رہتا ہے اور ذہنی تناؤ کا شکار رہتا ہے۔ اس کے علاوہ موٹاپے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ بے شمار بیماریوں کی بنیادی وجہ ثابت ہوتا ہے جن میں جوڑوں کا درد، ذیابطیس، امراض قلب، کینسر، سانس کی دشواری، کمر درد، کولیسٹرول اور ہائی بلڈ پریشر Skin Rashes اور نظامِ ہاضمہ کی تکالیف نمایاں ہیں۔

موٹاپے کا قدرتی نباتاتی علاج کا خاص نسخہ موٹاپے سے نجات، چربی گھلانے اور جسمانی ساخت کو خوبصورت بنانے کے لیے قدرت نے بہت سی جڑی بوٹیاں عطا کی ہیں۔ جن کا باقاعدہ استعمال جسم سے زائد چربی کا خاتمہ کرکے انہیں نظام اخراج کے ذریعے خارج کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے جو جسم میں چربی کے بننے اور استعمال ہونے کے عمل کو اعتدال پر لاتا ہے۔ میٹھا اور زیادہ کھانے کی خواہش کو کم کرتا ہے اور جسم کو خوبصورت اور صحت مند بناتا ہے۔ یہ نسخہ جمع شدہ چربی گھلانے کے عمل کو تیز کرتا ہے۔ یہ نسخہ زائد چربی کو جسم میں جمع نہیں ہونے دیتا۔ یہ نسخہ کولیسٹرول نارمل رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ نسخہ بھوک کو اعتدال میں لاتا ہے اور میٹھا کھانے کی خواہش کم کرتا ہے۔

یہ نسخہ Energy Imbalances کو دور کرتا ہے جو چربی جمع ہونے کا باعث ہوتی ہے۔

یہ نسخہ فاسد مادوں کو دور کرتا ہے اور قوت مدافعت بڑھاتا ہے۔

☆ جلد نتائج حاصل کرنے کے لیے:

کھانا مناسب مقدار میں کھائیں۔ دن میں آٹھ سے دس مرتبہ پانی پئیں۔ پھلوں سبزیوں اور سلاد کا استعمال زیادہ کریں۔ تلی ہوئی، زیادہ چربی والی، نشاستے والی غذاؤں اور میٹھے کی مقدار کم کردیں۔ ہفتے میں کم از کم تین دن ورزش کریں۔ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے بعد سفوف کی خوراک آدھی کردیں۔ مگر ایک مناسب عرصے تک استعمال کریں تاکہ آئندہ موٹاپے سے بچا جاسکے۔

نسخہ:

لک مقسول	10 گرام
زیرہ سیاہ	10 گرام
سونٹھ	10 گرام
پوست ہڑزرد	10 گرام
مرزن جوش	10 گرام
ریوزن خطائی	10 گرام
تخم سماق	10 گرام
سنا مکی	10 گرام
پہاڑی پودینہ	10 گرام
اجوائن	10 گرام
حنظل	10 گرام
الفوم	10 گرام

ترکیب:

تمام جڑی بوٹیوں کو باریک پیس کر سفوف بنالیں۔ اور روزانہ ایک چائے کا چمچہ ناشتے کے بعد اور 1 چائے کا چمچہ رات کے کھانے کے بعد کھائیں۔

پرہیز:

تمام بادی اور تلی ہوئی چیزوں سے سخت پرہیز کریں۔

☆☆......☆☆

آپ کے جانے پہچانے، اسکن اسپیشلسٹ **ڈاکٹر خرم مشیر**

ہر ماہ آپ کی بیوٹی سے متعلقہ مسائل کے حل کے ساتھ

اس ماہ میں آپ کی جانب سے موصول ہونیوالے سوالوں کے جواب دوں گا۔ دیکھتے ہیں پہلا سوال کس کا ہے۔

(فریحہ یوسف۔ راولپنڈی)

✍: میرا مسئلہ یہ ہے خرم بھائی کہ میرے چہرے کی رنگت یکساں نہیں ہے پہلے میرا چہرہ بالکل صاف تھا ،اب کالج جانے کی وجہ سے چہرے کی رنگت میں فرق آ گیا ہے اور رنگت خراب ہوگئی ہے خاص طور پر میرے گالوں کی رنگت خراب ہوگئی ہے میں اس مسئلے کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ براہ کرم کوئی آسان گھریلو علاج بتادیں جس کے استعمال سے میرے چہرے کی رنگت بہتر ہونا شروع ہوجائے۔

☆ فریحہ! سورج کی تپش اگر چہرے پر زیادہ دیر پڑتی رہے تو اس کی رنگت میں فرق آجاتا ہے لہذا جب بھی باہر نکلیں پہلے سن بلاک ضرور لگائیں اس کے علاوہ پپیتے کی ایک قاش کو گلینڈ کرلیں۔ جب پیوری کی شکل میں آجائے تو اس میں تھوڑی سی چینی ملا کر چہرے پر لگائیں، ہلکے ہاتھوں سے اسکرب کی طرح ملیں اور ماسک کو آدھے گھنٹے کے لیے چہرے پر لگا رہنے دیں۔ روزانہ یہ عمل باقاعدگی سے دہرائیں، چند دنوں میں فرق محسوس ہونے لگے گا۔

(انوشہ احسان۔ لاہور)

✍: ڈاکٹر صاحب میری عمر بیس سال ہے اور میرے چہرے پر بہت زیادہ رواں ہے۔ میں اسے ویکسین کر کے اس لیے صاف نہیں کرتی کہ کہیں رواں مزید نہ بڑھ جائے۔ مجھے کوئی ایسا ٹوٹکہ بتادیں جس کو اگر استعمال کیا جائے تو بال نا صرف ختم ہوں بلکہ دوبارہ نا نکلیں۔

☆ انوشہ! آپ مندرجہ ذیل نسخہ نوٹ کرلیں ۔انڈے کی سفیدی میں اتنا کارن فلور ملائیں کہ وہ پیسٹ سا بن جائے۔ اس پیسٹ کو جہاں پر بال ہیں اس جگہ اچھی طرح لگائیں۔ جب سوکھنے لگے تو بالوں کی مخالف سمت میں ہلکے ہاتھ سے مسلتے ہوئے اتارلیں اور سادے پانی سے منہ دھولیں۔ اس عمل کو ہفتے میں تین مرتبہ دہرائیں یاد رہے کہ اسے ہلکے ہاتھوں سے اسکرب کرتے ہوئے اتارنا ہے۔

(صادقہ اکرم۔ حیدرآباد)

✍: میری عمر 25 سال ہے اور میری آنکھوں کے گرد گہرے حلقے ہیں جو کسی بھی طرح نہیں جارہے۔ میں نیند بھی پوری لیتی ہوں لیکن اس کے باوجود یہ حلقے بدستور موجود ہیں۔ مجھے کوئی اچھی کریم یا گھریلو نسخہ تجویز کردیں جو ان حلقوں کو ختم کرنے میں مددگار ہو۔

☆ صادقہ! آپ روئی کو ٹھنڈے دودھ میں بھگو

کر ہلکے ہاتھوں سے نچوڑ لیں۔ اب روئی کے ان پیڈز کو 20 منٹ کے لیے آنکھوں پر رکھیں۔ روزانہ یہ عمل باقاعدگی سے دہرائیں، کوشش کریں روزانہ 10 گلاس پانی ضرور پئیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے آہستہ آہستہ دور ہو جائیں گے۔ اس عمل کو باقاعدگی سے دہرانا لازمی ہے۔

(مہک تسیم۔ خانیوال)

✍: ڈاکٹر خرم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری اسکن بہت آئلی ہے، جس کی وجہ سے آئے دن چہرے پر دانے نکلتے رہتے ہیں جو بعد میں نشانات چھوڑ جاتے ہیں۔ اگر اس مسئلے کا آپ کے پاس کوئی حل ہے تو براہ برائے مہربانی مجھے تجویز کردیں۔

☆ مہک! آپ ایک چائے کا چمچہ گاجر کے رس میں ایک چائے کا چمچہ شہد اور اتنا کارن فلور ملائیں کہ وہ پیسٹ بن جائے۔ اس ماسک کو منہ دھو کر خشک کرنے کے بعد لگائیں۔ 30 منٹ لگا رہنے دیں بعد میں ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ روزانہ اس عمل کو باقاعدگی سے دہرائیں۔ جب تک دانے نکلنا بند نہ ہوں اس عمل کو جاری رکھیں۔

(منصورہ شاہ۔ کراچی)

✍: میری عمر 14 سال ہے اور میری پیشانی پر بہت دانے ہیں۔ میری عادت ہے کہ میں ان دانوں کو چھیڑ دیتی ہوں جس کی وجہ سے ان دانوں سے خون نکلتا ہے اور پھر بعد میں یہ داغ چھوڑ دیتے ہیں۔ مجھے کوئی آسان نسخہ تجویز کردیں جس کو میں با آسانی آزما سکوں۔

☆ منصورہ! آپ دانوں کو ہاتھ مت لگایا کریں۔ داغ دھبوں اور دانوں کے لیے آپ ایک قاش ٹماٹر کی لے کر اسے پیشانی پر ملیں۔ رات بھر لگا رہنے دیں، صبح سادے پانی سے دھولیں۔ دانے نکلنا بھی کم ہوں گے اور داغ بھی آہستہ آہستہ دور ہو جائیں گے۔

(مصباح الغنی۔ دادو)

✍: میری عمر 19 سال ہے اور میرے سر میں بہت خشکی ہے۔ خشکی ہونے کی وجہ سے میرے سر میں بہت کھجلی بھی ہوتی ہے۔ بار بار دوسروں کے سامنے سر کھجانے سے بے حد شرمندگی محسوس ہوتی ہے لیکن اگر سر کھجایا نہ جائے تو سکون نہیں ملتا۔ آپ مجھے خشکی کے خاتمے کے لیے کوئی نسخہ تجویز کردیں تو مہربانی ہوگی۔

☆ مصباح! آپ دن میں دو مرتبہ بالوں میں برش کریں۔ اس سے آپ کے بالوں کی جڑوں میں موجود خشکی اپنی جگہ چھوڑ دے گی لیکن یاد رہے اس عمل کو دھرانے سے پہلے اپنے برش کو صاف پانی سے دھولیں اور ہر بار برش کو دھو کر ہی استعمال کریں۔ اس کے علاوہ آپ ایلو ویرا جیل میں چند قطرے ٹی ٹری آئل کے ڈال کر بالوں کی جڑوں میں ہلکے سے مساج کریں۔ رات بھر لگا رہنے دیں صبح سادے پانی سے سر دھولیں۔ ہفتے میں تین مرتبہ اس عمل کو دھرائیں۔ آپ کو واضح فرق محسوس ہوگا۔

(راشدہ اعجاز۔ کراچی)

✍: میری عمر 30 سال ہے میرے بال بہت روکھے اور الجھے دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر برش کرنے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے بالوں میں برش ہی نہ کیا ہو۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اگر آپ کے پاس کوئی گھریلو نسخہ ہے تو بتا دیں جس کے استعمال سے بالوں کا روکھا پن ختم ہو جائے۔

☆ راشدہ! دو کھانے کے چمچہ دہی میں چند قطرے ٹی ٹری آئل کے ڈالیں۔ اس مکسچر کو اچھی طرح ملانے کے بعد بالوں میں لگالیں اور ایک گھنٹہ لگا رہنے دیں۔ پھر کسی ہربل شیمپو سے بال دھولیں۔ اس عمل کو ہفتے میں تین مرتبہ دہرائیں۔ بالوں میں چمک آئے گی اور بال الجھے ہوئے بھی نہیں دکھائی دیں گے۔

☆☆......☆☆